Omar Khayyam

ویب سائٹ اردو ڈائجسٹ، ناولز، کہانیاں، مضامین، شاعری
PP
پاکستانی پوائنٹ
www.pakistanipoint.com
ایک لنک آپ کے

عمر خیام

مصنف
ہیرلڈ لیم

عظیم دانشور، ریاضی دان، شاعر اور ماہر فلکیات

عرضِ ناشر

زیرِ نظر ناول میں عمر خیام کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔

شہرت یافتہ مصنف ہیرلڈ لیم کا یہ ایک منفرد ناول ہے۔

انہوں نے ہمیشہ دنیا کے نامور فاتحین اور جنگجوؤں کے حالات و واقعات پر مبنی کتابیں تصنیف کی ہیں مگر اس کتاب کا موضوع دیگر تمام کتب سے ہٹ کر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عمر خیام ان تمام کرداروں سے مختلف اور علم و فن کے شعبہ کی شخصیت تھا۔ عمر خیام علم و فن کے شعبہ کی شخصیت تھا ـــــــــــ عمر خیام کے موضوع بناتے ہوئے شہرۂ آفاق تاریخ داں ہیرلڈ لیم کا قلم جولانیوں پر رہا۔ بلاشبہ اس ناول میں وہ اپنے فن کی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔

یہ ناول خون ریزیوں، سفاکیوں اور سیاسی تخریب کاریوں سے پاک ہے۔ اس ناول میں اس نے افسانہ طرازی بھی کی ہے۔ تاریخی حقائق بھی بیان کئے ہیں اور ناول کے بنیادی تقاضوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے، تاکہ قاری پڑھنے کے دوران بوریت محسوس نہ کرے۔

ہیرلڈلیم کی بے شمار کتابوں میں تاریخِ عالم کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے۔عالم اسلام کی تہذیب وثقافت کے پس منظر میں اس کی تصنیفات نے یورپ، امریکہ اور دنیا بھر میں پذیرائی پائی۔خاص طور پر صلیبی جنگیں، صلاح الدین ایوبی، تاتاریوں کی یلغار، امیر تیمور، چنگیز خان اور سلیمان عالی شان وغیرہ اس سلسلے کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔ان تمام تصانیف میں وہ زیادہ تر جنگ وجدل کے تذکروں کا پابند رہا۔

اس کے برعکس ''عمر خیام'' کے موضوع نے اسے یہ موقع دیا کہ وہ اسلامی دور کے ایک اہم دور کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی تصنیف کو تاریخ کے خشک موضوع کا اسیر رکھنے کی بجائے ایسا ناول پیش کرے کہ پڑھنے کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہے۔قاری ناول ختم کرنے تک کہیں بور نہ ہونے پائے۔

ہیرلڈلیم نے عمر خیام کی سدابہار شخصیت کو مرکزی کردار بنا کر حسن وجوانی، عشق محبت اور عزم وایثار کے عناصر کے ساتھ ایک طرف روایتی رومانی ناول بنا دیا ہے تو دوسری طرف اس میں تاریخی حقائق اور گیارہویں اور بارہویں صدی کی معاشرت اور اس دور کے سیاسی حالات درج کر کے ایک حد تک تاریخی داستان بنا دیا ہے۔

ایک روایت کے مطابق عمر خیام 1039ء میں نیشاپور میں پیدا ہوا تھا۔اسی سال غزنی کے سلطان مسعود غزنی کو قتل کیا گیا۔خراسان پر سلجوق ترک حکمران ہو گئے۔اس دور میں نیشاپور، خراسان کا دارالحکومت تھا۔عمر خیام الپ ارسلان، ملک شاہ سلجوقی، داؤد

، سنجر اور سلجوق حکمرانوں کا دور دیکھا۔

پہلی بار ملک شاہ کے دربار میں عمر خیام کا تعارف ایک طبیب حاذق کی حیثیت سے ہوا۔اس وقت ملک شاہ کا بیٹا شہزادہ سنجر چیچک کے مرض میں مبتلا تھا۔اس سے قبل شاہی طبیبوں کے علاج کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہوا۔جب عمر خیام دربار سے منسلک ہو گیا تو عمر خیام کے علاج سے شہزادہ صحت مند ہو گیا۔اس کے بعد ملک شاہ نے عمر خیام کی بڑی قدر ومنزلت کی۔اور شاہی طبیب کے عہدے پر فائز کر کے درباریوں میں شامل کر لیا۔لیکن عمر خیام طبیب سے زیادہ ایک ماہر فلکیات اور ریاضی دان تھا۔اب آپ اس عظیم ناول کا مطالعہ کیجئے۔

والسلام۔ادارہ

پہلا باب:

کتب فروشوں کی گلی

جامع مسجد سے بستی تک جانے والی گلی کو دھوپ سے بچانے کے لئے اس کے اوپر انگور کی بیلیں پھیلا کر چھت سی بنا دی گئی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد گلی کے موڑ پر پانی کا ایک چشمہ تھا اور اس کے قریب ہی چنار کا ایک تناور درخت کھڑا تھا۔

پانی بھرنے کے لئے آنے والی عورتیں اپنے گھڑے چشمہ کے کنارے رکھ کر بیٹھ جاتیں اور ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتیں۔ مرد کتابوں کی دکانوں میں بیٹھے اونگھتے رہتے۔ مکتب سے لڑکے پڑھ کر نکلتے تو دوڑتے ہوئے شرارت سے پکارتے۔ پرانی کتابیں بیچنے والو..... جاگ اٹھو۔

یاسمین دل مسوس کر رہ جاتی' چونکہ اس کے چہرے پر بچگانا نقاب ہوتی تھی اس لیے لڑکے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے۔ مردوں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتے' اس کے پاس سے گزر جاتے۔ البتہ کبھی کبھی یاسمین کی بھوری بلی پر پتھر ضرور پھینکتے تھے۔ ان میں سے بعض لڑکوں کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔

یاسمین کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ وہ خود کو حسین بھی سمجھتی تھی۔ اسی وجہ سے اسے اپنے چہرے پر سفید رنگ کا نصف بچگانا نقاب ڈالنا کسی طرح پسند نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ اگر میں چہرے پر پورا نقاب ڈالوں اور اوٹ سے لڑکوں کو جھانکوں تو وہ ضرور میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

یاسمین کو کتابوں کی دکان پر اپنے باپ کی مدد کرنا پڑتی تھی۔ اس کا باپ بوڑھا اور کمزور تھا باریک لکھے ہوئے قلمی نسخوں کو پڑھتے پڑھتے اس کی بینائی دھندلا چکی تھی۔ اپنی بیٹی کے مقابلے میں اسے بوعلی سینا کی کسی مجلّا و مطلا کتاب کا ایک ایک ورق زیادہ عزیز تھا۔ اور گھر کی خواتین یاسمین کو اس وقت یاد کرتیں' جب انہیں اس سے کوئی کام لینا ہوتا تھا۔

جب اس کا باپ لڑکوں کو کوئی کتاب پڑھ کر سناتا تو بعض اوقات وہ بھی سننے لگتی' لیکن اسے ذرا بھی مزا نہ آتا۔ رات کے وقت آسمان پر جنگلی ہنس کی شکل نمودار ہونے یا اس پردے کی بحث جو غیر مرئی اشیاء پر پڑا ہے اسے کیسی دلچسپی ہو سکتی تھی وہ سوچتی تھی کہ اس قسم کے مسائل کو سمجھنا مردوں ہی کا کام ہے' لڑکیوں کے اندر اتنی صلاحیت نہیں ہے۔ مرنے کے بعد انہیں وہی جگہ ملے گی جو کتوں اور بلیوں کے لیے مخصوص ہے۔

یاسمین اپنے باپ کی دکان میں صفائی کرتی' جو چیز اس کے باپ کو نظر نہ آتی وہ اٹھا کر دیتی اور اس کی ضروریات کے لئے زنان خانے میں آتی جاتی۔ فرصت کے وقفوں میں بڑی بے دلی سے سرپوش کاڑھتی یا پھر بلی کے بچے سے کھیلتی رہتی اور ایسی جگہ بیٹھتی جہاں سے کتب فروشوں کی گلی کا پورا منظر نظر کے سامنے رہے۔

نسبتاً بڑی عمر کے لڑکے بھی اکثر اس کی باپ کی دکان پر آتے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک' جس کا قد ذرا نکلتا ہوا تھا ایک زمیندار کا بیٹا رحیم زادہ تھا۔ اس کی بھورے رنگ کی عبا یاسمین کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ایک اور لڑکا اتنی دیر سر جھکائے کتابیں پڑھتا رہتا کہ اندھیرا ہو جاتا اور دکان دار مغرب کی نماز کے لیے دکانوں سے باہر نکل آتے۔

رحیم نے جس دن ایک خاص مصور مجلّا اور مطلا کتاب خریدی یاسمین کا باپ شام کو گلی کے موڑ سے یاسمین کے لیے مٹھائی خرید کر لایا۔ غریبوں کو ایسی نعمتیں کبھی کبھار نصیب ہوتی تھیں۔ یاسمین مزے لے لے کر مٹھائی کھا رہی تھی' اور اس کا باپ سوچ رہا تھا کہ ''دراصل رحیم کو کتاب کی وہ تصویر پسند تھی جو جلد کی پشت پر بنی ہوئی ہے اور جس میں گھوڑے پر سوار ایک سلطان کسی کافر کو تلوار سے قتل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔''

یاسمین کو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے دل میں تو ایک ننھی سی آرزو

تھی اور مبہم سا تصور کہ ایک پروقار اور شاہانہ کروفر رکھنے والا امیر دمشق کی سرخ عبا پہنے' بارہ ترک سپاہیوں کو جلو میں لیے ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر کتب فروشوں کی گلی میں آئے گا' یہ عالی المرتبت شہزادہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھے گا اور اس کے باپ کو قیمتی تحائف دے کر اس سے یاسمین کو اپنے ہمراہ لے جانے کی اجازت طلب کرے گا۔ پھر وہ اسے دریا کے کنارے اپنے محل میں رکھے گا جہاں سفید راج ہنس ہوں گے' حریری ملبوسات ہوں گے اور نقرئی ظروف میں چنے ہوئے میٹھے میٹھے پھل ہوں گے۔ سفید گھوڑے کا یہ سوار اس سے ہمیشہ پرخلوص محبت کرے گا اور اپنی دوسری بیویوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ اور صرف اسی کے بچوں کو زیادہ پیار کرے گا اور کبھی اس کے ساتھ استہزا اور بدسلوکی سے پیش نہ آئے گا۔

''رحیم بہت ہنستا ہے'' یاسمین نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ اس کے باپ نے جواب دیا۔ ''ہاں ٹھیک ہے۔'' آخر وہ کیوں نہ ہنسے وہ متمول گھرانے میں پیدا ہوا ہے اور بیسیوں نوکر اس کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔

یاسمین نے اپنے دل میں سوچا کہ پھر وہ ٹھیک رہے گا اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے تصور میں رحیم کو سفید گھوڑے والا امیر بنالیا۔ پھر بھی رحیم' رحیم ہی رہا۔ اس نے ایک بار اسے تانبے کا ایک سکہ دیا تھا اور اس نے یہ سکہ اتنا چمکایا تھا کہ وہ بالکل سونے کا معلوم ہونے لگا تھا۔ یاسمین کو تعجب تھا کہ رحیم ہمیشہ ابراہیم کے بیٹے کے ساتھ کیوں رہتا ہے۔

یاسمین نے بلی کے بچے کو جو کود کر سڑک پر جانا چاہتا تھا روکا اور دل ہی دل میں سوچا کہ ''ابراہیم کا بیٹا بہت خاموش ہے اور اس کا چہرہ خوفناک حد تک متین ہے۔ مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔'' اور پھر اس دوسرے لڑکے نے کبھی اس سے نظریں ملائی ہی نہیں۔ عبا اس کے چوڑے شانوں پر بے نیازی سے پڑی رہتی ہے اور عمامہ بھی اس کے سر پر بے ترتیبی سے بندھا ہوتا ہے۔ اسے اپنے لباس کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ وہ گدھوں کے ریوڑ کو چیرتا اور اونٹوں کی گردنوں کے نیچے سے گزرتا ہوا اس طرح تیزی سے رستہ طے کرتا ہے جیسے کوئی چیز اسے آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ جب وہ اس کے باپ کی دکان پر آتا ہے تو بڑے انہماک سے یکے بعد دیگرے کتابیں پڑھتا رہتا

ہے اور رحیم اور اس کا باپ باتیں کرتے رہتے ہیں۔

یاسمین کا باپ بڑبڑایا ''ابراہیم کا بیٹا؟ [illegible] مدرسے میں خاموش نہیں بیٹھتا۔ وہ حجتیں کرتا ہے' مسخرا پن کرتا ہے۔ واللہ! ان [illegible] جام کبھی اچھا نہیں نکلا۔''

یاسمین مسخرے پن سے خوب واقف تھی۔ زنان خانے میں وہ خود بھی اس کی مشق کرتی رہتی تھی' لیکن جس دن اس کی بلی کے بچے پر لڑکوں نے پتھر برسائے اسے ایک اور بات سوچنی پڑی۔

بلی کا بچہ باہر نکل گیا تھا۔ یاسمین ملکی ملکی کہہ کر اسے دیر تک پکارتی رہی لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ بالآخر اس نے دیکھا کہ وہ گلی کے موڑ پر چنار کی شاخوں میں چھپا ہوا ہے۔ ملکی اس پیڑ سے نیچے نہیں اتر سکتا تھا' کیونکہ وہ مجبور تھا۔ پانچ چھ لڑکے اس پر پتھر برسا رہے تھے' پہلے تو وہ یونہی اس پر پتھر پھینکتے رہے' لیکن جوں جوں ان کے دل میں اسے جان سے مارنے کی خواہش بڑھنے لگی وہ اس پر شدت سے پتھراؤ کرنے لگے۔

''ارے کیوں مارتے ہو؟'' یاسمین لرزتی ہوئی آواز میں زور سے چلائی۔ لڑکے پھر بھی نہ رکے اور یاسمین غصے کے ساتھ انہیں دیکھنے لگی۔ ادھر ملکی بے بسی کے عالم میں شاخوں میں چھپتا پھر رہا تھا۔ یاسمین لڑکوں کو ہٹاتی ہوئی آگے بڑھی۔ وہ درخت پر جھپٹی اور شاخوں سے لپٹ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب تک وہ بلی کے بچے تک نہ پہنچ گئی درخت پر چڑھتی ہی چلی گئی اور جب اس نے بچے کو اپنی گود میں اٹھالیا تو پتھر برسنے بھی بند ہوگئے۔ لڑکوں کی دلچسپی ختم ہوگئی اور وہ اپنے اپنے رستے ہو لیے۔

یاسمین کے لئے بلی کے بچے کو اٹھا کر نیچے اترنا مشکل ہوگیا۔ وہ زمین سے بہت بلندی پر تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنی بلندی پر وہ چڑھ کیسے گئی تھی۔ بچے کو گود میں لے کر وہاں سے کود جانا اس کے لیے ناممکن تھا وہ سوچنے لگی کہ مدد کے لئے کس کو پکاروں۔ دکان دار نماز پڑھنے مسجد کی طرف جارہے تھے اور کسی کو بھی درخت پر بیٹھی ہوئی بچی کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ تھی۔ اتنے میں ایک لڑکا آیا اور پیڑ کے نیچے کھڑا ہوگیا اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کود جاؤ۔''

یہ ابراہیم کا بیٹا عمر تھا اور یاسمین اس کی مدد سے اترنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے

سر ہلا کر کہا "نہیں"

"لڑکی۔ تم گر جاؤ گی۔" اس نے کہا اور پھر شاخیں پکڑ کر جست لگائی او۔ یاسمین کے پاس پہنچ گیا' اس نے یاسمین کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور نیچے کود گیا۔ یاسمین ہانپ رہی تھی اور بلی کا بھورا بچہ عمر کے عمامے سے چمٹا ہوا میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ اب وہ زمین پر تھے' یاسمین کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ابراہیم کا بیٹا بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ ملکی کو اپنے عمامے سے چھڑاتے ہوئے بولا" یا اللہ! تم دونوں کی گرفت کتنی سخت ہے!

یاسمین اپنے رخساروں کو پونچھتے ہوئے بولی" میرا مذاق نہ اڑاؤ!" پھر وہ کچھ سٹ پٹا سی گئی اور بھاگ کر پھیلی ہوئی بیلوں کے سائے میں چلی گئی۔ تمام رات وہ ابراہیم کے بیٹے کی مسکراتی ہوئی آنکھوں اور مچلتے ہوئے بازوؤں کے سوا کچھ اور نہ سوچ سکی۔

اب یاسمین ابراہیم کے بیٹے کے سوا' کسی اور چیز کے متعلق نہ سوچتی۔ اب وہ ان سواروں کو بھی نہ دیکھتی جو گلی کے موڑ پر باغیچے کے پاس سے گزرا کرتے تھے' بلکہ ایسی جگہ بیٹھتی جہاں سے مکتب کا دروازہ نظر آتا تھا اور جب وہ بے ہنگم لڑکا دوسرے لڑکوں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا مکتب سے آتا تو یاسمین وہاں سے بھاگ جاتی اس کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو جاتا' لیکن پھر بھی وہ کنکھیوں سے اسے دیکھتی رہتی۔ پہلی بار یاسمین نے یہ محسوس کیا کہ وہ لڑکا سرو قد ہے اور ہموار پتھروں پر اپنے قدم مضبوطی سے رکھتا ہوا چلتا ہے۔ اس کے ہونٹ موٹے اور گہرے رنگ کے ہیں جب وہ اسے دیکھ کر مسکراتا ہے تو اس کے سانولے چہرے پر ملائمت کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

یاسمین عمر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی بہن کا غازہ اپنے چہرے پر لگایا اور آنکھوں میں سرمہ بھی؟ پھر ایک دن چنبیلی کے پھولوں کا ہار گوندھا اور جس طرح اس کی بہن نے کسی نوجوان کو دیکھ کر ہار گرایا تھا اسی طرح اس نے بھی ٹھیک اس وقت جب عمر دکان پر آیا یہ ہار گرا دیا۔ اس نے ہار اٹھا لیا اور جیب میں رکھ کر چل دیا..... اور یاسمین پورے ایک گھنٹے تک جیسے اپنے آپ سے چھپتی رہی' اسے یہ سوچ کر خوف اور شرم محسوس ہو رہی تھی کہ وہ پیش قدمی کرنے میں

بہت آگے بڑھ گئی تھی۔

ایک دن اس نے اپنی ماں کے آئینے میں بغور اپنا چہرہ دیکھا اور خود کو حسین محسوس کیا۔ اپنے تصور میں اس نے خود کو ایک پردہ دار حسینہ بنا لیا جس کے چہرے پر پورا نقاب پڑا ہوا ہے اور کسی امیر زادی کے مانند لوگ اسے حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے اپنے دل کی سب باتیں بلی کے بچے کو بتائیں۔ گھر کی عورتوں کا خیال ہوگا کہ یاسمین سو رہی ہے لیکن وہ جاگ رہی تھی اور اس کے دل میں یہ تمنا چٹکیاں لے رہی تھی کہ کاش ابراہیم کا بیٹا اس لمحے اس کے پاس ہوتا اور اس سے باتیں کرتا۔

عمر دکان پر آتا تو یاسمین اس کی ایک ایک حرکت غور سے دیکھتی۔ کس طرح وہ دھوپ میں چٹائی کے ایک کونے پر بیٹھ کر پڑھتا ہے' کن کتابوں کو وہ پسند کرتا ہے اور کتاب پڑھتے وقت بعض اوقات کس طرح پیچ و تاب کھا کر اپنی انگلیوں کو مروڑتا ہے ان سب باتوں کو یاسمین بغور دیکھتی۔ ایک کتاب اسے بہت پسند تھی۔ جب ایک مرتبہ یاسمین دکان میں اکیلی تھی تو اس نے اس کتاب کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ اس میں بہت سی تصویریں ہیں جن میں دائرے' لکیریں اور عجیب عجیب شکلوں کے مستطیل اور ان کے ٹکڑے بنے ہوئے ہیں۔ یاسمین اس کتاب کو پڑھ تو نہ سکتی تھی' لیکن پہچانتی خوب تھی۔ ایک دن ہمت کر کے اس نے یہ کتاب بڑے مخطوطوں کے اندر چھپا دی۔ جب ابراہیم کا بیٹا رحیم کے ساتھ دکان پر آیا۔ تو وہ دراز قد طالب علم کو دیکھ کر مسکرائی۔ دونوں اس کی طرف متوجہ تھے۔ رحیم بولا۔ "یاسمین! ماہ نو اور جنت کی کسی حور کی کیا مجال کہ تیرے حسن کے مقابل آئے۔" یاسمین کو یہ جملہ زمین سے اٹھا کر آسمان پہ لے گیا۔ اس نے سوچا کاش یہ جملہ ابراہیم کے بیٹے نے کہا ہوتا۔ اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور پھر یک لخت اس انداز سے اٹھائیں کہ رحیم انہیں دیکھ کر پسند کرے۔

"یاسمین مسکرائی' لیکن اس کا دھیان ابراہیم کے بیٹے کی طرف تھا جو اس کتاب کو تلاش کر رہا تھا یاسمین نے جان بوجھ کر مخطوطوں کے ڈھیر کو گرا دیا اور تصویروں والی سرخ کتاب اس میں سے نکال لی۔ کتاب نکالتے وقت اس سے کتاب کا ایک صفحہ

پھٹ گیا۔ ٹھیک اس وقت یاسمین کو اپنے باپ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ابراہیم کے بیٹے نے شائد کتاب کا صفحہ پھٹتے نہیں دیکھا تھا ادھر یاسمین کا دل درد سے تڑپ گیا کہ ابراہیم کے بیٹے کو یہ کتاب سب سے زیادہ پسند تھی' لیکن اس نے پھٹے ہوئے صفحے کو جس کا کنارہ باہر نکل رہا تھا دیکھ ہی لیا۔ فوراً اس نے یاسمین کے باپ سے کہا کہ ''یہ صفحہ مجھ سے پھٹا ہے اس لے اب میں اسے خریدوں گا۔ اس کی قیمت کیا ہے؟''

یاسمین کے باپ نے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا'' یہ اقلیدس جس میں تمام شکلیں بنی ہوئی ہیں؟'' یہ ایک قیمتی نسخہ تھا' بوڑھا کتاب فروش اور رحیم دونوں جانتے تھے کہ ابراہیم کے بیٹے کے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ کتاب خرید سکے۔ یاسمین کے باپ نے کہا'' نیشاپور کے مدرسے کے کتب خانے میں بھی اقلیدس کا کوئی ایسا نسخہ نہیں جس میں تمام شکلیں ہوں'' رحیم نے اسکی بات کاٹ کر کہا'' اچھا اسے میں خرید لوں گا'' کیونکہ ابراہیم خیام کے اس لاابالی بیٹے عمر کو میں یہ کتاب تحفے میں دینا چاہتا ہوں۔''

عمر نے سرخ کتاب اپنے مضبوط ہاتھوں میں اٹھالی۔ رحیم ہنستے ہوئے بولا'' لیکن پرانی کتابیں بیچنے والے بزرگ! خدا کے لیے! یہ نہ کہنا کہ یہ کتاب سلطان محمود کی ملکیت تھی اور اسے وہ ہمیشہ اپنے سنہری تخت کے پاس رکھتا تھا۔ یہ کتاب چودہ دینار سے زیادہ کی ہے کیونکہ یہ ایک کافر یونانی کی لکھی ہوئی ہے جسے مرے ہوئے عرصہ گزرا۔''

یاسمین کے باپ نے جواب دیا'' نہیں جناب'' یہ اتنی سستی کتاب نہیں'' صرف کتاب' بغیر شکلوں کے اس سے دوگنی قیمت کی ہے اور پھر اس کی یہ جلد ویسے بھی نایاب ہے''

کافی دیر تک وہ قیمت پر بحث کرتے رہے اور یاسمین اشتیاق سے ان کی گفتگو سنتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ عمر اس کتاب کو حاصل کرنے کا کتنا خواہش مند ہے۔ بالاخر رحیم نے یہ کتاب انیس دینار اور کچھ تانبے کے سکوں کے عوض خرید لی۔ اس کے بعد پھٹے ہوئے صفحے کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ جب دونوں طالب علم دکان سے چل دیئے تو یاسمین نے دیکھا کہ عمر چلتے چلتے ذرا ٹھہرا اور اس نے اپنی جیب سے ایک قلمدان نکالا جس پر بہت عمدہ نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ یہ قلمدان اس نے زبردستی رحیم کے ہاتھ

میں دے دیا اور واپس لینے سے انکار کرتے ہوئے بھاگ گیا۔

وہ شام' ابراہیم خیام کے بیٹے کے لیے ایک یادگار شام تھی۔ اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور چشمے پر اپنے ہاتھ دھو کر بڑی احتیاط سے بھیڑ کی کھال کے تولیے سے انہیں پونچھا پھر اس نے مزید ایک چراغ کا بندوبست کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ خام کمرہ مکان کی چھت پر واقع تھا' اسے پیاز سکھانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ عمر نے اسے معمولی کرائے پر لے رکھا تھا' یہاں وہ رات کی تنہائی میں ستاروں کا نہایت اطمینان سے مطالعہ کرسکتا تھا۔ جب رات کے وقت میدان میں ہوا چلتی تو سوکھی گھاس اور پیاز کے چھلکوں سے ایسی آواز پیدا ہوتی جیسے وہ زندہ ہوگئے ہوں۔ یہاں عمر اپنے بستر پر لیٹ کر مکانوں کی چھتوں اور قصر سلطانی کے مدور گنبد کو دیکھ سکتا تھا۔

ہوا کچھ ایسی تیز نہ تھی۔ عمر نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہے اور دوسرا چراغ بھی روشن کر لیا پھر دونوں چراغ دیوار کے طاق میں رکھ دیئے۔ اقلیدس کے نسخے کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ اس کے صفحے پلٹنے لگا۔ طوطے کی طرح سبق رٹنے کے مقابلے میں اسے یوں مطالعہ کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔

عمر کے ابرو سمٹ گئے' آنکھوں میں اشتیاق کی چمک پیدا ہوگئی اور اس نے قلم دوات اور روئی کے کاغذ کا ایک ورق لیا۔ جس پر سے سال ہا سال پہلے کی ایک تحریر کو اس نے مٹا دیا تھا۔ پھر پیمانے اور پرکار کی مدد سے اس نے کاغذ پر ایک گاؤ دم شکل بنا کر اس کے ٹکڑے کیے۔ اس کا دماغ حساب لگانے میں مشغول اور انگلیاں شمار کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ وہ اپنے کام میں اتنا غرق تھا کہ کمرہ' چراغ بلکہ کتاب کی شکل بھی اس کے ذہن سے محو ہوگئی..... پھر ایک لمحے کے لیے کسی جانی بوجھی آواز نے اس کی محویت میں خلل ڈال دیا۔ یہ عشاء کی اذان کی آواز تھی عمر نے اپنے اندر ایک عجیب قسم کی بے چینی محسوس کی۔ اسے نماز پڑھنی چاہیے۔ نماز کے بعد اس نے چراغوں کے گل جھاڑے اور ایک نیا سوال حل کرنے میں مشغول ہوگیا۔

آدھی رات کے قریب پھر اس کے انہماک میں خلل پڑا۔ نیچے گلی میں اسے کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ مشعلوں کی روشنی نظر آئی اور ایک کرخت آواز سنائی

دی۔ وہ اٹھ کر منڈیر تک گیا اور دیکھا کہ ایک دبلا پتلا شخص' سر پر سیاہ عمامہ باندھے مجمع کے بیچ میں کھڑا ہے'' مومنو!'' بہت قریب ہے وہ دن' جب تم میں سے ان لوگوں کو' جنہوں نے عیش وعشرت میں زندگی گزاری ہے ایک تنبیہ کرنے والا بلائے گا۔ وہ دن آرہا ہے جب تمہیں کافروں کے خلاف تلوار اٹھانی پڑے گی۔ اور جب وہ دن آن پہنچے گا تو تمہیں آرام دہ بستروں سے اٹھانے کے لیے ڈھول پیٹا جائے گا۔ کہ تم تلواریں سونت کر کافروں کو اس طرح مار بھگاؤ گے جیسے تیز ہواریت کو اڑا دیتی ہے۔ اس تنبیہ پر غور کرو!''

حنبلی اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر اپنی آواز کے تیر رات کی تاریکی میں پھینکتا رہا۔ بیکار لوگ آپس میں گپ لڑاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ عمر نے اس کی گفتگو بڑی دلچسپی سے سنی کیونکہ وہ شخص بڑا خوش بیان تھا۔ لیکن جنگ! کیا سلطان ہمیشہ جنگ میں مصروف نہ رہتا تھا؟ جب حنبلی آگے بڑھ گیا اور ''مومنو!'' کی صدا مکانوں کی چھتوں سے بلند ہونے والی آوازوں میں مدغم ہوگئی۔ تو عمر نے سر اٹھا کر ستاروں کی ترتیب پر نظر ڈالی۔ یکا یک اسے جماہیاں آنے لگیں۔ انگڑائی لیتے ہوئے اس نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیئے۔ اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا کمبل شانوں تک اوڑھتے ہوئے اپنے بستر پر دراز ہوگیا۔ لیٹتے ہی وہ بے خبر سو گیا۔

اور پھر یاسمین کو وہ موقع مل گیا جس کی اسے تمنا تھی۔ ماں نے چشمے سے ایک گھڑا پانی لانے کے لیے اسے بھیجا۔ چنار کے درخت کے نیچے چشمے تک خالی گھڑا لے جانا تو بہت آسان تھا' مگر جب گھڑا بھر گیا تو یاسمین اپنے چھوٹے سے سر پر گھڑا اٹھا کر رکھنے کی کوشش سے کسمساتی رہی۔ اسی دوران میں عمر وہاں آنکلا اور چشمے پر جھک کر اس نے اوک سے پانی پیا۔ اس وقت اس کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ وہ اپنے کسی دوست سے بحث میں بھی مصروف نہ تھا۔ اس نے سنجیدگی سے یاسمین کو سلام کیا۔ اس سے پہلے کہ عمر آگے بڑھے۔

''ارے کچھ بات کرو۔'' بے ساختہ یاسمین کی زبان سے نکلا۔

''میں کیا بات کروں۔''

یاسمین کو ڈر تھا کہ عمر کہیں چلا نہ جائے۔ ''میرے ابا جان کہتے ہیں کہ تم بڑے ظریف ہو۔ تم کیوں اپنی عاقبت خراب کرنے کے درپے ہو؟''

عمر نے یاسمین کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی طوطی ہے جسے یک بیک گویائی مل گئی ہو۔

''یہ کہیں بہتر ہے'' اس نے جلدی سے کہا کہ ''تم لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرو ان کا مذاق نہ اڑاؤ۔ وہ کبھی کبھی قند کھلائیں گے۔

اچھا جاؤ۔ تم کتنے بڑے ہو؟ جب تم مدرسے سے باہر ہوتے ہو یا کچھ سوچتے ووچتے نہیں یا رحیم کے پاس نہیں بیٹھے ہوتے۔ تو اس وقت تم کیا کرتے ہو۔''

''میں!'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' میں سترہ سال کا ہوں۔ کبھی کبھی میں اپنے ابا کی دکان پر چلا جاتا ہوں جو خیموں کا بیوپار کرتے تھے۔ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ لیکن رحیم۔ رحیم تو جا رہا ہے۔''

یاسمین کے دل میں شوق چٹکیاں لینے لگا۔ شرماتے ہوئے اس نے لڑکے کی طرف دیکھا اور ذرا کھسک کر پتھر پر اپنے پہلو میں اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کی ''اچھا یہ بتاؤ'' اس نے بڑے بے تابانہ انداز میں کہا ''تم کیا کام کرنا چاہتے ہو۔''

''اور تم اس وقت کیا سوچتی رہتی ہو۔ جب بچے نہیں کھلاتیں۔ پانی نہیں بھرتیں یا جب کپڑے نہیں دھوتیں.....؟''

یاسمین نے بڑی مایوسی سے محسوس کیا کہ ایک طالب علم کو جو مدرسے میں استادوں سے بحث کرتا ہے۔ قرآن کی آیات پڑھتا ہے جو اسے حفظ ہے اور جسے اسی قسم کی اور بہت سی مصروفیات ہیں۔ بھلا اس غریب سے کیا تعلق۔ لیکن اس کی یہ غلط فہمی مفید ثابت ہوئی کیونکہ عمر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے سوچ کر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں۔ میرے پاس ایک رصد گاہ ہو۔''

یاسمین کو اگرچہ یہ معلوم نہ تھا کہ رصد گاہ کیا چیز ہوتی ہے لیکن وہ کوئی دوسری غلطی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ''اور پھر.....''

''اور اس کے ساتھ افقی گلوب۔ اور بطلیموسی نظام ہیئت کی جدول۔'' اور ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ ایک رصد گاہ کی تکمیل کے لیے بہت کچھ چاہیے۔ یاسمین نے سوچا کہ عمر کو ایک مینارے کی آرزو ہے جو بالکل تنہا ہو۔ جو شاید اس سبزہ زار کی طرح ہوگا جہاں سفید ہنس رہتے ہیں اور جو خود اس کے خوابوں میں بستے ہیں۔''

''ہاں ہاں' میں جانتی ہوں'' اس نے سر ہلا کر کہا۔''تم سیدی احمد کی طرح جوتشی بن کر ستاروں کی گردش سے لوگوں کی تقدیریں پڑھنا چاہتے ہو۔''

اس کے گھر کی بڑی بوڑھیاں جوتشی سیدی احمد کو بہت مانتی تھیں۔

.....عمر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس کی بھویں سکڑ کر ایک دوسرے سے مل گئیں اور اس نے دانت پیس کر کہا۔''وہ احمقوں کا باپ' ڈھینچو' ڈھینچو کرتا ہوا گدھا۔ اپنے اوٹ پٹانگ منتر اور زائچے لیے پھرتا ہے۔''

عمر کو تقدیر کا حال بتانے والوں پر اعتقاد نہ تھا۔ جو وہ کرنا چاہتا تھا وہ یاسمین کی سمجھ سے باہر تھا۔ عمر کو وقت کا تعین کرنے کے سلسلے میں ایک رصد گاہ کی ضرورت تھی۔ یاسمین کے دماغ میں وقت کا تصور طلوع آفتاب سے شروع ہوتا تھا۔ پھر پانچ وقت کی نمازیں۔ اور ستاروں کے نمودار ہونے پر ختم ہو جاتا تھا۔ رہا مہینوں کا شمار' اس کے لیے ظاہر ہے کہ چاند موجود تھا۔

عمر بہر حال اس سلسلے میں چاند سے مطمئن نہ تھا۔ چاند اپنے راستے پر چلتا رہتا ہے اور سال میں وقت کے کئی گھنٹے شمار کرنے سے چھوڑ دیتا ہے۔ آخر انسان سال میں ان گھنٹوں کا نقصان کیوں کریں۔ اس میں چاند کا قصور تھا' لیکن اس کے باوجود گھنٹوں کا صحیح شمار کرنے کی غرض سے لوگوں کو چاند سے قطع تعلق کرنا بھی گوارا نہیں۔

یاسمین نے بڑے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا۔ اس کے دماغ میں اور بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ اگر عمر کو ایسی رصد گاہ میسر آ جائے اور وہ اس سے ذرا بھی محبت کرے تو وہ اس رصد گاہ میں جھاڑو دے گی۔ اس کے کپڑے دھوئے گی' اس کے جوتوں پر کشیدہ کاری کرے گی اور دونوں رات دن اس رصد گاہ ہی میں رہا کریں گے۔

یاسمین ابھی گھر واپس جانا نہ چاہتی تھی۔ ابراہیم کے بیٹے کی آواز اس کے

کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ وہ اس کے خوبصورت چہرے کے اتار چڑھاؤ سے لطف اٹھانا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا بغیر عمر کے اس کا وجود خالی خالی سا ہوگا۔ محض بیکار۔ اور کبھی دنیا کی کوئی چیز اسے خوش نہ کر سکے گی۔ وہ کھسک کر اور اس کے قریب آ گئی۔ اس نے گلاب کے پھول کو زور سے مٹھی میں دبا لیا جو اس نے اپنے بالوں میں لگانے کے لئے توڑا تھا۔

''تمہیں یہ پسند ہے؟'' یاسمین نے بڑھی دھیمی آواز میں کہا۔ اس وقت عمر ایام چاند کے ناقابل معافی جرم پر بحث ختم کر چکا تھا۔

''کیا؟ اوہ یہ! کیوں.....'' اس نے پھول اپنی انگلیوں میں لے لیا اور اسے سونگھا۔''کیا یہ تمہارا ہے؟''

''میں چاہتی ہوں تم یہ قبول کر لو'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔''اور اسے اپنے پاس رکھو۔''

(ایک مرتبہ اس کی بہن نے بھی اسی طرح ایک پھول جھروکے سے نیچے پھینکا تھا۔ اور یاسمین نے دیکھا تھا کہ بغداد کے ایک نوجوان نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا)۔ ابراہیم کے بیٹے نے اس پھول کو محض سونگھنے ہی پر اکتفا کیا۔ اس کا دماغ ابھی تک چاند کے ساتھ بھٹک رہا تھا۔ یاسمین نے ایک مرتبہ پھر عمر کو اس زمین کی اور خود اپنی جانب واپس لانے کی کوشش کی۔

''جب تمہیں رصد گاہ مل جائے گی.....'' یاسمین نے سوچا وہ رصد گاہ قلعہ کے برج کی سی ہوگی۔''تو میں..... بہت خوش ہوں گی۔''

عمر یہ سن کر مسکرایا۔''یاسمین..... بھلا تمہاری کیا عمر ہوگی؟''

''یہی کوئی تیرہ برس'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اس نے اپنی ماں اور دوسری شادی شدہ عورتوں کو کہتے سنا تھا کہ جب لڑکی تیرہ برس کی ہو جائے تو اس کی شادی کر دینی چاہیے۔

''جب تم پورے تیرہ سال کی ہو جاؤ گی تو میں تمہاری لئے گلاب کے پھول لاؤں گا، بہت سارے۔''

یاسمین جھوم اٹھی۔

عمر وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔ اسے اس بات پر بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ دھاری دار کپڑوں میں ملبوس اور گرسنہ آنکھوں والی لڑکی سے وہ اتنی دیر تک باتیں کس طرح کرتا رہا، لیکن یاسمین جہاں تھی وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں جذبات سے معمور تھیں۔ مسرت سے اس کے تمام جسم میں نہ جانے کیسی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے گدھوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنی اور لوگوں کی آوازیں بھی جو اسے کہیں بہت دور سے آتی معلوم ہو رہی تھیں۔ ساری گلی اسے کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئی اور آنے جانے والے تمام مرد اجنبی سے دکھائی دیئے، اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اب یہ تمام کائنات کبھی اپنی اصل حالت پر واپس نہ آئے گی..... چشمے کے کنارے اتنی دیر تک بیٹھے رہنے پر جب اس کی ماں نے تھپڑ مارے تو اسے اس کا بھی ملال نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر وہ بھاگی ہوئی باہر گئی، اسی جھاڑی سے گلاب کا ایک پھول توڑا اور اسی رات بلی کے بھورے بچے کو اٹھا کر اپنے بچھونے پر آ کر لیٹ گئی۔

''اب وقت آ گیا ہے'' دوسرے دن گھر کی عورتوں میں سے کسی نے تجویز کیا کہ ''یاسمین کو نقاب پہنانی چاہیے اور گھر کی چاردیواری میں رکھنا چاہیے۔ خدا کی پناہ..... لوگوں نے اسے چشمے کے کنارے گھنٹہ بھر تک ایک بے ریش طالب علم کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔''

''آئندہ وہ دکان میں کام نہیں کرے گی۔'' اس کی ماں نے کہا۔ یاسمین خاموش رہی۔ آخر ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ بہر حال اب وہ شادی کے قابل عورتوں کی طرح نقاب تو پہنا کرے گی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ دیواریں اور چلمنیں اس کی محبت کو مقید نہیں رکھ سکتیں۔

لیکن عمر کہیں باہر چلا گیا۔

دوسرا باب:

شاہراہ خراسان پر

سرائے میں جیسے رت جگا تھا۔ آدھی رات گذر گئی لیکن کوئی بھی نہ سو سکا۔ کھلے ہوئے صحن میں آگ روشن تھی جس میں خاردار جھاڑیاں جل جل کر چیخ رہی تھیں۔ اونٹ بیٹھے بیٹھے بلبلا رہے تھے۔ سرائے کے مختلف گوشوں میں کھڑے ہوئے گھوڑے سوکھی گھاس زور زور سے چبا رہے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ گداگر اپنے ہاتھوں میں کشکول اٹھائے مسلسل ''یاہو'' ''یاحق'' کی صدائیں لگاتے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

خالی دیگچیوں کے ارد گرد بیٹھے لوگ اپنی انگلیاں چاٹ رہے تھے جو کھانے کے بعد چاول اور چکنائی سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی خشک میوے یا تانبے کے سکے وہ گداگروں کے کشکولوں میں بھی ڈال دیتے تھے۔ ان کے دلوں میں خیرات کرنے کا جذبہ اس لیے کارفرما تھا کہ وہ سفر کر رہے تھے اور سفر بھی کیسا پر خطر! پھر خیرات کرنا تو ویسے بھی ثواب کا کام ہے۔

سرائے کا مالک چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ پانی کا ایک ایک قطرہ ختم ہو چکا ہے وہ موسیٰ تو ہے نہیں کہ ایسی حالت میں پانی کہیں سے پیدا کر دے، اور اس دوران میں وہ بڑی چالاکی سے اپنے کھیسے میں رقم کا شمار بھی کرتا جاتا تھا۔ شاہراہ خراساں پر اس سرائے میں ان دنوں بڑی گہما گہمی تھی۔ حتیٰ کہ وسط سرما میں بھی روزانہ سینکڑوں آدمی ادھر سے گزر رہے تھے اور سب کے سب فوج میں شامل ہونے کے لئے مغرب کی سمت

سفر کر رہے تھے۔

سرائے کے کشادہ صحن کے چاروں طرف مسقف دالان بنے تھے ان دالانوں میں لوگوں نے قدم قدم پر بھیڑ کی کھالیں بچھا رکھی تھیں۔ کچھ نے انگیٹھیوں میں کوئلوں کی آگ روشن کر رکھی تھی جس کی روشنی میں ان کے باریش چہروں کی جھریاں تک صاف نظر آ رہی تھیں۔ خراسانی، ایرانی اور عرب قاقم وسنجاب کے دہرے لبادے پہنے مسکرا مسکرا کر شگفتہ انداز میں بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ پہاڑوں کی یخ کر دینے والی ہواؤں میں سفر کرنے کے بعد انہیں یہ آرام بہت خوش گوار محسوس ہو رہا تھا۔ صرف چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں والے سپاٹ ترکی چہرے، احساس سے خالی نظر آتے تھے۔ وسط ایشیاء کے لق و دق صحرا سے آنے والے ان جفاکش سواروں کے لئے سردی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہ جنگ اور آوارہ گردی کے عادی تھے اور بہت ہی کم باتیں کرتے تھے۔

نیشا پور کے زمیندار کے بیٹے رحیم زادہ کے پاس اتفاق سے ایک انگیٹھی تھی۔ وہ سمور کے استر کا ایک نفیس خلعت پہنے انگیٹھی کی گرمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ایک رات جب وہ دروازہ بند کیے چھپ کر شراب پی رہا تھا تو ایک پر جوش جنبلی کی صدا اس کے کانوں میں پہنچی تھی۔ اس نے اس صدا کو اپنے لئے ایک تنبیہ تصور کیا تھا۔ رحیم کھیل تماشوں کے علاوہ عموماً بڑا کاہل واقع ہوا تھا۔ لیکن اس تنبیہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اسے اس جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھانے چاہئیں اور اسی جذبہ کے تحت وہ اپنے رضاعی بھائی عمر خیام اور ایک مسلح دستے کے ساتھ مغرب بعید میں سلطان الپ ارسلان کی ٹڈی دل فوج میں شامل ہونے کے لئے چل پڑا تھا۔

''بہر حال'' اس نے کہا۔ ''میدان جنگ، ایک ہرن کا تعاقب کرنے کے مقابلے میں تو زیادہ ہیجان انگیز ہوگا۔''

رحیم قدیم ایرانی شرفاء کی نسل سے تھا۔ وہ ایرانی شرفاء جو یونانیوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ وہ بڑا نفیس مزاج انسان تھا۔ اعلیٰ قسم کی شرابیں پینے کا دلدادہ۔ اسے چوسر اور چوگان کھیلنے کا بھی شوق تھا مگر وہ ان سے بہت جلد اکتا جاتا تھا۔

''بخدا!'' اس کا ایک ہمراہی بڑبڑایا۔ ''کیا کڑاکے کی سردی ہے۔''

رحیم نے جماہی لی۔ واقعی سردی شدید تھی۔ اس کے علاوہ اس کے بستر والی کھال میں کچھ کھٹمل بھی گھس آئے تھے۔ اتنے میں سرائے کا مالک اس کے سر پر آ کھڑا ہوا اور جانے کا نام نہ لیا تو رحیم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''عالی مرتبت نوجوان امیر کو ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''سرائے کی پشت کے مکان میں کچھ مسافر عورتیں مقیم ہیں۔''

یہ لڑکیاں بغداد سے آئی ہیں۔ بڑی خوش مذاق اور تربیت یافتہ ہیں۔'' اس نے اس افسانہ طرازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رحیم سے صاف صاف کہا۔ ''اگر تیغ زنوں کے امیر کو تفریح کی ضرورت ہو.....''

رحیم قدرے ہچکچایا، اور پھر کھڑا ہو گیا۔ ''ابراہیم کے بیٹے سے کہنا'' اس نے اپنے ملازم کو حکم دیا۔ ''کہ میں جا رہا ہوں، تھوڑی دیر کے لئے، کچھ اپنے دوستوں سے باتیں کرنے۔''

''بسر و چشم'' بڑے ادب سے اس شخص نے کہا۔

جب رحیم سرائے کے مالک کے پیچھے پیچھے زینے کی طرف بڑھا تو تیغ زنوں نے بڑے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ انگیٹھی سے ہاتھ تاپتے ہوئے سو گئے۔

خاصی دیر کے بعد رحیم واپس آیا۔ مردوں کی طرح سوتے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا۔ وہ تھکا ماندہ اور پژمردہ تھا۔ ''خدا کرے سرائے کی مالک کی سات پشتیں دوزخ کی آگ میں جلیں'' رحیم بڑبڑایا۔ ''خدا کرے وہ غلاظت کھائیں'' وہ دھڑام سے بستر پر گر گیا۔ مگر اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عمر جاگ رہا تھا۔ اس نے شکایتاً کہا۔ ''تو کہاں غائب ہو گیا تھا۔''

''یوں ہی گھوم رہا تھا۔ عمر نے جواب دیا'' شاہراہوں کے مناظر اور ان سے بھی زیادہ ریگستانی سڑکیں اس کے اندر ایک ولولہ پیدا کر دیتی تھی۔ وہ خود ریگستان میں پیدا ہوا تھا اور اس کی رگوں میں عرب خانہ بدوشوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ ''اس طرح ایک

بہت بڑی خیمہ گاہ ہے، اور اس خیمہ گاہ میں ایک اتنا بڑا خیمہ ہے جیسے نیشا پور کا چھوٹا قلعہ۔ وہاں ترک ہی ترک بھرے ہوئے ہیں، مسلح، سونے کے خود پہنے۔ میں ان کی گفتگو بہت تھوڑی سمجھتا ہوں۔ وہاں آج رات کوئی شہزادہ بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ میں خود اسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

رحیم نے ایک گہرا سانس لیا۔ عمر کا یہ عمل اس کے تجسس، ہر بات میں دخل اندازی، ہر معاملے میں تحقیق کے خیال کے تحت تھا۔ ابراہیم کے بیٹے کے لئے جنگ بالکل نئی چیز تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنی سرائے سے باہر اجنبی گھڑ سواروں کو دیکھنے بھی گیا۔ پڑاؤ کے بعض حصوں میں جا کر اس نے لوگوں سے سوالات بھی کئے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اونٹوں سے اتارے ہوئے مال کا جائزہ تک لے ڈالا۔ دریا کو تیر کر عبور کرنے میں عمر کو بڑا مزا آیا۔ لیکن رحیم دریا پار کرنے میں بھیگ کر بے لطف ہو گیا۔

''کسے دیکھا ہے؟'' رحیم نے عمر سے پوچھا۔

''میں کچھ سن نہیں سکا۔ وہ اپنے خیمے میں آگ کے قریب ایک سرخ حاجم پر بیٹھا ہوا تھا اور حکماء سے بات چیت کر رہا تھا جو شاید اس کے استاد تھے۔ وہ تجھ سے عمر میں کوئی دو سال چھوٹا ہوگا۔ وہ دھاری دار سمور کا کفتان پہنے تھا۔ حکیم اور عالم اس سے کہہ رہے تھے کہ جو ستارہ اس نے دیکھا تھا۔ وہ سہیل تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بات غلط ہے۔ اس مقام سے اس وقت کسی شخص کو سہیل نظر نہیں آ سکتا.....''

''ارے یہ تو میں بھی جانتا ہوں'' رحیم نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''وہ کیا ضرب المثل ہے.....؟''

''سہیل دیکھنا خوش نصیبی کی نشانی ہے..... ہاں۔''

''ترکوں کے سامنے بولنے کی تو نے جرات کی؟ آخر کس طرح۔''

''میں نے عربی میں بات چیت کی'' عمر نے شگفتہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ترخان بچہ ستاروں کا جھرمٹ (عقد ثریا؟) دیکھنے کے لئے میرے ساتھ خیمے سے باہر تک آیا۔ وہ سب عالم بے وقوف تھے اور بے وقوفی کی باتیں کر رہے تھے.....''

''نہیں، نہیں، تم نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ تو نے انہیں جھٹلا کر بے وقوفی کی۔ تیری سمجھ میں یہ بات کب آئے گی کہ اس شخص کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولنی چاہیے جو تیرے منہ پر جوتا مار سکتا ہے۔'' رحیم کو کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ ڈر بھی لگا۔

''شہزادے نے کیا کہا؟''

''اس نے پوچھا کہ کیا یہ ستارے جنگ کے متعلق کوئی نشاندہی کرتے ہیں؟''

''بیشک۔ کرتے ہیں۔''

عمر اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور خشک زمین پر تلوار کی میان سے کچھ شکلیں بنانے لگا۔ ''رحیم اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''تو ہم مغ..... ایران کے قدیم پجاری..... سے بھی زیادہ دانش مند و عقلمند تصور کیے جائیں گے۔ اگر ہم انسانی تقدیر پڑھ سکیں! اس کے باوجود میں نے اس لڑکے کو بتایا کہ کون سا ستارہ کس برج میں مقیم ہے.....''

''مجھ سے فضول گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں'' عمر کے رضاعی بھائی نے بڑی بے صبری سے چلا کر کہا۔ ''یہ بتا کیا شگون نکلتا ہے؟''

عمر نے اپنا سر ہلایا۔ ''زرتشت کی گفتگو کان لگا کر سنو! دو بادشاہ برسر جنگ ہیں۔ اور آسمانوں سے یہ ندا آتی ہے کہ مشرق کے بادشاہ کا مقدر عروج پر ہے اور مغرب کے حکمران کا زوال پذیر ہے..... لیکن پیشین گوئی سنو..... موت کا سایہ دونوں پر چھایا ہوا ہے۔'' وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''یہ سب بے معنی باتیں ہیں، لیکن شیر بچے نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے وہ کسی بھوت کو دیکھ رہا ہو۔''

''شیر بچہ'' رحیم کی آنکھیں جیسے پھٹ گئیں۔ ''کیا کہا.....''

''وہی شہزادہ جو سفید کفتان پہنے تھا۔ سب لوگ بہر حال، اسے اسی نام سے مخاطب کر رہے تھے۔''

''اللہ رحم کرے'' رحیم نے گہرا سانس لیا۔ ''تو نے اس سے پہلے کبھی شیر بچے کا نام نہیں سنا تھا۔''

''نہیں۔''

''خدائے رحمان و رحیم تیرا ہاتھ دے! شیر بچہ صرف ایک ہی ہے۔ وہ سلطان الپ ارسلان، شیر بہادر، کا سب سے بڑا فرزند ہے۔ تو نے شہزادۂ ولی عہد سے فتح کی پیشین گوئی کی ہے۔''

''میں اسے نہیں جانتا تھا۔''

''مگر اس کا یقین کون کرے گا اور اس کے علاوہ تو نے اس کے باپ کی موت کی پیشین گوئی بھی کر دی'' جو..... رحیم نے مختلف امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا..... ''کوئی سمجھدار نجومی کسی حالت میں مجمع عام میں ایسی پیشگوئی نہیں کرے گا لیکن یہ شیر بچے کے لیے صاحب تاج وتخت ہونے کے مترادف ہے۔ اچھا! پھر اس نے کیا کہا؟''

''اس نے میرا نام پوچھا۔ اور میں نے بتا دیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تم کس کے ملازم ہو۔ میں نے کہا، کسی کا بھی نہیں۔ میں تو نیشا پور کے مدرسے کا طالب علم ہوں۔''

''ہوں۔ اگر مجھے اپنے ترک آقاؤں کا غلط اندازہ نہیں ہے اور اگر واقعی الپ ارسلان مر گیا تو، تو سیدھا اس شیر بچے کی خدمت میں حاضر ہو کر شاہی منجم کا اعزاز طلب کر سکتا ہے۔ اگر تجھے یہ مرتبہ حاصل ہو جائے تو ایک معقول تنخواہ پر مجھے اپنا فراش مقرر کر دینا۔''

عمر نے اپنا سر بے نیازی سے ہلایا۔

رحیم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''باوجود لا پروائی کے تو ایک عمدہ جوتشی بن سکتا ہے۔ ہر شخص تیری بات کا اعتبار کرتا ہے۔'' اویرماق.....'' اس نے ایک سوئے ہوئے ملازم کے ٹھوکر ماری۔ یرماق۔ چمڑے کے تھیلے میں سے صراحی نکال کر لا، اور ایک جام بھی۔''

رحیم نے ہاتھ میں جام لیا تو یرماق نے اس میں شراب انڈیل دی، شراب جو حرام ہے۔ لیکن رحیم اس کا دلدادہ تھا اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ مقدس جنگ لڑ کر جو ثواب عظیم حاصل ہونے والا ہے اس کے مقابلے میں اس چھوٹے سے گناہ کی کیا حقیقت ہے۔ عمر نے سنی ان سنی کر دی۔ اسے اپنے دودھ شریک بھائی سے بڑی محبت

تھی۔ وہ خاموش رہا۔

''نہیں نہیں۔ ہمیں شکست نہیں ہو سکتی۔'' رحیم نے بلند آواز سے کہا۔

''اگرچہ ہمارا سلطان ایک معمول سپاہی ہے۔ لیکن اسے آج تک ہر معرکے میں فتح نصیب ہوئی ہے۔ بہر کیف یہ ایک قابل یقین پیشین گوئی ہے۔'' خوش ذائقہ شراب سے اس کی طبیعت ذرا سنبھل گئی۔ اس نے دوسرا جام پیا۔ اور تصور کیا جیسے وہ میدان جنگ میں ہے، ''اور سلطان کے سرخ پرچم کے ساتھ ساتھ اپنے قد آور ابلق گھوڑے پر سوار بڑی بے خوفی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ دونوں فوجوں کی پہلی صفوں کے درمیان مسیحیوں کے ایک یگانہ روزگار سورما، ایک آہن پوش جنگجو سے دست بدست نبرد آزما ہے۔ اس نے تصور ہی تصور میں اپنے تئیں کافر جنگجو کو قتل کرتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا کہ مسلمان ہر طرف اس کی تعریف میں نعرے لگا رہے ہیں۔ اس نے اپنے دشمن کا سر اتار کر اپنے سلطان کے گھوڑے کے قدموں میں ڈالنے کا تصور کیا.....''

''ذرا لینا اسے۔ عمر'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کا دودھ شریک بھائی اپنے اونٹ کے بالوں والے کمبل میں لپٹا ہوا بالکل بے خبر سو رہا تھا، جیسے جنگ، فتح اور عنایات شاہی کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

تیسرا باب:

۱۰۷۱ء کے موسم بہار کا آغاز.....

نیشا پور سے مغرب کی سمت پانچ ہفتے کی مسافت پر آرمینیا کے پہاڑوں کے سائے میں وادی ارساس اس وقت سلطان الپ ارسلان کی فوج کا پڑاؤ تھی۔ شاہی مسخرا جعفرک اپنے سفید گدھے پر بیٹھا، کچھ سوچ رہا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں گدھے کے پیٹ کے دونوں طرف لٹک رہی تھیں۔ اس نے سرخ چوغا پہن رکھا تھا۔ اور اس کی بھوری آنکھیں بے چینی سے گردش کر رہی تھیں۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے فکر مند آقا سلطان الپ ارسلان کو تنہا نہ چھوڑے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے جو جنگ لڑنی ہے وہ کوئی معمولی جنگ نہیں ہے۔

جعفرک سے لوگوں نے کہا تھا کہ وہ سامان کے پاس اور مولویوں کے ساتھ بیٹھے، کیونکہ ان کی رائے میں یہ انتہائی محفوظ جگہ تھی۔ لیکن جعفرک نے انہیں جواب دیا کہ ''میرے لیے سب سے محفوظ جگہ اپنے سلطان کی رفاقت ہے، کیونکہ مسلمان ادھر تیر نہیں پھینکیں گے اور عیسائیوں کے فرشتے بھی کبھی وہاں نہیں پہنچ سکتے.....''

جعفرک کی اس بات سے مخدوم عالمیاں، فرمانروائے شرق و غرب، سلطان الپ ارسلان سلجوقی بہت خوش ہوا، چنانچہ جعفرک اس سرخ پرچم اور شاہی چتر کے قریب ہی ڈٹا رہا جو مسلح غلام الپ ارسلان کے سر پر پھیلائے ہوئے تھے۔ الپ ارسلان نے ان دنوں ہنسنا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ جنگ طول کھینچ گئی تھی اور مسلمان فوجوں کا

پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔

سلطان الپ ارسلان نے ملاذ گرد کی شہر پناہ کے قریب اور وادی کے فراز میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔ اس کے خیمے کے سامنے وسیع اور زرخیز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وادی میں ملعون رومیوں کی عیسائی فوجوں کے دل بادل بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان کثیر افواج کی کمان قسطنطنیہ کا شہنشاہ خود کر رہا تھا..... وہ شہنشاہ خود کر رہا تھا..... جس کے آباؤ اجداد چار سو سال سے اسلام کے ساتھ سخت دشمنی کرتے چلے آ رہے تھے۔

سلطان الپ ارسلان کے دستے کچھ عرصہ پہلے تک عیسائی شہنشاہ کی سلطنت میں محض چھاپہ مار کارروائیوں پر اکتفا کرتے رہے تھے۔ یا پھر ایشیا میں سلطنت روما کے مرکزی علاقے ایشیائے کوچک میں یلغاریں کیا کرتے تھے۔ لیکن اب سلطان الپ ارسلان کے ان حملوں نے رومیوں کو غضب ناک کر دیا۔ اس جنگجو ترک کے آباواجداد تو خاق کمانڈر کی اولاد تھے اور وسط ایشیا کے میدانوں سے نکل کر قسطنطنیہ تک لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ لیکن اب یہ ترک یورپ میں داخل ہو چکے تھے اور سلطان نے بڑی جرات سے شہنشاہ روم کو چیلنج کیا تھا۔ اب یہ شہنشاہ کثیر التعداد سوار اور پیادہ فوجوں کے ہمراہ کرائے کے بلغاری تیر اندازوں، جارجیا کے خوفناک نیزہ بازوں اور ان ارمنی سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھ رہا تھا جو اپنے ملک کو مسلمانوں کے حملے سے بچانا چاہتے تھے۔ چیونٹی کی چال بڑھنے والے اس ٹڈی دل میں نسل نسل کے لوگ تھے۔ یہ ستر ہزار کی فوج وادی میں آہستہ آہستہ اس ترک فوج کا تعاقب کر رہی تھی جس کی تعداد کل پندرہ ہزار تھی۔

عیسائی شہنشاہ ایک عمدہ سپاہی تھا، ان ترک سواروں سے جو اسے کئی ماہ سے پریشان کر رہے تھے، دست بدست جنگ کرنے کے لئے بے تاب تھا لیکن اب خود شہنشاہ کے افسروں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سلطان الپ ارسلان نے زمین پر اپنا پرچم گاڑ دیا ہے اور اپنے سوار دستوں کو شہنشاہ کا مقابلہ کرنے کے لئے وادی میں تعینات کر رہا ہے۔

جعفرک کو اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ پندرہ ہزار نفوس ایسی صورت میں جنگ کا انتظار کرنے بیٹھے ہیں جبکہ ستر ہزار دشمن فوجیں ان کے تعاقب میں ہیں۔

اس نے بعض امیروں کو، یہ کہتے سنا تھا کہ رومیوں کے کثیر التعداد نیزہ بازوں

کی تاب ہمارے جنگ آزمودہ ترک سوار نہیں لا سکتے۔ اس نے سوچا کہ پھر کیوں الپ ارسلان اپنے سواروں کے لیے جنگ کا منتظر ہے اور عیسائیوں کی فوجیں دلدلوں میں آہستہ آہستہ بڑھتی اور ترک فوجوں کے قریب آتی جا رہی ہیں۔ جعفرک جانتا تھا کہ بہت سے ترک افسر ایک جگہ جم کر لڑنے سے گھبراتے ہیں کیونکہ انہیں تو حملہ اور تعاقب کرنے یا تیزی سے پسپا ہو جانے کی عادت ہے۔

''پسپائی کے بارے میں سوچا بھی نہ جائے'' الپ ارسلان نے اپنی بھاری آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا ''ایسا نہیں ہوگا۔ رومیوں کے خیمے وادی کے اس نشیب میں لگ چکے ہیں وہ ہمارے تعاقب میں آگے بڑھ آئے اور ہم یہاں موجود ہیں۔ تقدیر کا فیصلہ لکھا جا چکا ہے اور جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔''

جعفرک بڑے شہزادے کے قریب بیٹھا تھا، اس نے دیکھا کہ شہزادے نے سر اٹھا کر اپنے باپ کی طرف اس طرح نگاہ کی جیسے وہ ان الفاظ سے ڈر گیا ہو۔ اس نے عیسائیوں کے عظیم شہنشاہ کا، بھیگے ہوئے وسیع و عریض میدان جنگ کا، اور ان بے حس سلجوق سواروں کا تصور کیا جو جنگ میں شکست قبول کرنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن اس نے سوچا غالباً اس جنگ کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے اور کل ہم اس کی بساط پر مہروں کی طرح ادھر سے ادھر ناچیں گے اور بس۔

الپ ارسلان رات بھر نہ سو پایا۔ صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے رحیم اٹھ بیٹھا۔ وہ مارے سردی اور جوش کے کانپ رہا تھا۔ اس نے یرماق کو اپنی تلوار دی اور دوسرے نوکروں کو اپنا ابلق گھوڑا کسنے کا حکم دیا۔ اس نے کچھ کھجوریں اور بھیگے ہوئے جو کھائے۔ اب جنگ کا ہنگام آن پہنچا تھا۔ یہ وقت ہرن کا تعاقب شروع کرنے سے پہلے جیسی سنسنی کا نہیں تھا۔ یا جس کا نقشہ رحیم نے اپنے ذہن میں کھینچا تھا۔ بجائے اس کے کہ طلوع آفتاب کے وقت سوار ہونے کا حکم دیا جاتا اور وہ نعرہ لگا کر میدان میں بڑھتا ایک خاموشی طاری تھی رحیم مجبوراً اپنے گھوڑے کے قریب بے قرار پھرتا رہا۔ کہر آلود فضا کا وہ دھندلکا جو اسے چھپائے ہوئے تھا، آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا اور اس کے ملازم آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے، پانسے پھینک رہے تھے۔ جب رحیم اپنے گھوڑے پر

سوار ہوا تو اسے آہستہ آہستہ سڑک سے گزرنے والے سواروں کے نیزے اور سر نظر آئے تھے۔ کبھی کبھی اسے ایسی ہوا کی سنسناہٹ سنائی دیتی جو دور کسی جنگل میں چل رہی ہو اور ایک بار وادی کے اس پار سے اس نے ایک زبردست شور سنا۔ بالکل ایسا شور جیسے کسی لنگر کے دن نیشاپور کی مسجد پر لوگوں کے ہجوم سے ہوتا تھا۔

ایک اجنبی ترک سوار رحیم کے قریب سے گزرا تو اس نے چلا کر اس سے جنگ کا حال پوچھا۔ اس نے صرف منہ پھیر کر رحیم کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ رحیم بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اپنے دستے کے کمانڈر کے پاس پہنچا۔ وہ ایک امیر تھا جس کے دستے میں نیشاپور کے رضا کار سپاہی شامل تھے۔

''ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیجئے ورنہ ہم پہلا حملہ نہ دیکھ سکیں گے۔'' رحیم نے بڑے اشتیاق سے امیر سے کہا۔ لیکن اسے بتایا گیا کہ وادی میں کئی گھنٹے سے جنگ ہو رہی ہے خراسانیوں کی عجیب عجیب خبریں پہنچی تھیں۔ کہا جا رہا تھا کہ عیسائیوں نے آہن پوش دیووں کو مسلمانوں سے لڑنے بھیجا ہے..... ایک پورا فوجی دستہ دریا میں ڈوب گیا ہے..... سلطان دائیں طرف پہاڑوں میں گھس گیا ہے۔ جارجیا اور آرمینیا کی کثیر التعداد فوجیں اس پر حملہ کر رہی ہیں۔ اور وادی میں میلوں تک عیسائی فوجیں پھیلی ہوئی ہیں۔

اتنے میں ایک شخص چلایا ''سامنے دیکھو، وہ ہمارا بادشاہ سلطان الپ ارسلان آ رہا ہے!'' رحیم گھوڑے کی رکابوں میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ سلطان ایک ٹیلے پر سواروں کے دستے کے جلو میں جا رہا ہے۔ اس دستے کے آگے جو سوار ہے وہ ایک سبزے (گھوڑے) پر بیٹھا ہے۔ وہ ایک لمبا چوڑا اور قوی انسان معلوم ہوتا ہے اس کے سال خوردہ چہرے پر دونوں طرف بل دی ہوئی مونچھیں ہیں اور سر پر بھیڑ کی سیاہ کھال کی اونچی ٹوپی۔ جس ہاتھ میں لگام ہے اسی میں ہاتھی دانت کی چھڑی ہے اور پہلو میں ترکش بالکل اس انداز سے لٹک رہا ہے جیسے وہ شاہی محافظ دستے کا کوئی تیر انداز ہے۔

رحیم نے آہستہ سے پوچھا ''سلطان کہاں ہے؟''

''واللہ! وہ سلطان ہی تو ہے جو سب سے آگے ہے'' کسی نے جواب دیا۔

رحیم کا تصور تھا کہ سلطان وہ ہوگا جو گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا اور اپنا ریشمی لبادہ ہوا میں

اڑاتا گزرے گا، اس کے زریں خود میں رنگیں پر لگے ہوں گے..... ایک پرچم ساتھ ہو گا۔ آگے آگے نقارے بجتے ہوں گے اور نہ معلوم اس کے علاوہ اور کیا کیا ہو گا۔ جب اس نے ان خاموش عام سے انسانوں کو دیکھا جن کے پیچھے سفید گدھے پر ایک بونا چلا جا رہا تھا تو اسے بیحد مایوسی ہوئی اور وہ خاموشی سے اپنے دستے میں واپس آ گیا۔

عمر نے دوپہر کے وقت اسے بلا کر کہا۔ ''رحیم! ادھر آؤ اب جنگ کے شعلے قریب تر آتے جا رہے ہیں۔ میں ترکمانوں کے ساتھ ٹیلے پر سے جنگ کا نقشہ دیکھ کر آیا ہوں۔'' جب وہ اس ٹیلے پر پہنچے جہاں سے سلطان گزرا تھا تو رحیم نے ایسی آواز سنی جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ اس کے کانوں میں ہتھیاروں کے ٹکرانے اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ اب دھوپ سے پوری وادی چمک رہی تھی اور اس کے دامن میں سواروں کی ہزاروں ٹولیاں ادھر ادھر دوڑتی نظر آ رہی تھیں کبھی وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتیں اور پھر وہ اس طرح ٹیلے کی طرف پلٹ آتیں جیسے ہوا کے کسی شدید جھونکے نے انہیں دھکیل دیا ہو۔

عمر نے چلا کر کہا ''دیکھو!'' خراسانیوں کے دستے نے آگے بڑھنا شروع کر دیا ہے۔

رحیم پر جوش ہو کر بولا ''بالآخر اب وہ حملہ کریں گے'' اتنے میں ایک لڑکے نے رحیم کی رکاب پکڑ لی اور چیخا۔ ''اللہ! الا اللہ!'' اس کی پشت پہ ایک نیزہ بندھا تھا اور وہ رحیم کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتا تھا۔

رحیم نے اپنی تلوار کھینچی لیکن پھر اسے نیام میں رکھ لیا کیونکہ دوسرے لوگوں نے ابھی تلواریں نہیں کھینچی تھیں۔ اب یہ سوار کھیتوں میں دوڑتے اور نالے پھاندتے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں وادی کے میدان میں دوڑتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا ان کے گھوڑے مقتول سپاہیوں کو دیکھ کر بھڑک اٹھتے تھے جو آدھے کیچڑ کے اندر اور آدھے باہر تھے۔ ان کے اردگرد بہت سے ایسے گھوڑے بھٹکتے پھر رہے تھے جن کے سوار غائب تھے اور عرب قبائل مال غنیمت لوٹنے میں مصروف تھے۔

رحیم جنگ کے شوق میں بے تاب ہو رہا تھا، بے ساختہ بولا ''اب یقیناً سلطان ہمیں نبرد آزمائی کے لیے طلب کرے گا۔'' لیکن دشمن سے نبرد آزما ہونے کا حکم

نہیں مل رہا تھا انہیں اپنے سامنے ترک فوج کا ایک سوار دستہ نظر آیا۔ جو ایک ویران باغ میں پڑاؤ ڈالے تھا۔ رحیم کے ساتھیوں کو بھی اسی جگہ شب بسری کا حکم ملا۔ ترکوں کو کہیں سے سوکھی جھاڑیاں مل گئی تھیں اور وہ خوب آگ جلا رہے تھے، لیکن خراسانیوں کے پاس نہ تو آگ جلانے کے لیے ایندھن تھا اور نہ کھانے کے لیے کوئی چیز۔ تھکن اور سردی کی وجہ سے ان پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی، یہاں تک کہ سحر کی سفیدی نمودار ہو گئی اور دور میدان میں طبل جنگ کے شور نے انہیں اس غنودگی سے بیدار کر دیا۔

یہ طبل عیسائی فوج کے کیمپ میں بج رہے تھے، کل روم کا شہنشاہ اپنی فوج کے ہزیمت خوردہ قلب کو لے کر پسپا ہو گیا تھا..... شہنشاہ کی محفوظ فوج جو عقب میں متعین تھی کسی غلط فہمی کی بنا پر یا اسے دھوکا دے کر رات کی تاریکی میں فرار ہو گئی تھی اور پہاڑوں میں شہنشاہ کے میمنے اور میسرے کی جو پیادہ فوج تھی، اس نے الپ ارسلان کے سواروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اور اب سحر ہونے پر طبل جنگ قسطنطنیہ کے سوار رسالوں کو تازہ حملہ کرنے کا حکم دے رہا تھا، لیکن رحیم اور عمر کو اس کا کچھ علم نہ تھا۔ ان کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل تھیں اور جسم زمین کی نمی اور سردی سے اکڑ گئے تھے۔

ملازموں نے ان کے گھوڑوں پر زین کس دی تھی اور اس سے پہلے کہ انہیں صورت حال کا پورا احساس ہو ان کے دستے کو میدان جنگ میں پہنچنے کا حکم ملا۔ کثیر التعداد سواروں کے غول چیختے اور نعرے لگاتے، اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑانے لگے۔ عمر کے ہاتھ باگ پر تھے اور سر میں ایسا درد تھا جیسے بخار ہو گیا ہو۔ اسے اپنے اردگرد کی افراتفری میں محض جزوی مناظر نظر آ رہے تھے۔ کسی سوار کے سر پر پگڑی کا اڑتا ہوا طرہ..... ننگے پاؤں اور منہ پھیلائے دوڑتا ہوا کوئی شخص..... کوئی الٹی ہوئی گاڑی جس کے نیچے کوئی رینگ رہا تھا۔

ایک طرف اسے کوئی زخمی شخص گھٹنوں کے بل چلتا نظر آیا۔ ایک سوار اس کے پاس پہنچا اور اس زخمی آدمی کے نیزہ مارا۔ نیزے کی انی زرہ سے ٹکرائی اور پھر اس زخمی شخص کے پہلو میں گھستی چلی گئی۔ اس کے منہ سے خون ابلنے لگا اور اس کا سر ڈھلک گیا، حالانکہ وہ اب بھی رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمر نے دل میں سوچا کہ یہ کوئی عیسائی سپاہی ہو گا۔

اس نے اپنا منہ پھیر کر رحیم کی طرف دیکھا۔ پہلو میں ڈھیلی پگڑی والا سوار ایک تیر کو جو اس کے کولہے میں گھسا ہوا تھا پکڑے تھا، عمر نے اس کے کراہنے کی آواز سنی۔ پھر اس نے اپنے دونوں طرف خیمے دیکھے۔ اس کے بعد عمر نے لوہے کی جھنکار اور چیخنے کی آواز سنی۔ اس نے دیکھا کہ گھوڑے کے منہ سے جھاگ اڑ کر اسی کی گردن پر آرہا ہے، چنانچہ اس نے باگ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ وہ جنگ میں شریک ہے لیکن اسے ایک بار بھی تلوار کھینچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ایک بڑے خیمے کے گرد خراسانی سوار اپنے گھوڑوں سے اتر اتر کر مال غنیمت تلاش کر رہے تھے۔ انہیں مال غنیمت لوٹنے کا حکم کسی نے نہ دیا تھا، لیکن وہ بچوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔ رحیم کے تین سپاہی دمشق کا کپڑا اور چاندی کے برتن لیے خیمے سے نکلے۔ وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو بھی کلائی سے پکڑے لا رہے تھے۔

سراسیمہ لڑکی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے حسین سنہرے بالوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر نقاب نہ تھا اور اس کی نازک کمر پر زربفت کی پیٹی کسی ہوئی تھی۔ سپاہی حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی عیسائی عورت نہ دیکھی تھی۔

رحیم نے چیخ کر کہا۔ ''عمر! اللہ نے ہمیں فتح دی'' فتح کا لفظ بھی کتنا عجیب تھا! رحیم نے کہا۔ ''یہ لڑکی کسی عیسائی امیر کی کنیز ہوگی۔ میں نے ابھی پیچھے ایک کافر کے بچے کو قتل کیا ہے آؤ خیمے میں چلیں.....''

اچانک یرماق چیخا ''ہوشیار ہو جاؤ! اللہ اکبر! سامنے خیموں کے درمیان سے سواروں کا ایک دستہ ہانپتا، اور کیچڑ میں لت پت گھوڑے دوڑائے چلا آرہا تھا۔ یہ سوار اپنے ہاتھوں میں تلواریں اور تبر لیے ہوئے تھے۔ وہ ایسے بگٹٹ چلے آرہے تھے جیسے جنات ان کا پیچھا کر رہے ہوں۔ وہ سیاہ خود پہنے تھے اور ان کے چہروں سے تناؤ اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔ یہ سوار عیسائی تھے۔

ابھی عمر نے اپنی باگ سنبھال کر گھوڑا موڑا ہی تھا کہ سوار اس پر ٹوٹ پڑے۔ گھوڑا کود کر الف ہو گیا اور عمر زمین پر آرہا۔ اس کے کندھے پر کوئی چیز لگی اور کسی

گھوڑے کے سم اس کے سر سے ٹکرائے۔ عمر کے منہ اور آنکھوں میں گرد بھر گئی۔ اس نے آنکھیں صاف کیں اور لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس کا ایک ملازم زمین پر اپنے جسم کو اس طرح مروڑ رہا ہے جیسے وہ کسی پوشیدہ دشمن سے لڑ رہا ہے۔ اس کے قریب ہی یرماق جھکا ہوا رحیم کو دیکھ رہا تھا جو زمین سے اٹھنے کی کوشش میں تھا۔

عمر دوڑ کر وہاں پہنچا اور اس نے رحیم کے بازو پکڑے۔ رحیم عجیب انداز سے مسکرا رہا تھا۔ عمر چلایا ''کیا تیرے چوٹ لگ گئی۔ کیسے؟ رحیم نے اس انداز سے اس کی جانب دیکھا جیسے جواب دینے کے لئے اس کے پاس کوئی لفظ نہ ہو۔ عمر نے یرماق کی مدد سے رحیم کے زخمی جسم کو نرمی سے زمین پر لٹا دیا اور زرہ ہٹا کر وہ زخم دیکھنے لگا جس سے خون جاری تھا۔ اس کے ہاتھ نے خون کی گرمی محسوس کی، جس سے دھیمی دھیمی بھاپ نکل رہی تھی۔

''آقا! اس پر نزع کا عالم طاری ہے۔ یرماق نے عمر کے کان میں کہا۔ اس کے حلق سے جو آواز آرہی ہے سنو۔'' عمر کھڑا ہو گیا، اس نے اپنے خون آلود ہاتھ دیکھے۔ ہاتھوں اور زمین پر سورج کی تیز شعاعیں پڑ رہی تھیں اس نے دیکھا کہ رحیم کا چہرہ کپڑے کی طرح سفید تھا اور اب اس نے کراہنا بند کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک اس کے حلق سے خرخر کی آواز آتی رہی اور پھر وہ بھی بند ہو گئی۔

یرماق کسی جانور کی طرح غرایا۔ اس نے میان سے خنجر نکال لیا۔ غصے سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور پھر اس نے قیدی لڑکی پر حملہ کر دیا جو رحیم کے لمحات نزع میں ان کے قریب بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

یرماق نے عیسائی لڑکی پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جان کے بدلے جان''۔

لڑکی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ خنجر کے وار سے اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ وہ عمر کے قدموں میں گر پڑی، خوف کے مارے اس نے اپنی ٹانگیں ہاتھوں میں دبالی تھیں اور اس کا جسم لرز رہا تھا۔ وہ خاموش تھی اور بڑی درد بھری نظروں سے عمر کو تک رہی تھی۔

''تحمل رکھو بیوقوف!'' عمر نے ملازم سے کہا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔ یرماق زمین پر مردے کے مانند گر گیا اور سسک سسک کر کہنے لگا ''یا اللہ! یا اللہ!''

عمر نے رومی لڑکی کو خیمے میں جانے کے لئے کہا، لیکن وہ اس کی زبان نہ سمجھی۔ پھر

اس نے خیمے کی طرف اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئی اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ خیمے کے اندر چلی گئی۔ عمر دوسرے ملازم کی مدد سے رحیم کی لاش خیمے کے اندر لے گیا اور اسے قالین پر رکھ دیا۔ اس نے ایک کپڑے سے اپنے ہاتھ پونچھے اور نوکروں کو پانی لانے کا حکم دیا۔

اس پانی سے عمر اپنے رضاعی بھائی کا منہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر لڑکی نے قریب آ کر عمر کے ہاتھ سے کپڑا لے لیا اور خاموشی سے رحیم کے سر اور گلے سے مٹی صاف کرنے لگی۔ جیسے اسے یہ امید ہو کہ اس کی اس حرکت سے عمر خوش ہو گا۔ پھر اس نے لاش کے کپڑے ٹھیک کیے۔

عمر سوچ رہا تھا کہ اس کو بہت سے کام کرنے ہیں ایسا نہ ہو کہ رحیم کی تجہیز و تکفین میں کوئی کسر رہ جائے۔ اس روز رات کو ایک سفید ریش مولوی نے عمر سے مغموم انداز اور سنجیدہ آواز میں کہا ''میرے بیٹے زم زم کا متبرک پانی بھی زمین میں جذب ہو جاتا ہے انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ بے شک جان اس کی دی ہوئی ہے اور مومنوں کی پاک روحیں قیامت کے دن اسی کی طرف واپس ہو جائیں گی۔''

عمر کی نظروں میں رحیم کی صورت پھر رہی تھی۔ اس کا چہرہ، جو کیچڑ سے لت پت زمین پر کفنایا ہوا قبلہ رو پڑا تھا۔ اس کے بعد رحیم کو لحد کی آغوش میں اتار کر اس پر مٹی ڈال دی گئی۔ اس رات مولوی کو اور بھی مردے دفنانے تھے چنانچہ وہ چلا گیا اور عمر ایک پتھر پر بیٹھا رہا۔ یرماق وفادار کتے کی طرح عمر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ وہ آگے پیچھے ہل رہا تھا۔ اب جبکہ اس کا آقا دفن ہو چکا تھا یرماق مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن عمر کے لیے اس پتھر کو چھوڑ کر جانا اندوہناک تھا۔ اس پتھر کے قریب رحیم کو ہمیشہ لیٹے رہنا ہے۔ اس جگہ بارشیں ہوں گی، گھاس اگے گی، کھیتیاں بوئی اور کاٹی جائیں گی..... اور رحیم بے شمار برسوں تک جن کے گزرنے کے بعد قیامت کے دن روحیں پھر اپنے جسموں میں داخل ہوں گی غیر مرئی پردے کی آڑ میں منتظر پڑا رہے گا۔

ساری رات عمر اس پتھر پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ سحر کی سفیدی نمودار ہو گئی۔ پچھلے دو دن اور رات کی تھکن کے بعد عمر کو کچھ ذہنی سکون محسوس ہوا۔ اس نے آہستہ آہستہ سے زیر لب کہا۔ ''رحیم! جسم ایک عارضی مکان ہے جس میں انسان کی روح کچھ

دیر کے لئے رہتی ہے۔ جب یہ عارضی مکان گر جاتا ہے تو روح اپنے طویل سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔ رحیم اس سفر میں تجھ سے میری ملاقات ہو گی۔''

''امان!'' یرماق بولا۔

عمر خیمے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ چراغ جل رہا ہے۔ وہ چراغ کو تکنے لگا، یہاں تک کہ قیدی لڑکی جو ایک کونے میں پڑے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر پر سو رہی تھی اٹھی اور اس نے بوتل سے جام میں شراب انڈیلی۔

عمر کا جی چاہا کہ ہاتھ مار کر اس جام کو زمین پر گرا دے، لیکن اسے وہ رات یاد آ گئی جب نیشاپور کی سڑک والی سرائے میں وہ اور رحیم باتیں کر رہے تھے اور رحیم نے اسے شراب کا ایک جام پیش کیا تھا۔ عمر نے جام لے کر شراب پی لی۔ اس کے سرد جسم میں حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکی نے پھر جام بھرا اور عمر پھر پی گیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور کمبل پر لیٹ گیا تھکن کی وجہ سے اس پر جلدی ہی نیند طاری ہو گئی۔

قیدی لڑکی نے چراغ بجھا دیا اور اس کے قریب بیٹھ کر آسمان پر صبح کی سفیدی پھیلنے کا انتظار کرنے لگی..... جب روشنی نمودار ہوئی اور ہر چیز صاف نظر آنے لگی تو اس نے آئینہ اٹھا کر اپنے بالوں میں کنگھی کی اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر غور کرنے لگی۔

وادی کے نشیب میں بالآخر سلطان الپ ارسلان کا خیمہ نصب ہو گیا تھا۔ خیمے کے دروازے پر ترک امیروں کا ہجوم تھا۔ ان میں سے ہر شخص قالین پر بیٹھے ہوئے تین آدمیوں کو ایک نظر دیکھنے کا مشتاق تھا۔ جعفرک کو خاص مراعات حاصل تھیں ایک صندوق پر ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے وہ ان تینوں اشخاص کو دیکھ سکتا تھا جن میں ایک خود سلطان الپ ارسلان۔ دوسرا رومیوں کا شہنشاہ رومانوس دیوجانس اور تیسرا شخص وہ چھوٹا سا مسلمان غلام تھا جس نے میدان جنگ میں رومیوں کے شہنشاہ کو بے ہوش پڑا دیکھا اور اسے لا کر الپ ارسلان کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

لوگوں نے دیکھا کہ رومانوس کو جو ابھی تک زرہ پہنے تھا، سلطان کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا گیا۔ الپ ارسلان نے ایک بار اس مقید شہنشاہ کی گردن پر اپنا پاؤں رکھا اور پھر رومانوس کو اٹھا کر اپنے دائیں طرف قالین پر بٹھا لیا۔

لوگ مشرق اور مغرب کے ان دو حکمرانوں کے درمیان پہلی مرتبہ ہونے والی گفتگو سننے کو بے تاب تھے۔

الپ ارسلان نے اپنے معمولی لہجے میں کہا۔ ''اگر میں تیرے سامنے قید کر کے اس طرح لایا جاتا تو میرے ساتھ تو کیا سلوک کرتا؟''

رومانوس نے سر اٹھا کر سلطان کو دیکھا۔ مترجم نے اسے سلطان کا سوال بتایا تو ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ بولا۔

''میں تیرے ساتھ سختی سے پیش آتا''

سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔ تو اب مجھ سے کس سلوک کی توقع کرتا ہے۔

مقید شہنشاہ نے اپنے دشمنوں کے سنجیدہ چہروں کو دیکھا اور کہا ''ممکن ہے تو مجھے یہیں قتل کر دے۔ یا بیڑیاں پہنا کر مجھے اپنی سلطنت میں پھرائے یا مجھ سے تاوان جنگ قبول کر لے۔''

الپ ارسلان کو یہ عیسائی بادشاہ پسند آیا، جس میں جرات کی کمی نہ تھی۔ وہ اپنی فتح پر اور قیصر روم کی گردن پر پاؤں رکھنے کے بعد مسرت سے سرشار تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ بولا۔ ''جان لے کہ تیرے ساتھ جو سلوک ہونا چاہیے، میں نے اس کے متعلق فیصلہ کر لیا ہے۔''

شہزادہ جو اپنے باپ کے پیچھے بیٹھا تھا آگے کو جھکا۔ وہ اپنی مٹھیاں باندھے بیٹھا تھا، اسے وہ پیشین گوئی یاد تھی کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگی اور دونوں بادشاہ ختم ہو جائیں گے۔

الپ ارسلان نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تجھ سے تاوان جنگ لوں گا۔ تیری رعایا سے سالانہ خراج وصول کروں گا اور تجھے عزت کے ساتھ تیرے ملک پہنچاؤں گا۔''

شیر بچہ نے گہری سانس لی اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اگر رومانوس اسی جگہ جلاد کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تو نیشاپور کے ایک نوعمر طالب علم کی پیشین گوئی پوری ہو جاتی۔

عمر کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ جسمانی تھکن کے باوجود دیر تک اس کے ذہن کو سکون نہ ملا۔ جیسے ہی وہ آنکھیں بند کرتا، رحیم کا چہرہ، اور اس کی عجب مسکراہٹ، اس کے سامنے آ جاتی۔ رحیم کا جسم مرنے کے بعد ایک لکڑی کے صندوق کے مانند ہو گیا تھا جسے خیمہ کے فرش پر کبھی ایک جگہ رکھا گیا اور کبھی دوسری جگہ اور پھر اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔ عمر نے لاکھ کوشش کی لیکن رحیم کا جنازہ لے جانے اور سفید کفن کی تہوں میں اس کی لاش لپیٹنے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے سے نہ ہٹا۔

رحیم کی جگہ ملازموں کو احکام دینا عمر کے لیے آسان کام نہ تھا۔ جہاں تک اسے یاد تھا معمولی بھائیوں کی طرح نہیں بلکہ جڑواں بھائیوں کی طرح وہ دونوں ہر چیز میں حصے دار رہتے تھے پھر بھی کھانے، اور ملازموں اور گھوڑوں وغیرہ کا انتظام ہمیشہ رحیم کرتا تھا، لیکن اب قدرتی طور سے ملازمین عمر سے احکام پانے کی توقع رکھتے تھے۔

اب وقت آ گیا تھا کہ یہ لوگ نیشاپور واپس روانہ ہوں۔ ان پہاڑوں میں صرف سلجوق ترکوں کو ٹھہرنا تھا عرب سپاہی اور بے قاعدہ فوجیں تو مال غنیمت اور غلام لے کر واپس جا رہے تھے۔ کوچ کے لئے ملازموں نے خیمہ اکھاڑا تو عمر نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص کے پاس بڑے بڑے بورے ہیں جو ان کے سامان میں شامل نہیں تھے۔ جنگ کے آخری ایام میں یہ لوگ لوٹ مار اور ان چیزوں کو فروخت کرنے میں مصروف رہے تھے جن کی انہیں ضرورت نہ تھی اور اب وہ یہ دولت لے کر اپنے گھروں کو جانے کے لئے بالکل تیار تھے۔ لیکن ابراہیم کے بیٹے نے میدان جنگ سے ایک تلوار تک نہ لی تھی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہ لینا چاہتا تھا جو اسے جنگ کی یاد دلائے۔

یرماق نے رحیم کے ابلق گھوڑے پر زین کس دی تھی اور اسے اپنے مرحوم آقا کی زرہ اور اسلحہ کی جنہیں وہ اپنے زین پر لگایا کرتا تھا ایک گٹھڑی باندھ لی تھی۔ عمر نے

سیاہ گھوڑے کو دیکھا اور دل میں سوچا کہ تمام راستے اس گھوڑے کو خالی زین کے ساتھ وہ کس طرح لے جائے گا، دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ اس گھوڑے کو رحیم کے باپ کے پاس واپس پہنچایا جائے۔

یرماق نے کہا۔ ''آقا! یہ ٹھیک رہے گا کہ ہم اس رومی لڑکی کو گھوڑے پر سوار کر دیں۔ ہمارے پاس اس کے لئے سواری بھی نہیں ہے۔''

قیدی لڑکی رحیم کی ملکیت تھی، اس لیے اسے بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ اسے نیشاپور کے بازار میں اچھی قیمت پر فروخت کیا جا سکتا تھا، کیونکہ وہ نوجوان تھی اور اس کے بال ریشم کی طرح نرم و حسین تھے۔ عمر نے ان یونانی الفاظ کی مدد سے جو اس نے مکتب میں افلاطون کے مکالمات پڑھنے کے دوران میں سیکھے تھے اس لڑکی کے متعلق کچھ باتیں معلوم کر لی تھیں۔ اس کا نام زوئی تھا۔ دنیا میں اس کا اور کوئی نہ تھا، کیونکہ وہ قسطنطنیہ میں ہمیشہ سے کنیز کی زندگی گزارتی رہی تھی۔ اس جنگ میں وہ ایک عیسائی افسر کے ساتھ آئی تھی جس کا اپنے شہنشاہ کی طرح یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو کسی دشواری کے بغیر شکست دے کر مشرق کی جانب بھگا دیا جائے گا۔

عمر نے کہا ''ابلق گھوڑے پر میں سوار ہوں گا اور رومی لڑکی زوئی کو، میرا گھوڑا دے دو۔'' وہ لڑکی اب نقاب پہنے تھی اور عمر کے پیچھے بار بردار جانوروں کے ساتھ چل رہی تھی، لیکن سڑک پر جو شخص بھی ملتا، اس لڑکی کے لباس اور اس کے سنہرے بالوں سے یہ سمجھ جاتا کہ وہ عیسائی کنیز ہے اور اس خراسانی سپاہی کی ملکیت ہے جو خاموش اور تنہا اپنے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔

سرائے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اسے مجبوراً اپنا خیمہ اس کنوئیں کے قریب نصب کرنا پڑا، جہاں ایک بڑے لاؤ لشکر والا امیر، پہلے سے خیمہ زن تھا۔ ملازمین ہدایت کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔ عمر ہی کو انہیں یہ ہدایت دینا پڑی کہ گھوڑے کہاں باندھے جائیں اور یہ بھی کہ جو اور روٹی امیر کے ہمراہیوں سے خریدی جائے، عمر جان بوجھ کر خود کو مصروف رکھ رہا تھا، کیونکہ اس طرح اس کا دھیان بٹ گیا لیکن جب سب کام ہو چکا تو پھر رحیم کی یاد اسے ستانے لگی۔

وہ اپنے بستر پر بیٹھا جاگتا رہا۔ یہاں تک کہ انگیٹھی کی آگ بجھ کر راکھ ہو گئی۔

اسے وہ شراب کا جام یاد آ رہا تھا جسے پی کر جدائی کی صبح چند گھنٹوں کے لیے وہ سب کچھ بھول گیا تھا، لیکن تمام شراب ختم ہو چکی تھی صرف جام باقی تھا۔ عمر نے اطمینان کرنے کے لئے سامان کا تھیلا ٹٹولا۔ چاندی کا جام اس کے ہاتھ میں تھا وہ سوچ رہا تھا کہ رحیم نے زندگی کا جام اتنی جلدی خالی کر دیا اور اب وہ موت کی آغوش میں پہنچ گیا ہے۔

عمر کے قریب لیٹی ہوئی عیسائی لڑکی اپنے بستر میں کلبلائی اور اس نے ایک گہری سانس لی۔ عمر نے جھک کر اس کے چہرے سے سنہرے بال ہٹا دیئے زوئی کے بال تر تھے اور وہ نہ جانے کس وجہ سے رو رہی تھی۔

عمر نے نرمی سے پوچھا۔ ''ارے! کیا بات ہے؟'' زوئی نے لب ہلائے اور وہ مسکرائی۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی تھی۔ عمر کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ اپنے وطن سے دور اس طویل سفر کے دوران میں یہ لڑکی کس چیز کے متعلق سوچتی ہو گی۔ بات تو سلطان بھی رکھتا ہے اور غلام بھی۔ لیکن غلام کو شکایت کرنے کی اجازت کہاں!

زوئی کے ریشمی بال اس کے گلے سے لپٹ رہے تھے اور جب عمر نے ان پر ہاتھ پھیرا تو بال پھیل گئے۔ زوئی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ ایک طرف کو ذرا کھسک گئی جیسے عمر کے لیٹنے کے لیے جگہ کر رہی ہو۔ عمر لڑکی کے قریب لیٹ گیا، دیر تک وہ لیٹا ہوا خیمے کی چھت پر انگیٹھی کی اس روشنی کو تکتا رہا جو بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت اس کے ذہن سے جنگ کے میدان، رات کی اس ہوا اور رحیم کی عجب مسکراہٹ کا خیال محو نہیں ہو سکتا۔

اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی پھر کلبلائی جب اس نے اٹھ کر اپنے لمبے بالوں کو کندھے کے نیچے سے نکالا تو عمر کے ہونٹ اس کے گلے سے مس ہو گئے۔ لڑکی کے جسم کی حرارت اور اس کے بالوں کی خوشبو نے عمر کو کچھ سکون دیا اور پھر عمر نے محسوس کیا کہ اس کا جسم لڑکی کے بازوؤں کی گرفت میں ہے۔ زوئی کے جسم کی حرارت نے عمر کی تھکن دور کر دی اور اس پر ایک ایسا نشہ طاری کر دیا جو لڑکی کے جسم کی ہر جنبش سے تیز ہو رہا تھا۔ اس رات زوئی کے بازوؤں میں عمر موت کو بھی بھول گیا تھا اور جنگ کے میدان کو بھی۔ دنیا کی ہر شے سے بے خبر ہو کر وہ اطمینان کی نیند سویا۔

چوتھا باب:

استاد آئینۂ دانش

استاد علی کی عمر اب تقریباً ۷۳ سال تھی۔ استاد حافظ قرآن تھا لیکن اس کو ریاضی سے بھی عشق تھا۔ اس کے مکان میں ہر کام اسی پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ ہوتا تھا جس پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ مچھلیوں کے حوض کے قریب صحن میں گھڑیال سے پانی کے قطرے ٹپکتے تھے۔ شاگرد ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے ''اب استاد وضو کر رہا ہے۔'' ''اب ظہر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے'' یا وہ یہ کہتے کہ ''اب سہ پہر ہو گئی ، اب استاد اپنی کتاب کا مسودہ لکھے گا۔''

پانی کے گھڑیال کے مطابق پنجگانہ نماز، دو وقت کا کھانا، بارہ گھنٹے کا کام، استاد کے مکان میں اسی باقاعدگی سے عمل پذیر ہوتے تھے جس باقاعدگی کے ساتھ سیارے آسمان پر گردش کرتے ہیں۔ ہر کھانے پر ہمیشہ مقررہ غذا آتی۔ استاد علی سے جس کا لقب ''آئینہ دانش'' تھا۔ کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ تھی کہ نوجوان شاگردوں کی طبیعت کوئی اور چیز مثلاً کھجور، اخروٹ یا انار کھانے کو چاہتی ہے۔ چنانچہ یہ شاگرد کبھی کبھار چوری چھپے قریب کے کسانوں سے انار خرید لاتے اور مکان سے دور جا کر کھاتے تھے۔

استاد علی اپنی شاندار سنہری عبا پہنے ٹٹو پر سوار نیشاپور جایا کرتا، اپنے ساتھ وہ ایک چھتری اور حبشی غلام کو لے جاتا جو راستہ میں ٹٹو کو ہنکاتا تھا۔ استاد کا مکان نیشاپور

کے مضافاتی میدان کے جنوب میں اس جگہ واقع تھا جہاں مزروعہ علاقہ ختم ہو جاتا تھا۔ یہاں سے نمک زار کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ اس مکان میں استاد علی کو اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کے لیے پوری خلوت اور سکون حاصل تھا۔

استاد علی الجبر والمقابلہ پر ایک کتاب لکھا رہا تھا۔ اسے سلطان کے وزیر نے کئی سال ہوئے یہ کتاب لکھنے کا حکم دیا تھا۔ استاد کے شاگرد سہولت کے لیے اسے الجبرا کہتے تھے۔ ان لوگوں کا یہ کام تھا کہ استاد انہیں اپنی تشریحات املا کراتا، وہ اس کی خواہش کے مطابق تجربے کے طور پر سوال نکالتے اور اپنی معلومات کے لیے اسے جن دوسرے جوابوں کی ضرورت ہوتی انہیں تلاش کرتے۔ اس کام کے صلے میں استاد علی سہ پہر کو تین گھنٹے ان شاگردوں کو لیکچر دیتا اور انہیں دو وقت کھانا کھلاتا تھا۔

استاد کو اپنے آٹھوں شاگردوں کے نام اور ان کی دماغی کمزوریوں کا علم تھا، چونکہ وہ عقل مند آدمی تھا اس لیے یہ کوشش کرتا تھا کہ اپنی معلومات کا زیادہ سے زیادہ حصہ ان کے ذہن نشین کر دے، تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس سرزمین میں ریاضی کا علم فنا نہ ہو۔ اپنے آٹھ شاگردوں میں اسے عمر خیام کے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ عمر خیام کو اس کے پاس آئے صرف دس مہینے ہوئے تھے۔ استاد کا خیال تھا کہ عمر میں پیچیدہ مسائل حل کرنے کا قدرتی ملکہ ہے اور اس کا ذہن خطرناک حد تک زرخیز ہے۔

استاد علی کا کہنا تھا کہ ''ریاضی وہ دروازہ ہے جس سے گزر کر آپ نامعلوم سے معلوم تک پہنچ سکتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔''

یونانیوں کی کھوکھلی قیاس آرائیوں سے استاد کو اتنی ہی نفرت تھی جتنی ان قدیم مصریوں کے حساب سے محبت جنہوں نے سب سے پہلے اعداد سے کام لیا ہے۔ اس کی رائے میں مصریوں کی حساب دانی سے عالیشان عمارتوں کی تعمیر میں مدد ملی تھی۔

ایک دفعہ عمر خیام نے سوال کیا ''خواجہ امام! سیاروں کی گردش کا سراغ لگانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ حضور نبی کریم ﷺ کے طریق مبارک کے مطابق ہم چاند کی مدد سے مہینوں کا حساب لگاتے ہیں۔ سورج ہمیں روشنی پہنچاتا ہے۔ پھر ستاروں کا مطالعہ کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟''

استاد علی نے مفکرانہ انداز میں اپنا سر ہلایا۔ اسے نجومیوں کی پیشین گوئیوں پر اعتقاد نہ تھا، لیکن چونکہ سلطان اور دوسرے تمام امراء ان پر اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے وہ کسی مخالف رائے کا اظہار بھی نہ کرتا تھا۔ عمر خیام نے اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''محترم خواجہ کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ وہ سیارہ جسے یونانی عطارد کہتے ہیں پارے پر اثر ڈالتا ہے، سورج سے سونا اور اسی طرح چاند سے چاندی متاثر ہوتی ہے؟ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے۔''

استاد علی خاموش رہا۔ وہ ابھی عمر خیام کے بارے میں تشکیک رکھتا تھا۔ ممکن تھا کہ سلطان کا وزیر جو استاد علی کا سرپرست تھا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا استاد کا کافروں یا ساحروں سے تو کوئی تعلق نہیں ہے اس کے مکان میں اپنا کوئی جاسوس چھوڑ دے۔ اول تو عمر نیشاپور سے بھٹکتا ہوا تنہا اور پیدل اس کے پاس آیا تھا اور اس نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ریاضی کے فاضل استاد سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ پھر تعجب انگیز طور پر وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اس کا کوئی سرپرست نہیں ہے دوسرے یہ کہ بظاہر یہ نوجوان جس کا جسم سپاہیوں اور چوٹ کھائے ہوئے شیر کی طرح مستعد تھا استاد یا معلم بننے کے لیے نہیں پڑھنا چاہتا ہوگا۔ پھر کس وجہ سے اس نے نمک زار کے کنارے خود کو اس ویرانی میں مقید کرنا پسند کیا؟

عمر خیام کے سوال کا جواب اپنے ذہن میں سوچ کر اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''علامہ ابوریحان البیرونی نے اپنی فلکیات کی کتاب کے پہلے باب میں لکھا ہے کہ ستاروں کا علم ایک سائنس ہے اور واقعات، سیاسی کوائف اور شہروں، بادشاہزادوں اور عوام الناس کی قسمت میں تبدیلیوں کے متعلق پیشین گوئیاں کرنے میں اس سائنس سے خصوصی استفادہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تم پیشین گوئیاں کیے بغیر بھی ستاروں کے علم میں مہارت حاصل کر سکتے ہو، لیکن اس مہارت کے بغیر پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔''

عمر خیام نے اپنا سر اثبات میں اس طرح ہلایا گویا وہ استاد کے دانشمندانہ جواب کو سمجھ گیا۔ اب تک وہ استاد کی کتابوں میں کسی ایسے نسخے کی تلاش کرتا رہا تھا جس کی مدد سے وہ کیمیا بنا سکے، لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی تھی۔ عمر نے دبے الفاظ میں

کہا۔ ''المجسطی میں لکھا ہے کہ سونے پر سورج کا اثر ہونا واضح امر ہے، کیونکہ سورج کی اصل آگ ہے اور سونے کی ماہیت دریافت کرنے کا واحد ذریعہ بھی آگ ہی ہے۔ کاش ہم آگ کی روح کو مرکوز کر سکتے.....''

''کسی بھٹی میں'' دوسرے شاگرد نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

نسبتاً بڑی عمر کے ایک شاگرد نے سنجیدہ انداز میں کہا۔ ''دہکتی ہوئی بھٹی میں''

استاد علی نے جواب دیا۔ ''یہ امر کائناتی علم سے متعلق ہے جو فلکی اور ارضی اشیاء کی ماہیت سے بحث کرتا ہے۔ لیکن یہ علم ریاضی کے مانند ایک قطعی سائنس نہیں ہو سکتا۔ کون ایمان والا اس میں شبہ کرے گا کہ جب خدائے بزرگ و برتر نے آگ کو اور اس ہوا کو پیدا کیا جو پانی کو محیط ہے جس کے حلقے میں ہماری یہ بے حس و حرکت دنیا گھری ہوئی ہے تو اس نے وہ سونا بھی پیدا کیا جو زمین کے سینے میں پایا جاتا ہے؟ کون سچا ایمان رکھنے والا عقل سے اس قدر محروم ہوگا کہ اس چیز کو جسے اللہ نے پیدا کیا ہے خود پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

''درست ہے۔ درست ہے!'' شاگردوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

استاد علی نے یہ بات بڑے اعتماد سے کہی۔ وزیر کو بلکہ خود سلطان کو بھی یہ علم تھا کہ بہت سے جاہلوں کے اس دعوے کے باوجود کہ انہیں اس کا راز معلوم ہے۔ کوئی شخص گھٹیا چیزوں سے سونا نہیں بنا سکتا۔ استاد کنکھیوں سے عمر کو دیکھ رہا تھا جو بے توجہی سے استاد کی باتیں سن رہا تھا اور اپنی گود میں رکھے ہوئے ایک کاغذ پر کوئی شکل بنا رہا تھا۔ جب دوسرے شاگردوں اور استاد کے درمیان بحث ہوتی تو عمر اپنے کاغذوں پر لکھنے میں مصروف رہتا۔

پہلے تو استاد کا خیال تھا کہ عمر اپنی یادداشت کے لیے نوٹ لکھا کرتا ہے، لیکن اب اسے یہ شبہ ہو چلا تھا کہ عمر یہ نوٹ وزیر کو دکھانے کے لیے لکھتا ہے۔ عمر اپنے کاغذ صندل کے ایک صندوقچے میں بند کر کے اپنے بستر کے قریب رکھا کرتا تھا۔

استاد اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور عمر خیام کے پاس جا کر اس کے کاغذوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ کاغذ پر دو مکعب بنے ہوئے تھے، جنہیں بہت سے خطوط کاٹ

رہے تھے اور بہت سے ہندسے تحریر تھے۔

استاد نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

عمر نے فوراً جواب دیا۔ ''مکعب کی بنیادوں کا مسئلہ'' استاد علی کو یاد آیا کہ اس ہفتے خیام کے اس لڑکے کو اس نے مکعب کے اصول کے متعلق ایک شکل تعدیل حل کرنے کے لیے دی تھی۔

''تو نے اسے کہاں تک حل کیا؟'' استاد نے پوچھا۔

استاد علی کو یقین تھا کہ عمر اسے حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ یونانیوں نے اس کا حل معلوم کر لیا تھا، لیکن وہ خود اسے حل نہ کر سکا تھا۔ استاد نے دوسرے شاگردوں کو چھٹی دے دی اور عمر کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ جب استاد علی آرام سے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا تو اس نے عمر کے کاغذ کو آنکھوں کے قریب لے جا کر غور سے دیکھنا شروع کیا۔ استاد بولا ''بھئی میری سمجھ میں تو اس کا مطلب آتا نہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ تو نے مکعبوں کو انتہائی حد تک دو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور تو یونانیوں کے حل کو پہنچ گیا ہے۔''

''وہ اس حل پر کیسے پہنچے تھے؟'' عمر نے اشتیاق سے پوچھا۔

استاد نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا۔''

اسے یاد تھا کہ اس نے عمر کو اس تعدیل کا جواب نہیں بتایا تھا اور یہ کہ اس کے کاغذوں میں جو قریب پڑی ہوئی کرسی پر کلام پاک کے ساتھ رکھے ہیں تعدیل کا یہ مسئلہ اور اس کا جواب لکھا ہوا ہے۔ وہ ان کاغذوں کو کمرے سے باہر نہیں لے گیا تھا اور اس کی غیر حاضری میں کسی شاگرد کو کمرے میں گھسنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے ظاہر تھا کہ یا تو عمر نے یہ مسئلہ اپنی عجیب و غریب شکلوں اور خطوط کی مدد سے حل کیا ہے یا پھر چوری سے اس کے کاغذوں کو دیکھ کر اس حل کا پتا چلا لیا ہے۔

استاد نے کہا۔ ''مجھے تو صرف اتنا نظر آتا ہے کہ تو نے ان ٹھوس مربعوں کے اضلاع کے ذریعہ مکعب کے اصول کا پتا چلایا ہے۔ تو بتا کہ کس طریقے سے اس حل کو پہنچا؟''

''جواب تو موجود ہے'' عمر نے کاغذ پر جھکتے ہوئے کہا۔ ''اس ٹکڑے کو گھٹا دو پھر اسے اور اسے بھی۔ اسے جوڑ دو.....''

''استاد علی برہم ہو کر بولا۔ لیکن رب کعبہ کی قسم! یہ کافر یونانیوں کی اقلیدس کی قسم کی مساحت ہے۔ یہ الجبرا بالکل نہیں۔''

''نہ سہی ..... لیکن حل یہی ہے۔ اصولوں کے مسئلے کو میں الجبرے کی تعدیل میں حل نہیں کر سکتا تھا۔''

استاد علی نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا یہ الجبرے کی تعدیل نہیں تھی؟''

''یقیناً'' اور یہاں سے اسے الجبرے کے ہندسوں میں لکھا جا سکتا ہے۔

''دیکھئے اس طرح سے'' عمر نے استاد کے قریب سر جھکا کر مکعبوں کو بغور دیکھا اور ریاضی کی عام شکلیں اور خطوط کھینچتا چلا گیا۔ استاد علی نے شکلوں ہی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے اور اب وہ اسے اپنی کتاب میں شامل کر سکے گا۔

استاد کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خوارزمی جیسے استاد نے بھی اپنی کتاب میں یہ مسئلہ حل کرنے کی جرات نہیں کی تھی۔ وہ یہ سوچ کر پھولا نہ سماتا تھا کہ بغداد کے مدرسے کا استاد اس کامیابی پر کس طرح دانت پیسے گا!

''کیا تو نے اس طریقے سے دوسرے مسئلے بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے؟'' استاد نے جلدی سے پوچھا۔

عمر نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔ ''ہاں! اکثر۔''

''اور انہیں حل بھی کیا ہے؟''

''ہمیشہ تو نہیں..... لیکن عام طور پر۔''

''کیا تو مجھے ان کے عمل دکھائے گا؟'' استاد نے غیر متوقع طور پر عجز کے ساتھ کہا۔

عمر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''استاد میں نے آپ کا نمک کھایا ہے، آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے جو کام آپ نے زیادہ کیا، لیکن ان دوسرے مسئلوں کے حل میرے اپنے ہیں اور میں انہیں اپنے ہی پاس

رکھنا چاہتا ہوں۔"

استاد علی کی داڑھی کے بال سمٹ گئے اور ابرو سکڑ گئے۔ وہ بولا۔ "ابراہیم کے بیٹے! تو انہیں کس غرض سے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے؟"

"ابھی مجھے اس کا علم نہیں" عمر نے جواب دیا، وہ کھڑکی کے باہر خزاں زدہ باغ کو دیکھ رہا تھا، اسے یہ جواب دینے میں نہ کوئی شرمندگی محسوس ہوئی اور نہ تکلف۔

استاد علی کو اس جواب کی بالکل توقع نہ تھی۔ جوں جوں وہ سوچتا تھا اس کے دل میں عمر کے متعلق، شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ بوڑھے ریاضی دان نے کہا۔ "کیا ان مسئلوں کے حل تیرے اس صندوقچے میں رکھے ہیں جو مقفل ہے؟"

"جی ہاں!"

"لیکن میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا، اور میرے کاغذوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے دیکھا نہ جا سکے، بلکہ اس مسئلے کا یونانیوں نے جو حل کیا تھا وہ بھی تیرے پاس فرش پر پڑا ہے۔"

عمر نے نہ تو اس میز کی طرف دیکھا جس پر قرآن شریف اور اس تعدیل کا حل واقعی رکھا تھا اور نہ اپنے چہرے سے کسی تعجب کا اظہار کیا۔ اگر وہ جاسوس ہوتا تو استاد علی کے کمرے کی تلاشی لے سکتا تھا۔

اپنے نوجوان شاگرد کو رخصت کرنے کے بعد استاد علی گھنٹوں مکعب کے مسئلے کو حل کرنے میں لگا رہا۔ شاگردوں کو تعجب ہو رہا تھا کہ اس انہماک میں وہ سہ پہر کا درس دینا بھی بھول گیا۔ عمر کی طرح وہ دوسرا مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں تھا، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اس کا تربیت یافتہ ذہن اقلیدس سے الجبرے کا کام نہ لے سکا..... اس کا دماغ ٹھوس شکلوں پر غور کرنے سے قاصر تھا۔

وہ سوچنے لگا؟ "بوعلی سینا اسے نہ کر سکا لیکن یہ نوجوان.....؟"

یہ ایک مبہم سا خیال تھا۔ الجبرا جس کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی ان مسائل کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوا تھا جنہیں صرف حساب کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس لیے اگر یونانیوں کی یہ بے ہودہ اقلیدس بھی اس

طرح وہ مسئلے حل کر دے جو الجبرے کے دائرے سے باہر ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر ہندسوں پر انتہائی حد تک بحث کرنے کے لئے اقلیدس کے سہ اطرافی علم سے ماورا کوئی ایسا فن پیدا ہو جائے جس کا ابھی قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تو کیا ہو؟ استاد علی نے بیزار ہو کر اپنا قلم اور کاغذ پھینک دیا۔

اس نے سہ پہر ضائع کر دی تھی۔ یہ تمام قیاس آرائیاں لغو تھیں، ان کا ریاضی کے قطعی علم سے کوئی تعلق نہیں۔ استاد نے اپنے دل میں یہ نتیجہ نکالا کہ عمر اس کے کمرے میں گھس گیا ہوگا اور اس نے یہ حل وہاں سے حاصل کر کے اس کی مدد سے یہ چھوٹے مکعب بنائے ہیں۔ غالباً اس کے علاوہ عمر کے صندوقچے میں کوئی حل نہ ہوگا۔ شاید وہ جاسوس ہے اور اپنی رپورٹیں صندوقچے میں چھپا کر رکھتا ہے تاکہ انہیں اپنے ساتھ نیشا پور لے جائے یا کسی اور ذریعے سے وہاں بھیج دے۔

استاد علی نے اپنے دل میں یہ نتیجہ نکال کر عمر کا حل علیحدہ رکھ دیا۔ کھڑکی سے گھڑیال کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک آہ بھری کیونکہ گھڑیال میں یہ دیکھ کر اسے ملال ہوا کہ مغرب کی نماز میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔ وہ جلدی سے حوض پر گیا اور وضو کرنے لگا۔

ایک ہفتے بعد بوڑھے ریاضی دان کو ایک بار پھر عمر خیام کی موجودگی سے پریشان ہونا پڑا۔

اس روز سہ پہر کے وقت استاد علی کے مکان پر ایک سوار پہنچا۔ اس سوار کے ہمراہ تقریباً ایک درجن پیادے تھے۔ فوراً فراش نے دروازے سے مکان کے اندرونی دروازے تک ایک قالین بچھا دیا اور ایک غلام نے جلدی سے اندر جا کر یہ بتایا کہ توتوش استاد علی سے ملاقات کرنے آیا ہے۔

ساتھ ہی توتوش مکان میں داخل ہوا۔ توتوش کا جسم گول اور موٹا تھا، وہ ریشمی لباس پہنے تھا، اس کے سر پر ایک نیلا عمامہ اور اس کے آواز میں عجب اتار چڑھاؤ تھا۔ وہ اپنے غلاموں کو ضروری ہدایات دے چکا تو استاد علی کے غلاموں سے بار باران کے آقا کی خیریت پوچھنے لگا اور جب استاد علی اپنی بہترین سیاہ عبا پہنے باہر آیا تو، توتوش اسے

دیکھتے ہی مسرت سے چیخ اٹھا اور علی کو اپنے چھوٹے چھوٹے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''رب کائنات کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے کہ نامور استاد آئینہ دانش کی صحت برقرار ہے! خدا کرے یہ آئینہ سینکڑوں سال تک چمکتا اور ہم جاہلوں کو اس عہد اور اس صدی کے دانشمندانہ خیالات دکھاتا رہے!'' جواب میں استاد علی نے مناسب حال عاجزی دکھائی لیکن توتوش نے اس کی ہر عاجزی کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں استاد! تمام نیشاپور جانتا ہے کہ استاد کا درجہ خوارزمی اور بغداد کے اس احمق استاد سے بلند ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسے استاد علی سے زیادہ علم حاصل نہیں تھا؟ نہیں! ہرگز نہیں!''

توتوش اور استاد علی مہمان خانے میں قالین پر بیٹھے شربت پی رہے تھے۔ ان کے سامنے تازہ پھل رکھے تھے۔ استاد علی توتوش کی چرب زبانی کے آگے گونگا سا معلوم ہوتا تھا۔ اول تو وہ توتوش کو بولنے سے روک نہیں سکتا تھا دوسرے توتوش کے متعلق اسے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ اس وزیر کا ایجنٹ ہے جو استاد علی کا سرپرست تھا۔ نیشاپور میں یہ مشہور تھا کہ توتوش فیروزہ، نازک چینی کے برتن اور قیمتی قلمی نسخے جمع کرتا ہے لیکن توتوش نہ کوئی خطاب قبول کرتا تھا اور نہ کسی کو یہ معلوم تھا کہ وہ رہتا کہاں ہے؟

استاد علی اور توتوش ایک گھنٹے تک استاد کی زیر تصنیف کتاب کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ اس کے بعد توتوش نے عمر خیام نامی طالب علم سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ استاد علی کے کان کھڑے ہو گئے۔ جب عمر باغیچے سے کمرے میں آکر قالین کے ایک کونے پر بیٹھ گیا تو استاد ان دونوں کو کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ عمر نہایت تمیز کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں میں رکھے قالین پر دوزانو بیٹھا تھا۔

عمر کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے کہا ''پچھلے ماہ ہمیں مغرب سے یہ خبر ملی تھی کہ عیسائیوں کے بادشاہ رومانوس دیو جانس کو اس کی رعایا نے گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی اور وہ اسی صدمے سے مر گیا ہے۔''

یہ سن کر عمر مغموم ہو گیا، اسے وہ جنگ اور اپنے رضاعی بھائی رحیم کی موت یاد

آ گئی۔

توتوش نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تعجب ہوتا ہے، ہمارے آقا سلطان الپ ارسلان کا سایہ خدا ہمیشہ قائم رکھے، اس نے اس بادشاہ کی جان بخشی کر دی تھی..... لیکن پھر اسے خود اسی کی رعایا نے قتل کر دیا۔ اس بات کا کسے اندازہ ہو سکتا تھا؟''

یہ کہہ کر اس نے عمر کی طرف دیکھا۔

''کسی کو نہیں'' عمر نے جواب دیا،

عمر کو بزرگوں کی اس مجلس سے رخصت کی اجازت مل گئی تو توتوش کی زبان پہلی مرتبہ بولنے سے رکی۔ وہ ہاتھی دانت کی اس تسبیح سے جو اس کے گلے میں پڑی تھی اس انداز میں کھیل رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہے.....

پھر توتوش نے جیسے چونک کر کہا۔ ''کیا تم پیشین گوئی کے علم پر اعتقاد رکھتے ہو؟ کیا آئندہ کا حال بتانا ممکن ہے؟''

لیکن استاد علی کسی ایسی بحث میں نہیں الجھ سکتا تھا اور وہ بھی اپنے طاقتور سرپرست کے خفیہ ایجنٹ کے ساتھ۔

وہ بولا۔ ''واللہ! اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں آئندہ اس تو اپنی کتاب کی تکمیل میں منہمک ہوں۔''

توتوش نے منہ ہی منہ میں استاد کے جواب سے اتفاق رائے کا اظہار کیا اور پھر پوچھا۔ ''فرض کرو ایک شخص تین پیش گوئیاں کرتا ہے تو اے آئینہ دانش! کیا یہ ممکن ہے کہ اس کی تینوں پیشین گوئیاں محض اتفاق سے صحیح ثابت ہو جائیں؟''

اس سوال نے بوڑھے استاد کی فطری صلاحیتوں کو جگا دیا ہو بولا۔ ''دو پیشین گوئیاں تو اتفاق سے صحیح ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن تینوں ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ لیکن کون جوتشی اتنا بیوقوف ہوگا کہ بیک وقت تین باتوں کی پیشین گوئی کرے؟''

''ارے! خود تمہارے شاگردوں میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو زائچہ بنانے کا ماہر ہے اور وہ یہی نوجوان طالب علم ہے جس سے میں ابھی ابھی باتیں کر رہا تھا۔''

استاد علی کی داڑھی کے بال ایسے ہلنے لگے، جیسے وہ مسکرا رہا ہو، اس نے

حیرت سے کہا۔ ''عمر؟ کم از کم اس چیز کی تو مجھے اس سے بالکل توقع نہیں ہے۔''

''واللہ! پھر وہ کیا کرتا ہے؟''

''معزز مہمان! وہ مکعب کی تعدیلوں کو اتنی ہی آسانی سے حل کرتا ہے، جتنی آسانی سے آپ اپنی ریشمی دھاگے کی تسبیح پر دانے گنتے ہیں۔''

''اوہو! تو پھر اسے ایک کام میں مہارت حاصل ہے۔ فرصت کے اوقات میں وہ کیا کرتا ہے؟''

''وہ میری سب کتابیں پڑھا کرتا ہے، ریگستان میں تنہا گھوما کرتا ہے۔ انار کھاتا، چوسر کھیلتا اور بہت کم بولتا ہے اور کچھ ایسے سوال بھی حل کرتا ہے جنہیں وہ ایک صندوقچے میں چھپا کر رکھتا ہے'' یہ آخری جملہ کہتے وقت استاد علی کے لہجے سے کچھ عداوت ٹپک رہی تھی۔

''کوئی نوجوان ریگستان میں کیوں مارا مارا پھرے؟ واللہ! اے آئینہ دانش، معمر ہو جانے کی وجہ سے ہمارے ولولے سرد پڑ گئے ہیں، لیکن نوجوانوں کے خون میں حرارت ہوتی ہے۔ غالباً آپ کے اس شاگرد کو ریگستان کی ویرانی میں کوئی حسین محبوبہ مل گئی ہے۔''

استاد علی نے متعجب ہو کر کہا ''یہاں تو کوئی عورت نہیں، سوائے ان بدصورت دھوبنوں کے، جن کے بدن پر جوئیں سرسراتی رہتی ہیں۔''

تو توش نے منہ بنایا۔ وہ کہنے لگا۔ ''عجیب طالب علم ہے جو اتنا لائق اور پھر اتنا خاموش ہے۔ لیکن اس کی قابلیت خداداد ہے یا ممکن ہے وہ شیطانی قوت رکھتا ہے۔ صرف اس عالم الغیب ہی کو علم ہو سکتا ہے کہ آیا یہاں کوئی شخص چھپ کر سفلی عمل کرتا ہے۔ استاد! کیا تم خیمہ ساز کے اس لڑکے کی قابلیت کی پوری جانچ کرو گے اور پھر اس کے متعلق اپنی رائے کاغذ پر لکھ کر اسے ایک لفافے میں سربمہر کر کے ایک ماہ کے اندر اسی کے ہاتھ میرے پاس بھجوا دو گے تاکہ وہ جمعے کی شام یہ لفافہ مجھے نیشاپور کے باب طاقین پر پہنچا دے۔ اچھا اب ..... تو توش نے گہری سانس لی اور مسکراتا ہوا اٹھا پھر بولا۔ ''اب میں، جسے علم کی تلاش ہے، آپ کے مکان سے، جو علم کا گھر ہے، جاتا ہوں۔

افسوس کہ میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے۔''

تو توش کے جانے کے بعد استاد کچھ دیر بہت پریشان رہا۔ وہ حیران تھا کہ اسے عمر کی نگرانی کے لیے کہا گیا ہے حالانکہ اسے شبہ تھا کہ عمر خود اس کی نگرانی پر مامور ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ اسے عمر کے متعلق اپنی رائے لکھنے کی تاکید کی گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس کی نگاہوں کے سامنے ہی دونوں نے آپس میں کوئی خفیہ بات چیت تو نہیں کی۔ پھر وہ اس بات پر تعجب کر رہا تھا کہ عمر کو نیشاپور کیوں بلایا گیا ہے۔ استاد علی کو ہر بات میں تشکیک محسوس ہو رہی تھی۔

استاد علی عمر کا راز معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہوا ایک ماہ گذر گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عمر خیام الجبرے کے عام مسائل پر کیوں توجہ نہیں کرتا اور نئے مسائل حل کرنے کا کیوں متمنی رہتا ہے۔ یقیناً اسے کسی روحانی طاقت کی تائید حاصل نہیں ہے عمرانی مسائل کو خود اپنے ریاضی کے ضابطوں کی مدد سے حل کرتا ہے۔ بات تو یہی تھی۔ لیکن اسے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ استاد کو عمر پر تعجب کے ساتھ ساتھ حسد بھی ہونے لگا۔

اسی شام استاد علی نے عمر سے کچھ باتیں تسلیم کرانے کی کوشش کی، جیسا کہ وہ اس سے قبل مکعبوں کے معاملے میں کر چکا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔ ''عمر تو نظام الملک کے پاس کب واپس جائے گا؟''

نظام الملک سلطان الپ ارسلان کا وزیر اعظم تھا ملک میں اس کا طوطی بولتا تھا اور وہ استاد علی اور تو توش کا بھی سرپرست تھا۔

''نظام الملک کے پاس۔'' عمر نے تعجب سے جواب دیا۔ ''میں نے تو اسے کبھی دیکھا تک نہیں۔''

''پھر خدا کے لیے بتا کہ تو یہاں کس لیے آیا ہے؟''

جواب میں عمر نے کہا کہ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد میں اپنے رضاعی بھائی رحیم کے یہاں رہنے لگا تھا، لیکن جب میں میدان جنگ سے واپس آیا تو رحیم کے گھر والوں نے مجھے منحوس شخص قرار دیا جیسے رحیم کے مرنے کے بعد مجھے ان کے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں رہا۔ انہوں نے زوئی کو بھی مجھ سے لے لیا

تا کہ غلاموں کے بازار میں اسے فروخت کر دیں۔ اس کے بعد میرے لیے نیشاپور کی گلیوں میں جہاں میں نے رحیم کے ساتھ مسرت کے دن گزارے تھے آوارہ پھرنا ممکن نہیں رہا، چنانچہ میں آپ کے یہاں اس امید پر تعلیم حاصل کرنے چلا آیا ہوں۔ کہ ایک نئے کام میں لگ جاؤں گا۔

استاد علی نے کہا۔ ''اور وہ کام کون سا ہے؟ تو مکتب سے کون سا علم حاصل کر کے عرصہ حیات میں داخل ہو گا؟ لیکن پہلے تو اس بات پر غور کر کہ اس عالم سفلی میں عقل و دانش کیسے آئی دنیا کو عقل و دانش پیمبروں نے سکھائی ہے جنہوں خود کبھی تعلیم نہیں پائی، لیکن انہیں عالم باطن کے متعلق علم لدنی حاصل تھا عقل کی روشنی پھیلانے والوں میں سب سے پہلے پیمبروں کا درجہ ہے اور ان کے بعد فلسفیوں کا۔ وہ پیمبروں کی تعلیمات کا مطالعہ اور اس کے بعد دوسرے علوم کا اکتساب کر کے عوام الناس کو وہ باتیں سمجھاتے ہیں جن تک ان کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔

''ممتاز پیمبروں میں زمانے کے لحاظ سے پہلے حضرت موسیٰؑ ہوئے دوسرے حضرت عیسیٰؑ اور تیسرے پیغمبر جناب محمد علیہ التحیۃ والسلیم۔ یہ امر یقینی طور پر معلوم ہے لیکن جہاں تک فلسفیوں کا تعلق ہے لوگوں میں اختلاف رائے ہے۔ افسوس کہ میری معلومات کم ہیں اور میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پہلے افلاطون اور ارسطو اور پھر ہمارے استاد بوعلی سینا نے ہمارے تاریک ذہنوں کو عقل کی جلا دی۔''

''فلسفیوں کے بعد شاعروں کا درجہ ہے۔ شاعر کا فن خطرناک ہوتا ہے، کیونکہ شاعر کا کام تخیل انسانی کو بیدار کرنا اور بڑی چیز کو حقیر اور حقیر چیز کو بڑا بنا کر پیش کرنا ہے غصے اور محبت، مسرت اور نفرت کے جذبات کو بھڑکا کر وہ اس دنیا میں بڑے سے بڑے اور حقیر سے حقیر کام کرا لیتا ہے۔''

''چونکہ وہ تخیل کو مہمیز کرتا ہے اور عقل کو روشن نہیں کر سکتا، اس لیے شاعر کا فن فلسفی کے علم سے پست ہوتا ہے۔ آج تک ایسا کون شاعر گزرا ہے، جس کے کلام نے کسی مغنی کے فن کو حیات جاوید بخشی ہو۔''

''ریاضی داں کی محنت کبھی اکارت نہیں گئی۔ روشن حقیقت تک صرف وہی

پہنچتا ہے اور نامعلوم سے معلوم تک پہنچنے والے واحد راستے کو وہی دریافت کرتا ہے۔ الجبرا ریاضی کی بلند ترین شاخ ہے اور مجھے امید ہے کہ تو الجبرا کی تیسرے درجے کی تعدیلوں کو حل کرنے میں اپنی لیاقت کام میں لائے گا۔''

بوڑھے استاد کے الفاظ نے عمر پر بہت اثر کیا وہ اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ ''میرا مطلب ..... یہ ہے کہ اور بھی مسائل موجود ہیں، کاش ہماری عقل انہیں حل کر سکتی۔ کاش ہم ستاروں کی گردش کے راستے ناپ سکتے.....''

''ستاروں کے راستے؟ لیکن یہ تو فلکیات کا کام ہے جس کا مقصد انسان کے معاملات پر سیاروں کے اثرات متعین کرنا ہے۔''

''پھر بھی مسائل یکساں ہیں۔'' عمر نے کہا

''عمر کیا تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ میری کتب کے مسائل شاہی منجم کے مسائل کی مانند ہیں؟ یہ احمقانہ بات ہے..... یہ بات سن کر مجھے افسوس ہوا.....''

''لیکن حقیقت تک رسائی ہو جائے تو ایک کے مسئلے کی حقیقت دوسرے کے مسئلے کی حقیقت سے مختلف نہیں ہے۔''

ایک آہ بھر کر استاد علی نے کہا۔ ''بیٹے! ایسی فضول خواہشوں کے لیے بہت کم عمر ہے، وقت آنے پر تجھے خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ایک فن جس حقیقت کا اظہار کرتا ہے وہ دوسرے فن کی حقیقت سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر سلطان کا نجومی اپنی کوششوں کو ریاضی کی حقیقت تک محدود رکھتا تو.....'' استاد علی کی داڑھی میں جیسے ارتعاش آ گیا، اس کی آواز بھرا کر حلق میں پھنس گئی لیکن فوراً ہی وہ اپنی اس فروگذاشت پر نادم ہو گیا اور سنجیدگی سے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمارے دماغ مختلف راہوں پر چل رہے ہیں۔ میری خواہش تھی..... کہ میں ریاضی کے ذریعے حقیقت کا مطالعہ کرنے میں تجھے مدد دیتا۔ نامعلوم سے معلوم تک پہنچنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اچھا کل میں تجھے ایک خط دوں گا۔ اسے تو نیشاپور لے جانا، ممکن ہے وہاں تجھے کوئی سرپرست مل جائے۔ خدا کرے تیرا سفر خوشگوار گزرے!''

عمر بوڑھے استاد کو بہت سی باتیں بتانا چاہتا تھا، لیکن اس کی قوت گویائی

جیسے سلب ہوگئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس پر ایک اور دروازہ بند ہوگیا۔ وہ استاد کے کمرے سے خاموشی کے ساتھ نکل گیا۔

عمر چلا گیا تو استاد علی نے قلم لیا اور ایک قیمتی سفید کاغذ پر لکھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ میرا شاگرد عمر خیام لیاقت میں بغداد کے استاد کے برابر پہنچ چکا ہے۔ اس کے پاس وہ راز ہے جس کی مدد سے وہ تمام مسائل حل کر لیتا ہے، لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ وہ راز کیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس راز سے کیا کام لے گا، کیونکہ وہ ابھی تک اپنے تخیلات کا غلام ہے۔'' میں دعا کرتا ہوں کہ اس کا یہ علم جو اس نے میرے گھر حاصل کیا ہے میرے اس سرپرست اور مربی کو پسند آئے جس کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ وہ اس نالائق علی سے زیادہ وفادار غلام نہیں رکھتا۔''

جب تحریر کی روشنائی خشک ہوگئی تو استاد علی نے کاغذ کو تہ کیا اور تہوں پر پگھلا ہوا موم لگا کر اپنی مہر لگا دی اور اس خط پر ''آقائے تو توش، باب طاقین، نیشاپور، کا پتہ لکھ دیا۔

پانچواں باب:

باب طاقین

جمعہ کے دن مغرب کی نماز سے پہلے باب طاقین اور مسجد ابنائے حسین کے درمیان شیرینی فروشوں کی گلی میں عمر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سیخ تھی جو ابھی ابھی آگ پر سے اتاری گئی تھی۔ اس گرم سیخ سے عمر بھیڑ کے کباب اور لہسن کے ٹکڑے نوچتا اور اپنے گھٹنے پر رکھی ہوئی روٹی کے لقموں کے ساتھ چٹخارے لے لے کر کھا رہا تھا۔ اسے بہت بھوک لگی تھی کیونکہ وہ استاد علی کے گھر سے صبح ہی چل پڑا تھا اور راستے میں کہیں نہ ٹھہرا تھا۔ بیشتر مسافت اس نے ایک گدھے پر طے کی تھی جو نمک کی بوریاں لانے والے اونٹوں کے ایک قافلے کے ساتھ آ رہا تھا۔ اونٹ والوں سے باتیں کرنے اور ان کے گیت سننے میں عمر کو دھوپ کی تیزی بھی زیادہ محسوس نہ ہوئی اور راستہ اچھا کٹ گیا۔

گلی میں بیٹھا، وہ ان آخری مسافروں کو دیکھ رہا تھا جو میدان طے کر کے نیشاپور میں باب طاقین سے داخل ہو رہے تھے..... کھٹ پٹ دوڑتے ہوئے کچھ گدھے، دو درویش اور اس کے پیچھے ایک لاوارث بھیڑ۔ کمہاروں کے چاک کے لیے چکنی مٹی سے لبالب بھری، چرخ چوں بولتی ہوئی ایک گاڑی اور ان کے بعد گھوڑوں کی شاندار قطاریں جن کی پیٹھ پر بھاری بوجھ لدا تھا اور جو چلتے ہوئے ایک ساتھ سر ہلاتے تھے۔

کباب والے نے عمر سے کہا ''یہ سمرقند سے آرہے ہیں۔ آج کل سمرقند کی شاہراہ سے آنے والے مسافروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔''

''اور وہ کیا لاتے ہیں؟'' عمر نے پوچھا۔

''خدا جانتا ہے بہت کچھ! ہاتھی دانت، ریشمی دھاگا، مشک، بلور، پیتل اور ریوند چینی، غرض کوئی ایسی چیز نہیں جو ان کے ساتھ نہ آتی ہو۔''

''لیکن ایسے کباب نہیں جیسے یہ ہیں'' عمر نے مسکرا کر کہا اور خالی سیخ دکان دار کو واپس کر دی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ''ماشاء اللہ ہماری بھیڑیں خوب فربہ ہوتی ہیں۔''

کباب والا عمر کا یہ جملہ سن کر بہت خوش ہوا اس نے قریب کھڑے ہوئے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا۔ ''ابے نالائق! اونگھ رہا ہے، صاحب کو پانی پیش کر۔''

ان کے قریب ایک لڑکا اپنے کاندھے پر پیتل کا ایک بڑا سا برتن لادے کھڑا تھا۔ لیکن اس کی توجہ پھل والے کی دکان کے سامنے کھڑے ایک قصہ گو کی طرف تھی جو کہانی سنا رہا تھا۔ اس نے چونک کر برتن سے پانی بھر کر عمر کو دیا۔ عمر نے صورت حال سے محظوظ ہوتے ہوئے پانی پیا۔ پیالے میں دوبارہ پانی لے کر ہاتھ دھوئے اور لڑکے کے دیئے ہوئے تولیے سے ہاتھ پونچھے۔

''اللہ کے نام پر'' لڑکے نے آہستہ سے کہا اور عمر نے اس کے ہاتھ پر ایک سکہ رکھ دیا۔ ادھر کباب والا بڑبڑایا یہ سقے بڑے لالچی ہیں دام لیے بغیر کسی پیاسے کو پانی نہیں پلاتے۔

''اور بھوکے کو کھلانے کے متعلق کیا خیال ہے؟''۔ عمر نے مسکرا کر پوچھا۔

کباب والا خفیف ہو کر بولا۔ ''جناب! مجھے کوئی ایسا شخص بتا دیجئے جو مجھے ایک بھیڑ مفت دے اور پھر جلانے کے لئے کوئلہ، سیخ گھمانے کے لیے چھوکرا بھی مفت مل جائے تو میں بڑی خوشی سے مفت کباب بانٹوں'' کباب والے نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور پھر بولا۔ ''لیکن غالباً آپ زائر ہیں اور مشہد مقدس کی زیارت کو جا رہے ہیں۔ پھر وہ عمر کے دیئے ہوئے تین پیسوں کو گننے لگا۔ اسے یہ نوجوان طالب علم انداز اور

مزاج کے لحاظ سے عرب معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے جسم پر اونٹ کے بالوں کی صرف ایک عبا اور ایک خرجی تھی.....

عمر نے کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔''

بس وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہ بھی اسی ہجوم میں شامل ہے جو شیرینی فروشوں کی گلی سے گزر کر قریبی مسجد کو جا رہا ہے، جمعے کا دن تھا اور بہت سے لوگ مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے تھے۔

شام ڈھل رہی تھی۔ لنگوٹیاں باندھے کچھ نوخیز لڑکے مشکوں سے گلی میں چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ راہگیروں کے چلنے سے شور ہو رہا تھا، لیکن اندھے قصہ گو کی بلند آواز اس شور میں بھی سنائی دے رہی تھی..... وہ ان عاشقوں کا حال بیان کر رہا تھا جو ایک دوسرے سے جدا کر دیئے گئے تھے۔

سامنے سے ایک نازک اندام لڑکی گزری اس کی چال اور آہستہ ہو گئی۔ نقاب کے اوپر سے اس نے لڑکی کی سرمگیں آنکھوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے اور وہ سنہری زلف جو نقاب سے باہر چمک رہی تھی عمر کو جانی پہچانی سی لگی۔ اسے زوئی کا خیال آنے لگا۔ وہ اپنے کاغذ اور کتابیں ہاتھ میں لے کر فوراً کھڑا ہو گیا اور اس لڑکی کے پیچھے چل دیا، جس نے اسے مڑ کر دیکھا تھا۔

کباب فروش نے اطمینان کی سانس لی اور پیسے اپنی صندوقچی میں ڈال دیئے۔ ''وہ زائر نہیں معلوم ہوتا'' دکان دار بڑبڑایا اور پھر چیخنے لگا'' آؤ! کسے بھوک لگی ہے۔ کون عمدہ گوشت کھانا چاہتا ہے۔ آؤ! کباب کھاؤ! ان میں نہ ہڈیاں ہیں اور نہ یہ ہاسی ہیں!''

دور مسجد کے مینار سے مؤذن کی آواز آرہی تھی۔

حی علی الصلواۃ. حی علی الصلوۃ..... لا الہ الا اللہ

قیام، رکوع اور سجود عمر نماز کے مقررہ ارکان ادا کر رہا تھا۔ اوپر لٹکے ہوئے فانوسوں سے روشنی آرہی تھی اور نمازیوں کی آواز سے مسجد میں عجیب سی گونج پیدا ہو رہی تھی اس کے قریب صف میں کھڑے ہوئے نمازیوں کے کپڑے سرسراتے جاتے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر عمر دوسرے نمازیوں کے ساتھ مسجد سے باہر نکلنے لگا تو اس کی نگاہیں عورتوں کی ٹولی پر پڑیں۔

نیلے نقاب والی لڑکی ان عورتوں کے پیچھے چل رہی تھی اور ایک موٹا سا نوکر اس کے ساتھ تھا۔ صحن میں جا کر اس نے اپنے جوتے اس طرح جلدی سے باندھے کہ چند قدم چلنے کے بعد ان میں سے ایک گر گیا۔

وہ پیچھے مُڑ کر آئی اور عمر کے بالکل قریب جھک کر اپنا جوتا اٹھانے لگی۔ راہگیروں کے قدموں کی آواز کے شور میں اس نے لڑکی کو آہستہ سے یہ کہتے سنا ''ابراہیم کے بیٹے! میری سالگرہ پر گلاب کے پھول نہیں تھے۔''

عمر جواب نہ دینے پایا تھا کہ لڑکی چل دی اور پھر بڑی شان سے نگاہیں نیچی کیے ملازم کے ہمراہ آگے بڑھ گئی۔ عمر کو یاد آیا کہ آج سے تین سال پہلے یاسمین نام کی ایک لڑکی کو اس نے گلاب کے پھول بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

جب وہ شیرینی فروشوں کی گلی سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ باب طاقیں بند ہو چکا ہے اور چند ترک نیزہ باز وہاں پہرا دے رہے ہیں۔ تاریکی گہری ہو رہی تھی اور دکان دار اپنی دکانوں میں چراغ جلا رہے تھے۔

''خدا کی پناہ! خیام زیادہ جلدی نہ کرو!''

ایک پستہ قد اور موٹے شخص نے کہا جو چمکدار اور زعفرانی رنگ کی ریشمی عبا پہنے ایک خوبصورت ٹٹو پر سوار اس کی طرف آ رہا تھا؟ عمر نے پہچان لیا کہ وہ توتوش ہے۔ اس نے جیب سے استاد علی کا خط نکال کر اسے دیا۔ موٹے توتوش نے فوراً خط کھولا اور ایک چراغ کے قریب جھک کر اسے پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے بعد خط کو تہ کر کے اس نے اپنی جیب میں رکھا اور عمر کی ایک نقرئی درہم دیا معلوم نہیں توتوش اس خط سے خوش ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن استاد علی نے عمر کو کنایتاً یہ بتایا تھا کہ توتوش اس کا دوست بن سکتا ہے۔

توتوش نے اپنی تسبیح کے دانے گنتے ہوئے کہا۔ ''نیشاپور میں تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''خواجہ علی کے دوست! اب میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' توتوش نے اس نوجوان کی پھٹی عبا اور بوسیدہ خرجی کو غور سے دیکھا، اور پھر لاپروائی سے کہا ''شاید میں ایک زین ساز کے مکان میں تیرا ٹھکانا کر سکوں، بشرطیکہ تو اس کے آٹھ بچوں کو قرآن پاک پڑھا سکے۔؟''

توتوش کے لہجے اور رویے میں سراسر بدتمیزی تھی، عمر کو تاؤ آ گیا۔ اس نے بگڑ کر کہا۔ ''غریبوں کے محافظ! آپ کسی خوجے کے لڑکے کے لیے جس نے مکتب میں کچھ تعلیم حاصل کر لی ہو ٹھکانا تلاش کیجئے گا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔''

''یقیناً'' توتوش نے بے پروائی سے کہا اور اپنے ٹٹو کی باگ موڑ کر ایک طرف چل دیا۔ آگے چل کر وہ رکا اور ایک فقیر کے کاسے میں جو ''یاہو۔ یاحق'' کی صدا لگا رہا تھا ایک سکہ ڈال دیا۔

اس نے سرگوشی میں فقیر سے کہا۔ ''بھوری عبا والے اس نوجوان کا پیچھا کر، دیکھ! وہ کیا کرتا ہے، اور اس وقت تک اس کا پیچھا کیے جاؤ، جب تک اس کی قیام گاہ کا پتہ نہ چل جائے۔''

فقیر نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''حضور کا جو حکم!'' اس نے سکہ اٹھا کر زور سے جماہی لی اور اپنا لبادہ اس طرح سمیٹا گویا اس امیر کی خیرات پانے کے بعد اسے آج کی روزی پہنچ گئی ہو۔

عمر راہ گیروں کے ہجوم میں ایک سائے کی مانند چل رہا تھا۔ کبھی اسے گوبر اور دھوئیں کی بو سے واسطہ پڑتا تو کہیں سے پیاز کے بگھار کی خوشبو اسے عجیب کیفیت میں مبتلا کر دیتی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر توتوش نے مجھے حقارت سے دیکھا تو کیا ہوا؟ میری جیب میں دو درہم ہیں اور کچھ عرصے کے لیے تو میں ٹھاٹ سے گذارا کر سکتا ہوں۔ میں اپنے پرانے مکان میں جا کر اسی چھت پر سو جاؤں گا جہاں گھاس کی بھینی خوشبوئیں ہوں گی۔ اگر میں اس محلے کے بھلے لوگوں کو دنیا کی کچھ خبریں سناؤں تو وہ یقیناً میرے سامنے کھانا رکھیں گے۔ کاش رحیم یہاں ہوتا!''

کتب فروشوں کی گلی میں پہنچ کر عمر اس پرانے چشمے کے پاس ٹھہرا۔ اس نے

اپنے تصور میں دیکھا کہ وہ لڑکی جو پانی کا گھڑا لیے کھڑی تھی جھکی اور اس نے گھڑے کا منہ پانی کی دھار کے نیچے کر دیا۔ پھر عمر پتھر پر اس کے قریب بیٹھ گیا، لیکن اب جبکہ وہ اس کے پاس لوٹ آیا تھا، وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہی تھی۔ چنار کے درخت کے نیچے اندھیرا تھا اور نقاب کے گوشوں سے لڑکی کی آنکھیں اسے دیکھنے کی کوشش میں تھیں۔ بے تابی سے لڑکی نے اپنے ماتھے سے بالوں کی لٹ ہٹائی۔ عمر نے اس کی تیز سانسوں کو سنا۔ اس تاریکی میں یاسمین موجود تھی۔ وہ بالکل بدل گئی تھی وہ خاموش تھی اور نقاب پوش بھی اس کا جسم گلاب سے معطر تھا۔ گھڑا بھر گیا۔ اور اس میں سے پانی بہنے لگا، لیکن لڑکی نے حرکت نہ کی۔ وہ بڑی ہوگئی تھی اور اس کا عریاں سفید بازو اندھیرے میں چمک رہا تھا۔

بوجھل آواز میں عمر بڑبڑایا۔ ''یاسمین! تو یہاں کس کا انتظار کر رہی ہے؟''

لڑکی چونک پڑی جیسے اس کے چوٹ لگی ہو۔ ''بیوقوف وہمی احمق..... میں کسی کا انتظار نہیں کر رہی!''

گھڑے کو ہاتھ سے گرا کر وہ اٹھی اور گلی میں غائب ہوگئی وہ بے تحاشا بھاگی، کیونکہ تین سال تک روزانہ اس نے انتظار کیا تھا اور اس کی راہ تکی تھی اور خود کو یقین دلایا تھا کہ عمر واپس آئے گا۔

چنار کے درخت کی آڑ سے، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک فقیر لنگڑاتا ہوا اس کے پاس، پتھر کے قریب آیا۔ اور گڑگڑا کر کہنے لگا! ''اللہ کے نام پر کچھ محتاج کو دو!''

چھٹا باب:

دریا کے کنارے

نیشا پور کے قبرستان کو پھولوں نے اپنا مسکن بنا لیا تھا اور انسانوں کی اس آخری آرام گاہ پر ایک نظر فریب قالین بچھا ہوا تھا۔ خوشگوار دھوپ میں مزاروں کی لوحیں چمک رہی تھیں، کسی پر عماموں کے نقش تھے، کسی پر پھولوں کے گچھوں کے، اور کسی پر کوئی نقش نہ تھا..... یہ سب قبریں عورتوں کی تھیں۔ سرو کے درختوں تلے نقاب پوش عورتیں سر جوڑے آپس میں باتیں کر رہی تھیں، وہ قبروں کے قریب حلقے بنائے بیٹھی تھیں، انہیں بچوں کی زیادہ فکر نہ تھی جو گھاس پر کھیلتے پھر رہے تھے۔

سہ پہر کا وقت اور یہ جمعے کا مبارک دن تھا، اس دن عورتیں فاتحہ پڑھنے ٹولیاں بنا کر قبرستان آتی تھیں۔ یہاں بیٹھ کر وہ دنیا جہان کی باتیں کرتیں۔ کچھ بڑی عمر کی لڑکیاں عورتوں کی ٹولیوں میں ٹہلتی ہوئی سرو کے اس جھنڈ میں نکل جاتیں جہاں انہیں کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ عورتوں کی موجودگی میں کوئی مرد قبرستان میں آنے کی جرات نہ کرتا۔ پھر بھی دریا کے قریب کچھ پگڈنڈیاں اور سبزہ زار تھے جہاں مہجور عاشق اپنی محبوباؤں کا انتظار کرتے۔

یاسمین ٹہلتی ٹہلتی آگے نکل گئی تھی۔ ایک چٹان پر نیم دراز وہ ان کبوتروں کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سر پر اڑ رہے تھے اس کے قریب ایک کھنڈر کی دیوار تھی اور ان کبوتروں کے گھونسلے اسی دیوار میں تھے۔ دیوار پر کوئی چھت نہ تھی۔ اسے اس بلند مینار

کی چاردیواری کے طور پر بنایا گیا تھا جس کی تعمیر کا مقصد دریا اور قبرستان کے قریب میدان کی پاسبانی تھا لیکن پچھلے کئی سال سے ملک میں امن و امان تھا اور یہ مینار بیکار پڑا تھا اس میں کبوتروں نے گھونسلے بنا لیے تھے اور عمر کی طرح جو رات کو یہاں اکثر ستاروں کا مطالعہ کرنے آتا تھا بھولے بھٹکے لوگ یہاں ٹھہر جاتے تھے۔

یاسمین نے اپنے دل میں کہا۔ ''ارے! میں یہاں کیوں آئی ہوں؟'' دھوپ میں اڑتے ہوئے کبوتروں کی طرح اس کے خیالات بھی آزادی سے پرواز کرنے لگے عمر وہیں لیٹا ہوا تھا۔ یاسمین نے بڑی احتیاط سے اپنے دل میں ایسے موقع کے لیے، جب اس کے پہلو میں کوئی مرد ہو، منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے اپنی بہن کی طرح اس مرد کو ساحرانہ نگاہوں سے دیکھنے اور اس کے سامنے ایسے جذبات انگیز جملے کہنے کی مشق بھی کی تھی جو بالآخر اس مرد کو اپنا دیوانہ بنا لیں۔ لیکن جمعے کے اس ماتمی لباس کے اندر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ اپنی زبان سے مہمل الفاظ کہے جا رہی تھی۔

اس کے پہلو میں لیٹا ہوا شخص کافی دیر سے خاموش تھا لیکن اس کی آنکھوں میں پیاس تھی۔

''ارے کچھ تو بولو'' یاسمین نے اس شخص سے کہا۔

''ننھی یاسمین! میں کیا بولوں؟'' عمر نے یہ کہتے وقت اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا، لیکن اسے یاسمین کی بلوریں گردن، یاقوتی ہونٹوں اور حسین آنکھوں کی قربت کا احساس تھا۔

''کیا تم جنگ میں شامل نہیں ہوئے اور تم نے سلطان کو نہیں دیکھا؟'' ور..... پھر دوسرے شہروں میں اور بہت سی لڑکیوں کے حسن سے اپنی آنکھیں نہیں ینکیں۔ بتاؤ! تم نے اور کیا کیا دیکھا؟''

عمر اس وقت زوئی اور خراسان کی لمبی سڑک کے متعلق سوچنے لگا اس نے بے ساختہ کہا۔ ''وہ جنگ کچھ بھی نہ تھی۔ واللہ! ہم بساط پر مہروں کے مانند گردش کرتے اور مر اپنے خانوں میں واپس پہنچ جاتے تھے۔ جنگ کے متعلق کوئی کیا بتا سکتا ہے؟''

ایک بہت پرانی یاد کی طرح یاسمین کو سبزے پر سوار اس فاتح امیر کا خیال آیا

جو اپنے جلو میں نیزہ بازوں کا دستہ لیے آئے گا اور اسے اپنے ہمراہ سفید بطوں والے نیمے میں لے جائے گا۔

''نیشاپور میں تم کیا کرو گے؟'' یاسمین نے تعجب سے پوچھا۔

''کون جانے؟''

''کیا تم پھر واپس جاؤ گے؟''

عمر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ نہ واپس جانا چاہتا تھا اور نہ یاسمین کے علاوہ جو گذشتہ برسوں میں ایک سنجیدہ بچی کی بجائے حسین اور دلکش دوشیزہ بن گئی تھی کسی اور چیز کے متعلق سوچنا چاہتا تھا، لیکن وہ ابھی تک بدلی نہیں تھی۔ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے عمر کسی خیال میں غرق تھا اور قبرستان سے واپس جانے والوں کے ان چھوٹے چھوٹے سایوں کو تک رہا تھا جو دور شہر کے دروازوں تک پہنچ رہے تھے۔

یاسمین نے کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ تم آئینہ دانش کے محبوب شاگرد تھے اور اب تم خود استاد جیسے معلوم ہوتے ہو۔''

عمر کو یہ بات سن کر تعجب نہیں ہوا، کیونکہ یاسمین نے کتب فروشوں کی گلی میں یہ ذکر سنا ہوگا، جہاں مدرسے کی باتوں کا چرچا رہتا ہے۔

اس نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ نہ میرے پاس کام کرنے کے لیے جگہ ہے نہ کوئی میرا سرپرست ہے، اور نہ کوئی اپنی چیز ہے۔ درویش کو اپنا پیٹ بھرنے کے ڈھنگ آتے ہیں اور معلم کو اس کی روزی ملتی ہے، لیکن میرے پاس کیا ہے؟''

یاسمین گھاس پر اس کے اور قریب بیٹھ گئی۔ اگر واقعی عمر فقیر ہوتا تو اسے کوئی اس سے نہ چھینتا۔ یہ اور اچھا ہوتا۔ غیر ارادی طور اس نے عمر سے کہا۔ ''عقلمند ہونے کی بجائے، تم احمد جوتشی سے بھی زیادہ بیوقوف ہو گئے ہو، احمد ستاروں کا حال بتا کر بہت کچھ کما لیتا ہے۔ اس کے پاس ریشمی عبا اور ایک حبشی غلام ہے..... دیکھو اب سب عورتیں جا چکیں۔ مجھے اب جانا چاہیے!''

لیکن عمر نے اس کی کلائی پکڑ لی تو یاسمین نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ کبوتر

مینار کے طاقوں میں بسیرا کر رہے تھے اور اب کوئی کبوتر آسمان پر اڑتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ یاسمین نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''دیکھو چاند نکل آیا۔ اب مجھے واپس جانا چاہیے۔''

''جلد ہی اس ہلال کے ساتھ ایک ستارہ دکھائی دے گا'' عمر نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''نہیں میں اسے نہیں دیکھوں گی۔''

''اپنے اس عظیم مینار میں تنہا بیٹھ کر تم اس ستارے کو اور دوسرے تمام ستاروں کو دیکھو گے۔ کیا تمہیں ان مردوں سے ڈر نہیں لگتا جو کفن پہنے اپنی قبروں سے باہر یہاں بیٹھے رہتے ہیں؟''

''نہیں وہ میرے دوست ہیں۔ وہ میرے لیے فلکیات کا ساز و سامان اور ستاروں کی روشنی لاتے اور مجھے وہ علم سکھاتے ہیں جو کلدانیوں کو معلوم تھا۔''

خوف کے مارے یاسمین اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ عمر تعجب انگیز عقل رکھتا ہے اور اس کی مدد سے وہ راز معلوم کرتا ہے۔ غالباً وہ مُردوں سے بھی بات چیت کرتا ہے۔

''لیکن تم کلدانیوں کی زبان میں کیسے بات چیت کر لیتے ہو؟''

''نہیں یاسمین! خدا کا ایک فرشتہ اس دیوار پر آ کر بیٹھتا ہے اور مردے جو کچھ کہتے ہیں وہ مجھے سمجھاتا ہے، کیونکہ فرشتے دنیا کی سب زبانیں جانتے ہیں۔''

''یہ مذاق ہے! فرشتوں کے متعلق مذاق کرنا گناہ ہے۔ کیا واقعی یہاں بھوت آتے ہیں؟''

وہ عمر کے اور قریب بیٹھ گئی اور قبرستان کی قبروں کے تاریک سائے دیکھنے لگی۔ عمر نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو وہ کانپ گئی اور ایک طرف کو کھنچنے لگی۔ اس پر غنودگی سی چھا گئی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

عمر اس کے دل کی دھڑکن اور تیز سانسیں سن رہا تھا اور کہہ رہی تھی ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے!'' الفاظ یاسمین کے جذبات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ عمر نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ عمر بولا۔ ''میری طرف دیکھو!''

لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔

آسمان پر ہلال کی باریک سیمیں محراب کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ میں ایک ستارہ چمک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کے سیاہ پردے پر کسی نے چاند اور ستارے کی تصویر بنائی ہے۔ عمر کو ایک عجب تشنگی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا تمام جسم دکھ رہا تھا۔ لیکن یہ درد اس وقت رک گیا جب اس نے یاسمین کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے۔

''نہیں۔ اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ نہیں۔.....'' یاسمین نے گہری سانس لے کر کہا۔

ستاروں کی ملگجی روشنی میں سیاہ دوپٹے نے یاسمین کے گورے بازوؤں کو اور چھپا دیا تھا۔ یاسمین نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ اس کو اپنے سینے سے لگایا اور اپنے گرم ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ محبت کے جوش میں وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

عشاء کی نماز کے بہت دیر بعد عمر اور یاسمین آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے پھر شہر کے دروازے پر پہنچے، نہ انہیں اس راستے کا احساس تھا جس پر وہ چل رہے تھے اور نہ اس ماہ نو کا جو نیچے کی طرح آسمان پر چمک رہا تھا جب وہ کتب فروشوں کی گلی میں چنار کے درخت کے نیچے، چشمے پر پہنچے، تو یاسمین عمر سے لپٹ گئی، روتے روتے اس کا نقاب آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ وہ بولی ''میری جان! میں تجھے کس طرح چھوڑ سکتی ہوں؟''

یاسمین نے زندگی میں صرف ایک ہی بار محبت کی تھی اور اس کا ایک ہی محبوب تھا۔ جدائی کے غم سے اس کا تمام جسم شل تھا۔ یقیناً خدا کا کوئی فرشتہ ویران مینار کی دیوار پر آ کر بیٹھا ہوگا اور اس نے یاسمین کے جسم سے طاقت کھینچ لی ہوگی۔

عمر پر غنودگی طاری تھی لیکن اس کے حواس فسون شب سے مسحور تھے۔ اسے نہ کھانے کی خواہش تھی اور نہ سونے کی۔ عمر اس فقیر کو دیکھ کر مسکرایا جو اس کی قیام گاہ کے دروازے پر پڑا تھا۔ یہ وہی فقیر تھا جسے اس نے پچھلے دنوں شہر کی گلیوں میں پھرتے دیکھا تھا۔ وہ بہت دیر تک آوارہ پھرتا رہا پھر اس کے قدم خود بخود باغ کی جانی

پہچانی سڑک کی طرف اٹھ گئے، یہاں اس باغ میں چوکی دار مدور قندیلیں ہاتھ میں لیے خدا کے نام پر لوگوں کو چیخ چیخ کر ہر گھنٹے پر وقت بتاتے تھے۔ عمر پر مدہوشی سی طاری تھی اور شب کی تاریکی میں اسے عجب شکلیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ایک سایہ دیکھا جو اس کے پیچھے درختوں سے نکل کر بڑے تالاب تک گیا جہاں بے خانماں لوگ سو رہے تھے اور رات کے ان سحر آفریں لمحات سے بے خبر نیند میں خراٹے لے رہے تھے۔

ان محوِ خواب لوگوں میں ایک کبڑے آدمی کے قریب ایک سفید گدھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ یہ کبڑا اپنے بدن پر کپڑا لپیٹتا ہوا تالاب کے کنارے تک سرک کر آیا۔ عمر کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے انہیں کبھی خواب میں دیکھا ہے..... جیسے اس وقت سے پہلے بھی اس نے ان کو کبھی دیکھا ہو، لیکن اس صورت سے نہیں.....

عمر اس کبڑے کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ کبڑے نے پانی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''بھائی! چاند آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب گیا ہے'' عمر نے پانی میں ہلال کا نیچہ نما عکس دیکھا۔ اس رات عمر کے نزدیک رنج کی کوئی حقیقت نہ تھی، لیکن اسے علم تھا کہ کبڑا رنجیدہ ہے۔

''تو کیا کرتا ہے؟'' عمر نے نرمی سے پوچھا۔

''کبڑے نے کہا میں پہرا دیتا ہوں۔ دیکھو! یہ دوسرے لوگ کس طرح سو رہے ہیں یقیناً میں اس چاند کی نگرانی کرتا ہوں جو پانی میں ڈوب گیا ہے، کیونکہ اصل چاند وہی ہے اور یہ آسمان کا دوسرا چاند غیر فانی اور بے پروا ہے۔ ہاں یہ ڈوب جائے گا اور پھر نکلے گا، اس کے لئے یہ رات بھی دوسری راتوں کی مانند ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے'' عمر نے کہا۔

کبڑے نے خوابیدہ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں کا آقا موجود ہے، ایک نیا آقا، لیکن میں جعفرک ہوں اور میرا آقا مر چکا ہے۔ واللہ! وہ عنایتوں کا آفتاب تھا۔ واللہ! وہ بدنصیبوں کا محافظ تھا۔ واللہ! وہ جعفرک جیسے بدصورت اور انتہائی ذلیل غلام سے محبت کرتا تھا۔ اب سورج کی اس سرزمین سے سورج اٹھ گیا، وفاداروں کا محافظ اور جعفرک کا محبوب چھن گیا۔ واللہ! سلطان الپ ارسلان قتل ہو گیا!''

عمر بولا مجھے نہیں معلوم۔ وہ پانی پر چاند کے رواں عکس کو دیکھ رہا تھا، اس نے جعفرک کی کوئی بات سنی اور کوئی نہ سنی۔''

تم نہیں جانتے حالانکہ تمام نیشاپور جانتا ہے کہ آج ہم سمرقند سے اس کی لاش لے کر آئے ہیں۔ اس کی قسمت تھی۔ میرے بھائی! اس کا اقتدار زبردست تھا؟ میرے اس آقا کے سامنے سمرقند میں ایک ذلیل قیدی لایا گیا اور جب یہ قیدی میرے آقا کے روبرو پیش کیا گیا تو دو طاقتور جلاد اس کے بازو پکڑے ہوئے تھے۔ اس ذلیل شخص نے میرے مرحوم سلطان کو گالی دی۔ سلطان غصے سے سرخ ہو گیا، اس نے اپنا تیر کمان نکالا اور جلادوں کو الگ کھڑا ہونے کا حکم دیا، وہ چاہتا تھا کہ اس ذلیل کتے کو اپنے تیر سے ہلاک کرے۔ وہ تیر انداز سلطان جس کا تیر کبھی خطا نہیں ہوا۔'' جعفرک کو پسینہ آ گیا، اس نے اپنا منہ پونچھا اور آہ بھر کر کہا۔ ''لیکن اس کا وہ تیر خطا ہو گیا، اور اس ذلیل کتے نے جس کے پاس دو خنجر چھپے ہوئے تھے میرے آقا پر اچھل کر حملہ کیا اور میرے آقا کے پیٹ پر تین وار کئے۔ چار دن کے بعد میرا آقا اللہ کو پیارا ہو گیا۔''

''الامان'' عمر نے منہ ہی منہ میں کہا۔

جعفرک فرطِ غم سے بلک بلک کر رو رہا تھا کہہ رہا تھا۔

''میں آنسوؤں کی چاندنی میں بیٹھا ہوں اور رو رہا ہوں۔'' عمر کو دور رات کی تاریکی میں رحیم کی قبر دکھائی دے رہی تھی اور وہ وقت یاد آ رہا تھا جب رحیم کا غلام اس کے قریب بیٹھا اسی انداز سے رو رہا تھا۔

زخمی فقیر بڑبڑایا۔ ''دیگ کا اندازہ ایک چاول سے ہو جاتا ہے۔ نہیں وہ ابھی جوان ہے اور اس کے جسم میں شب بیداری کی طاقت ہے۔ افوہ! مجھ پر تو نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ کیا گذشتہ جمعے کی شام سے میں اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہوں؟ نہیں وہ مشکوک نہیں ہے۔ سردست تو اس کی یہ حالت ہے کہ وہ بیل اور گدھے کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا۔''

ساتواں باب:

نظام الملک

توتوش نے اس سے پوچھا۔ ''کیا وہ لڑکی کنیز ہے؟ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟''

فقیر نے عیاری سے آنکھیں مار کر کہا۔ ''رات کے وقت بلی سائل نظر نہیں آتی ہے، لیکن وہ کنیز نہیں ہے، حالانکہ اس کے گھر کی خواتین اس سے خاصا کام لیتی ہیں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔''

''اور اس کا نام کیا ہے؟''

''لوگ اسے یاسمین کہتے ہیں۔ ''شان حسین حمام'' کا مالک کہتا ہے کہ مشہد کے ایک کپڑے کے تاجر ابوزید نے اس اندھے کتب فروش کو اس لڑکی کے لیے اپنا پیام بھیجا ہے۔''

ابوزید تاجر ہے؟''

''ہاں! میرے آقا۔''

''اس کے پاس ایک بڑا خیمہ اور بہت سے اونٹ ہیں'' توتوش یہ کہہ کر کچھ دیر سوچتا رہا اور فقیر جسے اب تک اپنی اجرت نہیں ملی تھی ادب کے ساتھ منتظر رہا۔ پھر توتوش بولا۔ ''کم از کم ہمارا نوجوان خیام کتب فروشوں کی گلی سے نہیں جائے گا۔ تو جا اور جب تک پیغام پہنچے نگرانی کر۔''

''لیکن میرے آقا! میں پیغامبر کو کیسے پہچانوں گا؟''

''وہ تجھے اس طرح اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار کر کہے گا ''خیام کہاں گھوم رہا ہے؟'' اس وقت تک تو گہری نیند نہ سونا۔ دوسرے لوگوں کے بھی آنکھیں ہیں اور وہ تیرے خراٹے بھی سن سکتے ہیں۔''

''آقا وہ تیرے غلام کے نہیں ہیں.....''

توتوش چل دیا۔ اس نے زمین پر تانبے کے چند سکے ڈال دیئے اور فقیر جلدی جلدی اٹھانے لگا تا کہ کہیں وہ شریر بچے جو قریب ہی کھیل رہے تھے جھپٹ کر نہ لے جائیں۔ فقیر بڑبڑا رہا تھا ''بغدادی درہم سے زیادہ کے پیسے نہیں.....اتنی سخت محنت کا کتنا کم معاوضہ۔ افوہ! یہ کنجوس امیر کا بچہ تو اپنی مٹھی سے پانی بھی نہ بہنے دے۔''

لیکن وہ توتوش سے ڈرتا تھا، اور اس لیے اور بھی زیادہ کہ اسے یہ علم تھا کہ یہ موٹا اور پستہ قد آدمی کسی منصب دار کا ملازم ہے۔ چنانچہ وہ جلد چنار کے درخت کے نیچے چشمے کے قریب پتھر پر اپنی مخصوص جگہ پہنچنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

مدرسے کے دروازہ پر بڑی گہما گہمی تھی۔ لمبی لمبی داڑھیوں والے لوگ اپنے غلاموں کے ہمراہ آ جا رہے تھے اور گلی کے آخر میں میدان کے قریب سے سواروں کے قافلے گزر رہے تھے۔ نیشاپور کے باشندوں میں غیر معمولی سرگرمی پیدا ہو گئی تھی اور وہ یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ اب قسمت کیا رنگ لاتی ہے۔ سلطان مر چکا تھا اور شہر میں اس کا معقول سوگ منایا جا رہا تھا، لیکن جامع مسجد میں مولوی اپنے خطبوں میں نئے سلطان یعنی ملک شاہ کا نام لے رہے تھے۔ ملک شاہ نوجوان اور خوبصورت شہزادہ تھا اور لوگ اسے شیر زادہ کہتے تھے۔

ملک شاہ جس کے چہرے پر ابھی پوری طرح سبزہ آغاز بھی نہ ہوا تھا اور جو ابھی تک مدرسے سے، کتابوں اور شہسواری کے ماحول میں زندگی گزار رہا تھا یکا یک ناصر الملت والدین۔ سلطان الشرق والغرب اور دنیا کا آقا بن گیا تھا امرائے خراساں اسے نذریں پیش کرنے کے لیے بے تاب تھے۔

فقیر یہ سب تماشا بے توجہی سے دیکھ رہا تھا، کیونکہ اسے تو عمر اور یاسمین کی فکر تھی۔ دن میں وہ شاذ ہی نظر آتے تھے، لیکن جب چشمے پر رات کی تاریکی چھا جاتی تو

آنے جانے والوں کی نگاہوں سے بے نیاز باہر اندھیرے میں دو سائے نظر آتے۔ فقیر سوچتا تھا کہ جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے وہ اچھی طرح نقاب میں چھپی ہوئی ہے اور وہ بھی ان سینکڑوں انسانوں کے مانند ہو گی جو شام کے وقت گپ شپ کرنے، تفریح کرنے اور قسمت کے کرشمے دیکھنے کے لیے نکلتے ہیں، ورنہ اسے دیکھتا اور پہچانتا۔

عمر کے متعلق اس کا یہ خیال تھا کہ یہ بلند قامت نوجوان ہوش و حواس کھو چکا ہے۔ صرف بھولے سے کبھی کبھی اسے جامع مسجد کے ہجوم میں زائروں کے ساتھ کھانا کھانے کا خیال آجاتا تھا۔ وہ چشمے پر پانی پیتا تھا اور کسی سے بات نہ کرتا تھا۔

فقیر کو عمر کی حالت پر رشک آتا تھا وہ سوچتا تھا کہ ''یہ لڑکا اس شرابی کی مانند مست رہتا ہے جو ہر رات شراب کا قربہ پی جاتا ہو۔ لیکن اسے نشے کے لیے پھوٹی کوڑی بھی خرچ نہیں کرنی پڑتی۔''

دوسرے دن ایک قلی آیا اور اس نے فقیر کے سینے پر ٹھوکر مار کر کہا ''جوؤں کے پالنے والے! وہ تیرا سر پھرا خیام کہاں گھومتا ہے؟''

''اے آوارہ گرد! میں کسی کا پالنے والا نہیں!'' فقیر نے غصے کی نظر سے نووارد کو دیکھا اور یہ اندازہ لگایا کہ وہ صرف ایک ایسا ملازم ہو سکتا ہے جسے کسی بھنگی نے ایک بے حیا اور چڑیل خصلت کمینی ..... عورت کے بطن سے پیدا کیا ہے.....''

قلی نے فقیر کے ایک ٹھوکر اور لگائی تو وہ خاموش ہو گیا وہ بڑبڑایا ''تجھے کس نے بھیجا ہے؟''

''اس نے جو تیری لاش کو محل کے دروازے پر لٹکا کر چیل اور کوؤں کو کھلا سکتا ہے۔''

''عمر خیام سامنے ''شان حسین'' نام کے حمام میں ہے۔ خدا گواہ ہے! اگر میں حمام والے کو ایک درہم دے سکتا تو میں بھی حمام میں جاتا.....''

قلی نے اسے یہ انعام دیا کہ اس کے کاسے میں تھوک کر چلتا بنا اور فقیر غصے میں پیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔

''خدا کرے تیری قبر پر کتیا بچے دے! خدا کرے عقاب تیرے ہڈیاں کھائیں! خدا کرے جہنم کی آگ تیری چربی پگھلائے!'' فقیر گڑگڑا کر اسے بددعائیں دینے لگا۔

عمر اس قلی کے ہمراہ قصر سلطانی کے پہلے صحن میں پہنچا۔ جہاں تقریباً نصف درجن امراء کے مسلح دستے اپنے سجے ہوئے گھوڑوں کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے یہاں توتوش کو دیکھا جو انتہائی بے صبری کے عالم میں تھا وہ عمر کو دیکھتے ہی چیخ پڑا۔ اس نے جلدی سے عمر کی آستین پکڑی اور محافظوں اور چوبداروں کے درمیان سے نکلتا ہوا جو سب کے سب اس نیلے عمامے اور لمبی عبا والے انسان کو خوب پہچانتے تھے، ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا، جہاں بیٹھنے کے لیے میز کرسی تھی۔

توتوش نے عمر سے کہا۔ ''خدا کی قسم! مقررہ وقت گزر چکا ہے، لیکن ابھی اس نے تجھے بلایا نہیں ہے'' پھر اس نے عمر کو تعجب کی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''کیا تجھے معلوم ہے کہ نظام الملک نے تجھے کس لیے اپنے حضور میں یاد کیا ہے؟''

عمر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا..... اسے بہت زیادہ تعجب ہو رہا تھا۔ نظام الملک..... ''دنیا کا ناظم'' اس شخص کا خطاب ہے جو الپ ارسلان کا وزیر تھا اور جس کا مقتول سلطان کے جانشین ملک شاہ پر بھی اتنا ہی اثر تھا۔ پھر سلطان کے عہد حکومت میں نظام الملک کو تقریباً سیاہ سفید کے اختیارات حاصل تھے۔ وہ ایک ذہین اور دانش مند ایرانی تھا اس نے فوج کے علاوہ بتدریج ملک کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یہ تعجب انگیز بات تھی کہ اس نے مدرسے کے ایک طالب علم کو اپنے حضور میں کیوں یاد کیا ہے؟

توتوش نے اس راز پر کوئی روشنی نہ ڈالی۔ وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''میں نے اب طاقین پر تیری خودداری کو ٹھیس لگائی تھی۔ یہ ایک آزمائش تھی۔ اور نظام الملک کے حکم سے میں نے تیری نگرانی بھی کرائی تھی۔''

عمر نے اس کو تیز نگاہوں سے دیکھا وہ کہہ رہا تھا..... ''اور میں نے تجھ پر پہرا بھی لگایا۔ تو نوجوان اور بے نیاز ہے، لیکن اب اس وقت نظام الملک خود تیرا امتحان لے گا، اس لیے ذرا احتیاط سے کام لینا۔''

عمر اس کی باتیں سن تو رہا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ یہ بیکار سی بات معلوم ہوتی تھی..... تاوقتیکہ شیر زادہ جو اب سلطان بن گیا تھا اسے طلب نہ کرتا، لیکن شیر زادہ تو دور جنگلوں میں شکار کھیل رہا تھا اور خلا میں یاسمین کی پیاسی نظریں اسے

دیکھ رہی تھیں۔

یکا یک ایک غلام نے سامنے سے بھاری پردہ گھسیٹا۔ اب عمر کو معلوم ہوا کہ یہ خالی کمرہ اصل میں اس بڑے دیوان خانے کا بیرونی حصہ تھا جس کے اندر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ دالان کے وسط میں ایک ۶۰ سالہ شخص تنہا بیٹھا ان کاغذوں کو دیکھنے میں مصروف تھا جو اس کے سامنے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی بھوری داڑھی کے بال جن میں سیلقے سے کنگھی کی گئی تھی اس کے ریشمی عبا پر پڑے تھے وہ کچھ لوگوں سے مختصر باتیں کرتا اور ان میں سے ایک شخص کو جو اس کا معتمد معلوم ہوتا تھا کاغذات دیتا جاتا تھا۔ جو لوگ اس سے رخصت ہو کر سر جھکائے ، الٹے قدموں دیوان خانے کے دروازے کی طرف جاتے وہ ان کا سلام قبول کرتا۔

تو توش اپنے ساتھ عمر کو لے کر آگے بڑھا۔ وہ ایک بار سلام کرنے رکے اور پھر نظام الملک کے سامنے پہنچ کر قالین پر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

کچھ دیر تک نظام الملک اپنے گھنے ابروؤں میں سے عمر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ کے کاغذوں کو دیکھ کر کہا۔ ''تم ابراہیم خیام کے بیٹے ، ریاضی کے طالب علم اور استاد علی کے شاگرد ہو؟ اور بچپن میں تم نے امام موفق سے فلسفہ پڑھا تھا؟''

نظام الملک ایسی جچی تلی اور چست آواز میں بول میں بول رہا تھا جیسے وہ شخص بولتا ہے جو بڑے مجمعوں میں گھنٹوں تقریر کر سکتا ہے، تو توش خاموش، علیحدہ بیٹھا ہوا تھا۔

''استاد علی نے لکھا ہے کہ تم ایک عجیب و غریب طاقت کے مالک ہو۔ اللہ کے سوا کوئی طاقتور نہیں ہے۔ میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کسی روحانی طاقت کے زور سے ہمارے آقا سلطان ملک شاہ سے اس زمانے میں جب وہ شہزادے تھے ملاذ گرد کی جنگ کے انجام اور قیصر روم اور ہمارے مرحوم سلطان دونوں کے مارے جانے کی پیشین گوئی کی گئی؟''

عمر کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ کاش اس کے جواب میں وہ کوئی قرین قیاس قصہ سنا سکتا، لیکن عمر کو احساس تھا کہ یہ شخص جس کی نگاہیں تیز اور آواز سخت تھی کسی من گھڑت بات کو فوراً مسترد کر دے گا۔

اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''عالی جاہ! حقیقت میں ..... یہ پیشین گوئی ایک مذاق تھی۔''

نظام الملک نے بے چینی سے پہلو بدل کر سوال کیا۔ ''اس کا کیا مطلب ہے؟ سمجھاؤ۔ یہ مذاق نہیں ہو سکتا تھا۔''

اب عمر کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ اس نے جو واقعہ ہوا تھا وہی بتایا تھا، اس نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ مذاق ہی تھا۔ عالی جاہ! اس رات میں خیموں میں گھوم رہا تھا اور اتفاقاً اس خیمہ کی طرف جا نکلا جہاں ترکوں کا پہرا تھا۔ میں ان کی باتیں اچھی طرح نہیں سمجھ رہا تھا..... اور نہ مجھے یہ احساس تھا کہ اس خیمے کا نوجوان امیر شہزادہ ہے۔ اس کے پاس جو استاد تھے انہوں نے سہیل ستارہ دکھانے میں سخت غلطی کی، اس وقت اتفاق سے مجھے یہ خیال آ گیا کہ انہی کی طرح سنجیدہ انداز میں ایک پیشین گوئی کر ڈالوں۔ یہ تھی ساری بات۔''

نظام الملک گاؤ تکیے سے کمر لگاتے ہوئے بولا۔ ''تم بدتمیزی کی حد تک صاف گو ہو۔ تم اس بات کا کیا جواب دو گے کہ اس مذاق میں تین واقعات کے متعلق صحیح پیشین گوئی کی گئی۔ یعنی جنگ اور دونوں بادشاہوں کے مارے جانے کے واقعات؟''

عمر ایک منٹ کے لیے سوچتا رہا اور اس نے کہا۔ ''عالی جاہ! میں اس کی کیا تشریح کر سکتا ہوں۔ اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، لیکن واقعہ یہی ہے!''

نظام الملک نے عمر کو اس انداز سے دیکھا جیسے وہ ایک بے جان شے ہے اور اس کی جانچ کی جا رہی ہے۔ ''اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا یہ ٹھیک ہے لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ کس چیز نے تجھے یہ کہنے پر مجبور کیا۔ یقیناً تجھے قیصر روم کی پیدائش کا دن اور وقت معلوم نہ تھا۔ تجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ اس کی پیدائش کے وقت کون سا ستارہ غالب تھا۔ پھر تو نے سلطان الپ ارسلان کا زائچہ کس طرح ترتیب دیا ہوگا؟''

تو توش نے خود ہی آنکھ ماری، جیسے وہ نظام الملک کی چال کو سمجھ رہا ہو۔

عمر نے جوب دیا۔ ''میں نے زائچہ نہیں بنایا تھا۔''

''لیکن تم میں زائچہ بنانے کی قابلیت ہے؟''

Pakistanipoint
Waqar Azeem

"یقیناً لیکن یہ قابلیت تو اور بھی سینکڑوں انسان رکھتے ہیں۔"

نظام الملک کی بھنویں سکڑ گئیں، اس نے کہا۔ "ممکن ہے، لیکن مجھے ابھی تک کوئی ایسا نجومی نہیں ملا جو بیک وقت تین پیشین گوئیاں کر سکے، اور پھر استاد علی کی رائے ہے کہ تم کسی عجیب وغریب طاقت کے مالک ہو۔"

توتوش نے اپنی جگہ نظام الملک کے اس جملے کی تائید میں سر ہلا دیا۔ اسے نظام الملک نے یہ حکم دیا تھا کہ عمر خیام کے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم کرے۔

نظام الملک نے اچانک عمر سے یہ سوال کیا۔ "ابراہیم کے بیٹے کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد ملک شاہ تیرے بارے میں کئی مرتبہ پوچھ چکا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے نہیں سنا۔"

نظام الملک اور توتوش دونوں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ نظام الملک مطمئن نظر آتا تھا، حالانکہ اس نے اس کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ وہ بولا "ابھی تو نوعمر ہے اور سلطان کے حضور میں پیش ہونے کا اہل نہیں اور چونکہ تیری پیشین گوئی صرف ایک مذاق تھی اس لیے تجھے اس کے حضور میں نہایت احتیاط برتنا پڑے گی۔ میں تجھ سے یہ بات نہیں چھپانا چاہتا کہ ملک شاہ تجھ سے عنایت سے پیش آئے گا، لیکن وہ باتیں جو تو نے مجھ سے اس کمرے میں کہی ہیں تیری موت کا باعث نہیں تو تیری ذلت کا سبب یقیناً بن جائیں گی..... اپنی اس عجیب وغریب پیشین گوئی کے صلے میں تو سلطان سے کیا انعام مانگے گا؟"

عمر اس سوال پر شرما گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس رات کا ایک درہم اس کے لیے عذاب جان بن گیا ہے۔ اس نے جواب دیا "مجھے سلطان کے دربار سے کیا واسطہ؟ مجھے کسی انعام کی تمنا نہیں ہے۔"

نظام الملک کو عمر کی بات پر پورا یقین نہ آیا۔ وہ سلطان کے دربار کے طور طریقے سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ اس نے مناسب سمجھا کہ اس ضدی نوجوان کو سمجھائے۔ وہ بولا "میں وزیر ہوں اور ملک شاہ کا خادم! میں تجھے اپنا دوست بناؤں گا..... کیونکہ تجھے کسی انعام کی تمنا ہے۔ ابراہیم خیام کے بیٹے! بتا کہ کیا تجھے اپنی زندگی

اور اپنے علم کے لیے نظام الملک کی حفاظت اور سرپرستی قبول ہے؟"

عمر نے سوچا۔ وہ بے خانماں ہے۔ نیشاپور میں اس کا کوئی نہیں اور اب تو اس پر آئینہ دانش کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور پچھلے دنوں وہ فقیروں کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا اس کے دل میں یہ تمنا تھی کہ کاش یاسمین کو رکھنے کے لیے اس کے پاس مکان ہوتا۔

عمر کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ جلدی سے بولا۔ "جی ہاں یقیناً۔"

"پھر بتا تجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟"

"ایک رصد گاہ۔ بغداد کا بنا ہوا ۲/۱ اگز قطر کا اسطرلاب، افلاطون کی جدول۔"

"اور کیا؟ بتائے جاؤ۔"

"اگر عالی جاہ! مناسب سمجھیں تو چمکدار پیتل کا ایک کرہ جس کے گرد افقی حلقے ہوں۔ ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے لالٹین، اور اگر ہو سکے تو پانی کی گھڑی جو دو دو منٹ کا وقت ٹھیک ٹھیک بتا سکے۔"

توتوش تعجب سے آنکھیں پھاڑے ان قیمتی اور کمیاب آلات کی فہرست سن رہا تھا، لیکن نظام الملک نے اسے ان چیزوں کی فہرست بنانے کا اشارہ کیا۔

پھر نظام الملک نے مسکرا کر پوچھا۔ "اور یہ رصد گاہ ہوگی کہاں؟ کیا کسی اونچی چھت کے اوپر؟"

عمر نے جلد جلد بغیر سانس لیے کہا۔ "عالی جاہ کی دانشمندی سے نیشاپور جنگ کے خطرے سے محفوظ ہو گیا ہے اور اس کی سڑکوں کے کنارے پاسبانی کے پرانے مینار ویران پڑے ہیں۔ قبرستان اور دربار کے قریب شہر پناہ سے آگے ایسا ہی ایک منارہ ہے اور میں نے اکثر اس منارے سے رات کے وقت ستاروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا یہ منارہ مجھے مل سکتا ہے؟ اور کیا اس کے دروازے میں ایک عمدہ تالا، بخارا کے چند اچھے قالین، تکیے، ایک چینی پردہ اور چاندی کی ایک صراحی بھی مجھے مل سکے گی؟"

نظام الملک نے متعجب ہو کر کہا "واللہ! فلکیات کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر بھی....." عمر کی تعریف سے وہ خوش

ہو گیا تھا، اور اس کی درخواست کے خلوص سے بھی متاثر تھا..... ''تجھے یہ سب چیزیں عطا کی جائیں گی، مگر ایک شرط پر.....''

عمر نے سر تسلیم خم کیا اور پھر نظام الملک کے دبلے ہاتھ پہ بوسہ دیا۔ نظام الملک نے کہا۔ ''اس شرط پر کہ تم کسی شخص سے یہ کبھی نہ کہو گے کہ تم نے ملاذگرد میں جو پیشین گوئی کی تھی وہ مذاق تھا۔''

''عالی جاہ! میں کبھی ایسا نہ کہوں گا۔''

توتوش نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کسی سے اس کا ذکر بھی کرو تو یہ کہنا کہ وہ پیشین گوئی ایک وجدان کا نتیجہ تھی۔''

عمر نے مسکرا کر کہا۔ ''بہتر۔ جیسا آپ کا ارشاد۔'' نظام الملک مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''تجھے چینی پردہ اور چاندی کی صراحی تو یاد رہی لیکن کھانے اور ملازموں کا کوئی خیال نہ آیا لے یہ چاندی کے سکوں کا کیسہ ہے، اور توتوش تیرے لیے وہ ملازم تلاش کر دے گا۔''

حقیقت یہی تھی کہ عمر کو ان چیزوں کو پروا نہ تھی، اس نے تعجب سے اس خوبصورت کیسے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ آج سے پہلے اس نے اپنی زندگی میں مٹھی بھر سکے نہ دیکھے تھے اور اس وقت اسے عجب اطمینان اور مسرت محسوس ہو رہی تھی؟''

عمر نے پوچھا۔ ''منارہ مجھے کب ملے گا؟''

نظام الملک نے توتوش کی طرف دیکھا اور وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ''کل عصر کی نماز کے وقت تک۔''

عمر سوچ رہا تھا کہ اقتدار کا زور جادو کے سے کرشمہ دکھا سکتا ہے اس نے خوش ہو کر بلند آواز سے کہا۔ ''خدائے رحیم لائق تحسین ہے!'' وہ قالین پر مؤدبانہ کھڑا تھا جب نظام الملک نے اسے رخصت ہونے کی اجازت دے دی تو وہ نقدی کے کیسہ کو بھول کر چلنے لگا۔ توتوش نے آہستہ سے اسے یاد دلایا تو وہ جلدی سے کیسہ لینے واپس آیا، توتوش نے اسے آہستہ سے یہ بھی یاد دلایا کہ واپس ہوتے وقت دروازے پر پہنچ کر اسے پھر سلام کرنا ہے۔

جب توتوش اور نظام الملک تنہا رہ گئے، توتوش نظام الملک کے قریب جھک کر بولا۔ ''آفتاب عنایات! کیا میں نے آپ سے عرض نہیں کیا تھا کہ یہ نوجوان صحیح آلہ کار ثابت ہوگا اور وہ آپ کے قبضے میں آچکا ہے؟ کیا ہمیں تمام نیشاپور میں اس جیسا دوسرا آدمی مل سکتا تھا؟ اس کی عجیب وغریب لیاقت، سچ بولنے کی اس سے بھی زیادہ عجب عادت، ستاروں کے مطالعے کے علاوہ اور تمام باتوں سے بے پروائی اور پھر اس کی وہ ناقابل یقین پیشین گوئی کی صحت، کیا اس نوجوان کو وہ کام انجام دینے کا اہل نہیں پاتیں؟ معاذ اللہ! اس نے تو استاد علی سے یہ قسم بھی کھائی کہ شاہی منجم کو حقیقت حال کا یقین کرنا چاہیے۔'' نظام الملک مسکرایا تک نہیں وہ بولا۔ ''کاش میں اس کا راز جان سکتا..... اور پھر وہ کچھ چھپاتا بھی تو نہیں۔''

نظام الملک کے جاسوسوں کے سربراہ نے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں! اور پھر اس کا ہر قول صحیح ثابت ہوتا ہے اور ہر لفظ سچ! میرے خدا!'' توتوش نے بے پروائی سے اپنی تسبیح گھمائی اور بولا۔ ''میں اسے حجتہ الحق، کہا کروں گا۔ نظام الملک نے توتوش سے کہا اسے استادوں کی سی عبا پہناؤ، تھوڑا سا پراسرار بننا سکھاؤ اور سب سے زیادہ اسے خاموش رہنا بتاؤ پھر اسے ملک شاہ کے حضور میں یہ کہہ کر پیش کرو کہ ''یہ ہے عمر خیام، جس نے ملاذگرد کی جنگ میں پیشین گوئی کی تھی..... خدا کی شان ہے کہ میں نے اسے دنیا میں ڈھونڈ نکالا، خدا میرے گناہ معاف کرے، یہ بات کتنی مناسب نظر آتی ہے۔''

نظام الملک جو کچھ سوچ رہا تھا بولا۔ ''آخر میں وہ بے لگام بچھیرے کی طرح عمل کر رہا تھا، لیکن ایک بار مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ہماری مخالفت کرے گا۔''

''نہیں نہیں۔ وہ لڑکا تو عشق میں مبتلا ہے..... جب اس کی محبوبہ اس کے پہلو میں نہیں ہوتی تو وہ اس کے تصور میں غرق رہتا ہے.....'' توتوش بولتے بولتے ایک دم رک گیا، کیونکہ نظام الملک نے اس کی گفتگو میں دلچسپی لینا ختم کر دی تھی، اس لئے کہ وہ اسلامی عقائد کا سختی سے پابند تھا۔

نظام الملک نے کہا۔ ''غالباً اس کی خفیہ طاقت خدا کی دین ہوگی۔ ایسے لوگوں کو یہ جانے بغیر کہ انہیں کس طرح علم ہوا حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔''

''درست ہے۔ درست ہے۔ اللہ غیب کا علم رکھتا ہے۔''

''میری سمجھ میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا کہ اس کی پیشین گوئی معجزہ تھی۔''

''صحیح ہے۔ بالکل درست ہے'' تو توش نے فوراً جواب دیا وہ معجزوں پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ اپنے ممتاز مربی کے ساتھ اپنے ان خیالات کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، البتہ وہ یہ سوچ کر تعجب کر رہا تھا کہ اگر حجتہ الحق یعنی عمر پیشین گوئیاں کرنا سیکھ لے اور اس کی پیشین گوئی درست ثابت ہو تو کیا نتیجہ ہوگا۔ پھر اس نے اپنے دل میں کہا کہ عمر خود یہ تسلیم کر چکا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اور اس وقت بوڑھا نظام الملک خود کو یہ باور کرا رہا ہے کہ ایسا ممکن ہے۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ.....

''.....میرا دماغ ان خالص ذہنی مسائل کو حل کرنے کے لیے نہیں بنا ہے۔''

تو توش نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جذامی فقیر کو کسی اور جگہ بھیجے گا اور عمر کے منارے میں ملازم رکھنے کیے کسی سمجھ دار شوہر اور بیوی کو جو معتبر جاسوس بن سکیں منتخب کرے گا۔

کتب فروشوں کی گلی میں چشمے پر یاسمین پانی کا گھڑا بھرنے کے بہانے آئی ہوئی تھی اور عمر بڑے اشتیاق کے عالم میں آہستہ سے اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ ''جان من۔ بالآخر میرے پاس تیرے رہنے کے لیے ایک مکان کا بندوبست ہو گیا ہے جس کا تنہا مالک میں ہی ہوں۔ تیرے ہونٹوں کے لیے جو شراب سے زیادہ رسیلے ہیں میرے پاس شراب ناب میں بھیگے ہوئے انگور اور تجھے کھلانے کے لیے ختائیاں موجود ہوں گی.....اور.....خدا کا شکر ہے کہ تو میرے پاس ہوگی۔''

یاسمین نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''لیکن وہ تو ویران جگہ ہے'' اور وہاں کھانا بھی تھوڑا ہی ہے، لیکن اس ویرانے میں بھی تو میرے قریب ہوگا تو میں اتنی خوش رہوں گی کہ سلطان بھی اپنے محل میں اتنا خوش نہ رہتا ہوگا۔''

آٹھواں باب:

رصد گاہ

تو توش نے اپنے وعدے کی پابندی کی۔ دوسرے روز مغرب سے پہلے اس نے عمر کو اس کی رصد گاہ کی چابیاں دے دیں۔ اور پھر کئی دن تک بڑھئی اور معمار اس منارے اور اس کی بیرونی دیوار کی مرمت کرنے میں مصروف رہے..... وہ دریا کے کنارے اینٹیں بناتے اور انہیں دھوپ میں سکھاتے تھے۔

عمر بہت خوش تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب یاسمین پہلی بار اس سے منارے میں ملنے آئے تو وہاں اور کوئی نہ ہو۔ اس نے مزدوروں کو منارے کی پہلی منزل کی دیواروں پر طلائی کرنے کا حکم دیا اور اس منزل میں ایک بڑی سی دری بچھا دی گویا اس کی رصد گاہ میں اس منزل کو ملاقات کے کمرے کی حیثیت حاصل ہوگی۔ دوسری منزل پر اس نے بہترین قالین بچھایا۔ اور ایک چینی پردہ جس پر ایک اژدھے کی تصویر بنی تھی دیوار پر لٹکا دیا۔ اس جگہ اس نے اپنا بستر بچھایا اور ایک کونے میں صندل کی لکڑی کا ایک منقش صندوق قرینے سے رکھ دیا۔ تیسری منزل کو اس نے خالی رکھا۔ بجز اس کے کہ وہاں کچھ کرسیاں اور چند خانہ دار میزیں، مسودے رکھنے کے لیے ڈال دیں۔ آلات پہنچنے کے بعد عمر کو اس منزل میں اپنا تحقیقی کام شروع کرنا تھا۔ تو توش عمر کے لیے بہت سی کتابیں بھی لایا تھا جو نظام الملک نے تحفتاً بھیجی تھیں، لیکن عمر نے اس پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اس کی ضرورت کی کتابیں اور آلات بغداد کے علاوہ اور کہیں نہ مل سکیں گے۔

عمر کو ابھی کوئی اور کام نہیں سوجھ رہا تھا۔ نظام الملک نے جو چاندی کے سکوں کا کیسہ اسے دیا تھا وہ اس رقم سے گھنٹوں نیشاپور کے بازار میں چیزیں خریدتا۔ اس نے سفید ریشمی کپڑا خریدا کیونکہ اس نے سوچا کہ جب بالآخر یاسمین اس کی بیوی بن جائے گی تو گھر کے اندر وہ سفید لباس پہنے گی، اس کے علاوہ چینی کے مرتبانوں میں بھرے ہوئے مربے، خوشبو کے لیے اگر اور اسے جلانے کے لیے پیتل کا ایک عود دان اور یاسمین کے لیے چاندی کے بازو بند بھی خریدے جن پر نہایت حسین نیلے رنگ کی مینا کاری تھی۔

''کتنے خوبصورت ہیں'' جب یہ تحفے عمر نے یاسمین کے سامنے رکھے تو وہ چونک کر بولی۔

عمر نے جواب دیا۔ ''تیرا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔''

یاسمین نے آہستہ سے تالی بجائی اور عمر کا ہاتھ اپنے بازو بند سے لگا دیا۔ وہ دم بخود تھی، اس نے فرش پر بچھے ہوئے گداز قالین کو بغور دیکھا..... کیونکہ خراساں میں ان چیزوں کا وجود اچنبھے کی بات تھی..... اس وقت بھی جب عمر اس کے نرم بالوں کو اپنے ہاتھ سے اس کی گردن پر سے ہٹا رہا تھا اور جب اس کی نبض تیزی سے چل رہی تھی یاسمین پردے پر اژدھے کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ فرط مسرت سے یاسمین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اس نے والہانہ انداز میں پوری عمارت اوپر تک دیکھی۔ یاسمین نے کہا۔ ''اوپر کی منزل میں تم نے اتنی بہت سی کتابیں کیوں جمع کر رکھی ہیں۔ یہ ساری کتابیں پڑھتے ہو؟

عمر نے بے توجہی سے جواب دیا۔ ''نہیں۔ بس ایک چھوٹی سی نظموں کی کتاب جو ایک ریگستانی باشندے نے لکھی ہے میں نے پڑھی ہے۔''

''نظموں کی کتاب!'' یاسمین نے متعجب ہو کر کہا۔ اس نے وہ منظوم کہانیاں سنی تھی جن میں شاعروں نے قدیم بادشاہوں کی لڑائیوں اور گھڑ دوڑوں کے قصے بیان کیے تھے۔ اس نے عمر سے پوچھا:

''کیا اس کتاب میں محبت کا بھی کوئی گیت ہے۔؟''

''اس میں تو محبت کا اتنا ذکر بھی نہیں جتنی وہ میرے دل کے ایک گوشے میں موجود ہے۔'' عمر نے یہ کہا اور یاسمین کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا سر اٹھایا حتیٰ کہ اس کی نظریں عمر کی نظروں سے چار ہو گئیں۔ اور ہر بار اس طرح نظریں چار کرنے کے بعد یاسمین کو عمر سے مل کر کچھ پریشانی سی ہوتی تھی۔

''چھوڑو بھی۔ مجھے شرم آ رہی ہے'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تو شیریں سے بھی زیادہ حسین ہے۔''

''کیا یہ بات اس کتاب میں لکھی ہے۔''

''واللہ! لکھی ہے۔ میرے دل کی کتاب میں لکھی ہے۔

''اور میرے دل کی کتاب میں کیا لکھا ہے؟'' یاسمین نے مسکرا کر کہا وہ عمر کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

''تیرے دل کی کتاب میں۔ جفا کاری اور میرے لیے نفرت۔ تیرا دل ایک پتھر ہے جسے عمر کی مصیبتوں کا ذرا بھی احساس نہیں!''

یاسمین سوچ رہی تھی کہ میرا محبوب روحانی طاقت رکھتا ہے۔ یقیناً اسے قدیم علوم کے راز معلوم ہیں اور وہ ان نظموں کو بھی پڑھ سکتا ہے جو قدیم شاعروں نے گائی تھیں۔ چنانچہ اس نے میرے اور صرف میرے لیے اس ویران منارے کو بہشت بنا دیا ہے لیکن جب تک عمر وہ عمر ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے، یہ سب باتیں فضول ہیں۔ وہ یہ سوچ کر مسرور ہوئی اور ایک سرد آہ بھر کر قالین پر لیٹ گئی۔ اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے وہ نیم باز سرمگیں آنکھوں سے عمر کو دیکھ کر بولی۔ ''سچ سچ بتاؤ۔ کیا میں واقع جفا کار ہوں؟ ہاں بتاؤ! کیا میں تم سے نفرت کرتی ہوں؟

عمر بے قابو ہو گیا۔ وہ یاسمین کے برابر لیٹ گیا۔ مدہوشی کے عالم میں وہ اس سے لپٹ گیا۔ اس کی رگوں میں عرب اجداد کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا جنہوں نے صدیوں تک گرم اور ویران ریگستانوں میں زندگی بسر کی تھی اور جو بنجر زمین اور گرگ صفت دشمنوں سے مقابلہ کرتے کرتے انتہائی حساس اور اس کے ساتھ فولادی عزم کے مالک بن گئے تھے۔ یاسمین کی محبت کا شدید جذبہ اسے دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔

یاسمین کے خیال میں اس محبوب منارے کا کوئی نام ہونا ضروری تھا۔ نیشاپور کے لوگ کہتے تھے کہ سامنے کے قبرستان سے مردے نکل کر اس منارے میں جمع ہوتے ہیں، لیکن اپنے محبوب کے ساتھ یاسمین ان آوارہ روحوں سے ذرا بھی نہ ڈرتی تھی۔ پھر بھی ایک قدیم روایت کے خیال سے اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ اس منارے کا کچھ نام ضرور ہونا چاہیے اور جب عمر اس کا کوئی نام تجویز کرتا تو وہ ہنس پڑتی۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ عمر کس وقت مذاق کرتا ہے۔

وہ کہتی ''نہیں۔ نہ یہ مسکن رحمت ہے نہ کسی حور کا قصر نگاریں۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ یہ ان میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ یہ.....''

''فرشتوں کا مسکن؟''

''بالکل نہیں'' یاسمین نے کہا۔ حالانکہ اسے دل میں یہ یقین تھا کہ وہاں کوئی نیک فرشتہ مقیم ہے، جس نے عمر کے اور اس کے دل میں محبت ڈال دی ہے۔ پھر بھی وہ یہ بات کہتے ڈرتی تھی۔ یاسمین نے کہا۔'' یہ ستاروں کا گھر ہے۔ بیت النجوم یقیناً ''میرے عمر! کیا تم ستاروں کا مطالعہ کر کے لوگوں کو یہ نہیں بتاتے کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے؟''

عمر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔''میں؟ کون کہتا ہے۔''

''ارے یہ تو شہر کے تمام بازاروں اور حماموں تک میں مشہور ہے کہ..... تم نے ہمارے سلطان ملک شاہ کی تخت نشینی کی پیشین گوئی کی تھی۔ کیا تمہیں خبر نہیں ہے.....؟''

یاسمین اس بات پر فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس کا محبوب بادشاہ تک کی قسمت کا حال بتا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ منارے میں بھی اس کا یہی کام ہونا چاہیے۔ یاسمین کے خیال میں فلکیات کی ابتدا اور انتہا زائچہ ترتیب دینا ہی تھی۔

عمر نے طوعاً و کرہاً یاسمین سے اس بات کا اقرار کر لیا کہ وہ پیشین گوئی کرنا جانتا ہے۔

یاسمین بولی۔''تب تو یہ بات صحیح ہے، اور جلد ہی، غالباً آئندہ مہینے کے آخر

تک تمہیں ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے آلات اور مزید رقم مل جائے گی پھر تم میرے باپ کے پاس ایک شہرت یافتہ شخص کی حیثیت سے میرے مہر کی رقم لے کر پہنچو گے اور پھر ہم دونوں کا عقد ہو جائے گا۔''

عمر چونک کر سوچنے لگا کہ اس نے سارا روپیہ یاسمین کے لیے ضرورت کی چیزیں خریدنے پر صرف کر دیا۔ اور وہ چیزیں خریدتے وقت اس کے ذہن میں کسی اور بات کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ عمر نے کہا۔''ہاں ہاں۔ بہت جلد..... لیکن میرے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی جو تمہارے مہر کے لیے کافی ہو.....؟''

یاسمین چمک کر بولی۔''بیوقوف ہو تم، اگر تم وزیر اعظم نظام الملک کے نجومی ہو تو میرے گھر والے تم سے ادائے مہر پر زیادہ اصرار نہ کریں گے۔ میری خواہش ہے..... میں چاہتی ہوں کہ یہ بات طے ہو جاتی اور میں تمہارے گھر میں رہتی اور مجھے پھر کبھی باہر نہ جانا پڑتا۔'' وہ متفکر سی ہو کر بولی۔''جب تک ایسا نہ ہوگا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔''

عمر بولا۔''پھر یہیں ٹھہر جاؤ نا۔''

یاسمین کے ہونٹ کانپنے لگے اس نے جواب دیا۔'' یہ میں کیسے کر سکتی ہوں شادی کے بغیر عورت کسی کے ساتھ چلی جاتی ہے تو اسے لوگ بدکردار عورت کہتے ہیں، اور یہ بری بات ہے۔ میں شاید..... بے انتہا مسرور ہوں اور اب میں مسجد میں اللہ تعالیٰ سے رحم کی التجا کروں گی کیونکہ میں نے اس مسرت کے سوا آج تک کسی اور خوشی کا خیال نہیں کیا۔''

اس وقت اس سبزہ زار پر جس کی ڈھلان قبرستان میں سرو کے جھنڈ تک پہنچتی تھی صبح کے سورج کی سنہری کرنیں بہت حسین معلوم ہو رہی تھیں عمر کو اپنے کمرے کے ہر گوشے سے یاسمین کے معطر جسم کی خوشبو آ رہی تھی..... یاسمین دوسرے روز نہ آئی تو وہ بے چینی دور کرنے کے لیے اپنی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس نے نظم کی کتاب کی وہ رباعیاں پڑھنا شروع کر دیں جو کتاب کے صفحات پر اس طرح منتشر تھیں جیسے سبزے پر پھول بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں ایک خالی صفحہ پر اس نے اپنے کہے ہوئے اشعار لکھے۔ اس نے ایک رباعی کہی۔

در فصل بہار اگر بتے حور سرشت
یک ساغر مے دہد مرا بر لب کشت
ہر چند بہ نزد عام ایں باشد زشت
سنگ بہ زمن است اگر برم نام بہشت

عمر نے سوچا کہ یاسمین یہ رباعی سن کر خوش ہوگئی جو صرف اس کے لیے کہی گئی ہے۔ وہ خوشی سے مسکرائے گی اور اس رباعی کو بعد میں پڑھنے کے لیے جب وہ اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے گی تو اس کی آنکھوں میں کتنی چمک پیدا ہوگی۔ پھر بھی عمر کو احساس تھا کہ یہ رباعی اچھی نہیں ہے۔ اس نے ان اشعار میں محبت کا تو کوئی حسین نغمہ لکھا نہیں ہے، محض اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

لیکن یاسمین دوسرے روز بھی نہ آئی اور نہ اس سے اگلے دن۔

عمر روزانہ گھنٹوں چنار کے درخت کے نیچے چشمے پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ مسجد کے احاطے میں بیٹھ کر ہر اس برقع پوش عورت کو جو وہاں آتی یا باہر جاتی، دیکھتا، لیکن ان میں اسے یاسمین دکھائی نہ دی۔

سہ پہر کے وقت وہ تیز تیز قدموں سے اپنے منارے واپس جاتا اور اسے اپنے دل میں یقین ہوتا کہ وہ ضرور وہاں اس کا انتظار کرتی ہوگی لیکن اسے سب کمرے خالی ملتے۔ پھر وہ سوچتا کہ یاسمین بیمار ہوگئی ہوگی اور غالباً اتنی بیمار ہوگئی کہ کوئی پیغام بھی نہ بھیج سکی۔ اب عمر کو اس بات پر افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے توتوش کے فراہم کردہ ملازموں کی خدمات کیوں قبول نہ کیں کیونکہ اب اس کی نظر میں کوئی ایسی عورت نہ تھی جسے وہ کتب فروش کے مکان پر بھیجے اور یاسمین کی خیریت منگوائے اور اگر وہ کوئی خط دے تو لے آئے۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے عمر بازار سے گزر رہا تھا کہ اسے وہی چیچک رو فقیر ملا جو کتب فروشوں کی گلی میں پھرا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ یہ فقیر اس کی نظر بچا کر جلدی سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔

عمر نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا۔ ''بتا، کیا تو نے اسے دیکھا ہے جو مجھ سے

چشمے پر باتیں کیا کرتی تھی؟''

فقیر نے اپنی سرخ پپوٹوں والی آنکھوں سے عمر کو بغور دیکھا اور جواب دیا ''میرے نوجوان آقا۔ اپنے سر کی قسم میں نے اسے نہیں دیکھا وہ جا چکی ہے۔''

عمر نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھا۔ ''جا چکی ہے؟ لیکن کہاں؟'' اس فقیر نے جسے چہروں کا مطالعہ کرنے میں مہارت تھی۔ دیکھا کہ نگرانی کے صلے میں اس نے اب تک جو کچھ کمایا ہے اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ کمانے کا موقع ہے۔ اس نے عمر کی آستیں پکڑ کر دھیرے سے کہا۔ ''شی! میں نے سنا ہے..... لیکن میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں اور مجھے پیسوں کی ضرورت ہے.....''

اضطراری حالت میں عمر کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھا لیکن جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ وہ بے چین ہوگیا اور فقیر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اس سود خور کی دکان کی طرف چل دیا جس سے وہ طالب علمی کے زمانہ میں قرض لیا کرتا تھا۔ یہ سود خور بخارا کا رہنے والا تھا جو اپنی دکان پر سکوں کا انبار لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ جن میں یونانی سکے، بغداد کے درہم اور تانبے کے ہر شکل کے پیسے ہوتے تھے۔ اس انبار میں بعض سکے مربع شکل کے، بعض سوراخ دار اور کچھ ہاروں کی شکل میں پروئے ہوئے بھی ہوتے تھے۔

عمر نے سود خور سے کہا۔ ''ناصر بیگ مجھے ایک مہینے کے لیے ایک دینار قرض دے دو۔''

سود خور نے ایک بھاری سی تھیلی ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہر ماہ چاندی کا ایک درہم سود لگے گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے لیکن جلدی کرو'' عمر نے دینار لیا اور پھر فقیر کو ہجوم سے ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ''تجھے کیا معلوم ہوا ہے؟ سچ بولنا اور سچی بات ہی بتانا۔''

''اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے میرا سر قلم ہو جائے۔ چار دن ہوئے انہوں نے تمہاری محبوبہ کو گھر سے باہر گھومنے کی پاداش میں مارا پیٹا۔ میں نے یہ بات چشمے پر دوسری معمر عورتوں کی زبانی سنی ہے۔ اب اس لڑکی کا چچا گھر کا مالک ہوگیا ہے

ہاں۔ شیشے کے مکان کے لیے ایک پتھر کافی ہوتا ہے۔ اس کا چچا بہت ناراض تھا۔ پھر دوسرے روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ابوزید کپڑے کے تاجر کی طرف سے اس لڑکی کا دوسرا پیام آیا۔ اور چچا نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا۔"

عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

فقیر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بخدا! انہوں نے ابوزید کو اپنے گھر بلوایا، قاضی اور گواہوں کو طلب کیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے ان سب کو آتے دیکھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آئے اور انہوں نے شادی کا کھانا کھایا۔ تھوڑا سا کھانا انہوں نے مجھے بھی دیا۔"

"اور وہ..... اس کا کیا ہوا؟"

فقیر نے جواب دیا۔ "میں نے ایک فراش کو دوسرے سے یہ کہتے سنا تھا کہ وہ شادی سے پہلے رات بھر روتی رہی اور دو آدمی اسے پکڑ کر لائے تھے۔ شاید وہ بھاگ گئی ہو گی۔ شاید وہ خوف زدہ تھی۔ کم سن لڑکیاں ضدی اور جاہل ہوتی ہیں، لیکن ابوزید نے معقول مہر دیا ہے کیونکہ اس نے یاسمین کے حسن کی شہرت سنی تھی۔ ابوزید تاجر ہے اور اس کے قافلے میں بہت سے خیمے ہیں....."

یہ سب کچھ سن کر عمر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ فقیر عمر کو تعجب کی نظروں سے دیکھ رہا تھا، کیونکہ عمر لڑکھڑاتا ہوا لوگوں کو اس طرح ہٹا ہٹا کر آگے بڑھ رہا تھا جیسے وہ اندھا ہو گیا ہو۔ چیچک رو فقیر نے دینار ہاتھ میں لے کر دیکھا اور پھر اسے پتھر پر بجایا۔ دینار کھرا تھا۔ فقیر نے اطمینان کا سانس لیا اور اسے اپنے چاندی کے سکوں کے ساتھ رکھ لیا جو اس نے آج سے تین روز قبل یاسمین کے چچا سے یہ اطلاع دینے کے صلہ میں حاصل کیے تھے کہ یاسمین قبرستان والے منارے میں کسی اجنبی نوجوان سے ملنے جایا کرتی ہے۔

فقیر نے سوچا تھا کہ وہ عمر یا ابوزید کے مقابلے میں یاسمین کے چچا سے زیادہ رقم وصول کر سکتا ہے۔ فقیر سے یہ اطلاع پانے کے بعد یاسمین کا چچا اس پر کڑی نگرانی رکھنے لگا اور اس نے جلد ہی کپڑے کے تاجر ابوزید کو بلوا بھیجا۔

لیکن اب عمر نے فقیر کو حیرت انگیز حد تک مالا مال کر دیا تھا فقیر سونے کا دینار لے کر ٹہلتا ہوا سود خور کی دکان پر گیا اور اس سے بولا۔ "ارے تو نے یہ کیا حماقت کی کہ اس لاوارث طالب علم کو جو سڑکوں پر آوارہ پھرا کرتا ہے قرض دے دیا۔"

بخارا کے اس سود خور نے جلدی سے اپنے سکوں کے ڈھیر کے گرد اپنے ہاتھوں سے حلقہ بنا لیا اور اپنی جیب سے چاقو نکالتے ہوئے بولا۔ "چوروں کے استاد۔ ذرا ہٹ کر کھڑا ہو۔ تیرے چرانے کے لیے یہاں کوئی سکہ نہیں ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ نظام الملک نے اسی طالب علم کو اپنی عنایات سے نوازا ہے؟"

"ارے خیام کو؟" فقیر نے ایسے مغموم لہجے میں کہا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ کاش وہ پہلے سے یہ جانتا، تو محض اس کا راز افشا کر دینے کی دھمکی ہی دے کر اس سے دگنی رقم وصول کر لیتا۔ کاش اسے یہ علم ہوتا!

عمر کے دل کی رصد گاہ منہدم ہو چکی تھی۔ اس کی تمناؤں کے آسمان پر کوئی ستارہ نہیں تھا۔ اسے ہر طرف تاریکی نظر آ رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ کتب فروشوں کی گلی اور چشمے پر گیا اور یاسمین کے چچا سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ ایک اجنبی شخص گھر میں سے نکلا اور آتے ہی اس پر بگڑنے لگا۔ عمر نے دیکھا کہ یاسمین کا بوڑھا باپ جو بہت دبلا اور زرد ہو چکا تھا دکان کے اندر کتابوں کے انبار میں چھپا بیٹھا ہے۔

یاسمین کے چچا نے عمر سے کہا۔ "کیا تو پاگل ہے کہ کھلے بندوں ہماری مستورات کا ذکر کر رہا ہے؟ اور کیا اس گھر کی خواتین جانور ہیں جو تو اس طرح ان کے نام لے رہا ہے؟"

گھر کی عورتیں بھی سیخ پا ہو رہی تھیں ایک عورت پردے کے پیچھے سے چیخی۔ "اس سے کہو ذرا ہوش میں آئے۔ اس چور کو جسے ذرا بھی شرم نہیں! خدا کی قسم تعجب ہوتا ہے کبھی کسی چور کو یہ جرات ہوئی ہے کہ جہاں اس نے چوری کی ہو وہاں واپس جائے اور شور و واویلا مچائے؟ اس کی جوتوں سے خبر لو اور باندھ کر خوب مارو۔ ارے گیدی! جہنمی باپ کی اولاد!"

لیکن گھر کے مرد اتنے پاگل نہ تھے کہ وہ خیام پر، جنون و دیوانگی کے اس عالم

میں ہاتھ ڈالتے۔ ادھر عورتیں بے تحاشا چیختی رہیں یہاں تک کہ عمران کی ڈانٹ پھٹکار سے عاجز آ کر وہاں سے نکل آیا..... کئی گھنٹے کے بعد عمر نے ایک جوہری کی دکان پر توتوش کو دیکھا۔ وہ بیٹھا ہوا ایک نیلم دیکھ رہا تھا۔ عمر نے بے ربط جملوں میں اسے اپنا پورا قصہ سنایا اور جاسوسوں کا وہ سرغنہ غور سے اس کی کہانی سنتا اور یہ ظاہر کرتا رہا جیسے اس کی توجہ نیلم کی طرف ہے۔

عمر کی بپتا سن کر توتوش نے سوچا کہ اگر وہ لڑکی کوئی طوائف یا کنیز ہوتی تو وہ اپنے اثر سے کام لے کر اس کا پتہ چلاتا اور اسے عمر کے حوالے کر دیتا۔ لیکن وہ ایک مسلمان کے حرم میں داخل ہو چکی تھی اور اپنے شوہر کی ملکیت تھی۔ توتوش جانتا تھا کہ نظام الملک مستورات کے معاملے میں مداخلت کرنا پسند نہ کرے گا..... کیونکہ اسلامی قانون کے مطابق خواتین کو پردے میں رہنا چاہیے اور اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے۔ اور پھر عمر پر یاسمین کی محبت کا جنون سوار تھا اور توتوش یہ نہیں چاہتا تھا کہ جس شخص کی وہ سرپرستی کر رہا ہے اس کے بارے میں نظام الملک سنے کہ وہ ایک عورت کے لیے ہوش و خرد کھو رہا ہے۔ اگر بہت سی عورتوں کا اثر ہوتا تو بہتر تھا، کیونکہ وہ خبر رسانی کرنے اور ترغیب دلانے کا بھی عمدہ ذریعہ ہو سکتی ہیں، لیکن ایک عورت کا اثر..... اور خاص طور سے یاسمین جیسی نوعمر لڑکی کا جسے وہ محبت میں سرشار سمجھتا تھا، خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ توتوش نے اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ مداخلت نہیں کرے گا اور اس نے عمر کی باتوں پر محض رنج و ہمدردی کا اظہار کرنے پر اکتفا کیا.....

توتوش نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ ایسا واقعہ ہوا۔ کاش تم میرے پاس پہلے چلے آتے..... کیونکہ گواہوں کی موجودگی میں نکاح کے بعد عورت آہنی زنجیر میں جکڑی جاتی ہے۔ اس زنجیر کو کون توڑ سکتا ہے؟ اچھا ہم مل کر اس معاملے پر غور کریں گے اور میں یہ بندوبست کروں گا کہ.....''

''لیکن آپ اس کا پتہ لگا سکتے ہیں۔؟''

یقیناً ایسا ہو سکتا ہے لیکن میں پچھلے ماہ اس سے نکاح کا پیام بھیج سکتا تھا.....

توتوش نے ایک آہ بھر کر اور سر کے اشارے سے پھر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یقین نہیں آتا، لیکن قسمت کے آگے کس کی پیش جاتی ہے؟''

''تم پتہ لگاؤ کہ وہ کہاں ہے!۔''

''یقیناً فوراً پتہ لگاؤں گا اور آج رات ہی کو میں اپنے آدمی شہر کی مختلف سراؤں میں بھیجتا ہوں۔ کل صبح وہ تمہیں اس کا پتہ بتا دیں گے۔ اس وقت تک تم میرے پاس ٹھہرو۔''

دوسرے روز صبح کو توتوش کے جاسوس یہ خبر لے کر آئے کہ مشہد کا کپڑے والا ابوزید نہ تو قافلے کے ساتھ ہے اور نہ وہ نیشاپور میں موجود ہے بلکہ اپنی نئی بیوی اور چند غلاموں کے ہمراہ وہ اس شہر سے چلا گیا ہے مگر یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ شمال، جنوب، مشرق، مغرب میں سے کون سی سمت روانہ ہوا ہے۔ شہر سے بہت سی سڑکیں جاتی ہیں اور ہزاروں تاجر ہیں، لیکن یقیناً ابوزید واپس آ جائے گا، اور اس دوران میں وہ شہر کے ہر دروازے پر نگرانی رکھیں گے۔

توتوش کو توقع تھی کہ عمر اس خبر سے مطمئن ہو جائے گا، لیکن عمر پر تو جنون سوار تھا۔ خیام اپنی پرانی بھورے رنگ کی عبا پہن کر خود بازار گیا۔ وہ شہر کی ہر سرائے میں اونٹ والوں سے ابوزید کا پتہ پوچھتا پھرا اور پھر وہاں سے ایسا غائب ہوا کہ توتوش کے جاسوس بھی اس کا پتہ نہ لگا سکے، حالانکہ انہوں نے ابوزید کے مقابلے میں اسے زیادہ تن دہی سے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

خیام ایک قافلہ کے ہمراہ آوارہ پھرتا رہا۔ اس کے دن رات بے چینی سے گذر رہے تھے صبح تڑکے ہی اٹھ بیٹھتا۔ جب اونٹوں کو بٹھا کر ان پر سامان لادا جاتا اور اونٹ بلبلاتے تو عمر خیام ہر سرائے میں تاجروں کو دیکھتا پھرتا۔ وہ ان میں سے ہر تاجر سے مشہد کے تاجر ابوزید کا پتہ پوچھتا..... قافلے کی روانگی کے وقت جو ہنگامہ برپا ہوتا اور اس وقت سرائے میں جو گرد و غبار اڑتا عمر اس سے بے نیاز تاجروں سے سوالات کرتا پھرتا۔

عمر کے دماغ پر ایک جنون طاری تھا وہ مشہد کے ہر مسافر خانے اور سرائے میں گیا یہاں تک کہ امام رضا کے روضے پر بھی جہاں زائرین جمع ہوتے ہیں وہ ابوزید کو تلاش کرنے گیا۔

وہ عرصے تک سبزوار کے ستون کے پاس اور بوستان کی کارواں سرائے میں مقیم رہا۔ ایک مرتبہ وہی کسی ابوزید کے پیچھے شمال میں پہاڑوں تک گیا جہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ یہ شخص بخارا کا قالین فروش ہے۔"

کرب اور بے چینی عمر کو سونے نہ دیتی تھی۔ ہاں جب لدے ہوئے اونٹوں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلتا تو اسے سکون محسوس ہوتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یاسمین تکلیف میں ہوگی اور غالباً بخار کے پسینے سے اس کے سیاہ بالوں کی لٹیں الجھ گئی ہوں گی۔ یاسمین کو ایک کنیز کی طرح فروخت کر دیا گیا تھا اور وہ کنیز ہی کی طرح نیشا پور سے باہر لے جائی گئی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اسے مارا تھا۔ اسے برا بھلا کہا تھا اور اب وہ انہی سڑکوں میں سے کسی سڑک پر کہیں نہ کہیں رواں دواں قافلے میں موجود ہوگی۔

کئی ہفتے گزر گئے، موسم بہار میں جو پانی میدانوں میں نظر آتا تھا وہ دھوپ سے خشک ہو گیا تھا۔ آفتاب کی تمازت سے نرم مٹی لوہے کی طرح سخت ہو گئی تھی اور چشمے

کے کنارے کے سوا ہر جگہ ہریالی سوکھتی جا رہی تھی۔

ذہنی کرب کے باوجود عمر کو یہ خیال گزرا کہ اسے چشمے کے کنارے سبزہ زار اور پھولوں کے ان پودوں پر نہ چلنا چاہیے جو سوکھے سے بچ گئے ہیں۔ اس کے ذہن میں سوسن اور چنبیلی کے ان پھولوں کا یاسمین اور دریائے نیشا پور کے ساحلی سبزہ زار سے گہرا تعلق تھا۔ ایک درویش نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یقیناً اس شخص پر اللہ نے عذاب نازل کیا ہے۔"

سفر اور گرمی کی شدت سے عمر کو بخار آ گیا اور وہ دو ہفتے تک بیمار پڑا رہا۔ جب بخار اترا تو وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ سفر کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ ایک نیک دل مشہدی مسافر نے اسے اپنے گدھے پر بٹھا کر وطن پہنچانے کی پیش کش کی۔

عمر کے حواس اب درست ہو رہے تھے اور اب وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس طرح اس کا جگہ جگہ مارے مارے پھرنا بے سود ہے وہ محسوس کر رہا تھا کہ یوں آوارہ پھر کر وہ اس درد سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کے سینے میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ اور اب تک یقیناً یاسمین کی جانب سے یا تو کوئی پیغام منارے پر پہنچ چکا ہوگا یا تو توش کے جاسوسوں نے اس کا کچھ پتہ لگا لیا ہوگا۔ وہاں سے اس طرح چلے آنا بیوقوفی تھی، لیکن سردست وہ اتنا کمزور تھا کہ پیدل نہیں چل سکتا تھا۔

ایک روز سہ پہر کو جب قافلہ قبرستان والی سڑک پر پہنچ گیا تو عمر گدھے سے اتر کر اس کے مشہدی مالک سے رخصت ہوا۔ وہ رصدگاہ جانے والی پہاڑی پگڈنڈی پر چڑھا اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ منارے میں کوئی بھی نہ ہوگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ چار دیواری کے اندر نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں اور دو غلام اس باغیچے کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں جو حال ہی میں لگایا گیا تھا۔ رصدگاہ کی فصیل کے اوپر پیتل کے آلات دھوپ میں چمک رہے تھے۔

نواں باب:

شاہی منجم

رصد گاہ کے قریب پہاڑی پر ایک لکڑی کا مینار بنا دیا گیا تھا۔ عمر اس لکڑی کو جس کی بنیاد کے قریب مٹی کے اوپر دائرہ کھینچا گیا تھا۔ دیکھنے کے لیے رکا۔ اتنے میں ایک باریش غلام آیا اور اس کے قریب ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ ''حضور! آپ کا آنا مبارک ہو۔ ہم نے اس جگہ کو ٹھیک کرنے میں سخت محنت کی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھ کر خوش ہوئے؟'' لیکن غلام کو اس دبلے پتلے اور گرد آلود جوان کو دیکھ کر جو پھٹی ہوئی عبا پہنے تھا انتہائی تعجب ہو رہا تھا۔

عمر نے جواب دیا۔ ''ہاں'' پھر وہ اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں ہر چیز جوں کی توں تھی۔ پردے پر اژدھے کی تصویر اب بھی موجود تھی۔ بچھونے کے اوپر تکیے صفائی سے لگے ہوئے تھے۔ اس نے غلام سے پوچھا'' بتاؤ کسی نے میرے لیے کوئی پیام یا نشانی تو نہیں بھیجی؟''

غلام نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ ''حضور! روزانہ آقائے تو توش لی جانب سے پیام آتا تھا اور وہ یہ دریافت کرتے تھے کہ آیا آپ واپس آ گئے ہیں یا نہیں۔ ابھی میں نے لڑکے کو یہ پیام دے کر نیشا پور بھیجا ہے کہ آپ تشریف لے آئے ہیں۔''

''کوئی اور قاصد تو میرے لئے نہیں آیا؟'' کوئی خط بھی نہیں؟'' عمر نے غلام سے پوچھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یاسمین لکھنا تو نہیں جانتی پھر بھی ممکن ہے اس نے بازار

میں کسی خط لکھنے والے منشی سے کچھ لکھوا کر بھیجا ہو۔

''جی نہیں! نہ کوئی پیام نہ کوئی خط'' غلام نے جواب دیا۔ عمر دیوان خانے میں کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور غلام چاندی کے برتن میں پانی لا کر اس کے پاؤں دھونے لگا۔ اتنے میں ایک سفید ریش شخص پر تپاک انداز میں سلام کر کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے عمر سے کہا۔ کہ میرا نام میمون ابن نجیب الواسطی ہے اور میں نظامیہ بغداد کا فارغ التحصیل ریاضی دان ہوں۔ نظامیہ بغداد وہ تحقیقی ادارہ تھا جسے نظام الملک نے اپنے اہتمام سے قائم کیا تھا۔ میمون بڑی متعجب نظروں سے عمر کو دیکھ رہا تھا جو خاموش بیٹھا تھا۔ میمون نے خشک لہجے میں اسے اپنی آمد کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ میں اپنے ساتھ افلاطون کا ستاروں کا ترمیم شدہ نقشہ اور نظام الملک کے حکم سے پیتل کا وہ کرہ لایا ہوں جو خود بوعلی سینا استعمال کرتا تھا۔''

''اچھا'' عمر نے بے توجہی سے جواب دیا۔ تپتے ہوئے میدانوں کی دھوپ اور تپش کے بعد اسے یہاں پہنچ کر اس خشک آواز کے علاوہ سکون اور خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔

بڑبڑاتے ہوئے خواجہ میمون اٹھا پھر اس تیزی سے جیسے کوئی سارس کسی بے خبر کچھوے پر جھپٹتا ہے، کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب خاصی رات ہو گئی تو عمر مینار کی چوٹی پر گیا۔ بوڑھے ریاضی دان سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بھی اس جگہ پہنچ گیا۔ اس انداز سے جیسے اسے خاموش عمر کی کوئی پروا نہ تھی میمون نے گلوب کے پائدان میں لگے ہوئے چار چراغوں کو روشن کیا اور پھر کرہ پر چھتریاں اس طرح لگائیں کہ چراغوں کی صاف اور طوشگوار روشنی اس بڑے کرہ کے نصف بالائی حصے پر پڑنے لگی۔ عمر چلتے چلتے رک گیا اور اس کی نگاہیں چمکتے ہوئے پیتل پر ٹھہر گئیں وہ اس کے اور قریب آ کر اسے دیکھنے لگا۔ ستاروں کے نشان کے گرد چھوٹے چھوٹے راستوں کی بے شمار لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ لکیریں بہت مہین تھیں اور صرف کہیں کہیں جہاں ستاروں کا گچھا بنا ہوا تھا ایک آدھ لفظ ان باریک لکیروں پر کندہ تھا، اس کرہ پر بہت سے لوگوں نے محنت کی ہو گی، کیونکہ جہاں جہاں اس پر نئی لکیریں پرانے خطوط کو کاٹتی تھیں وہ حصے صاف طور سے نمایاں تھے۔ عمر نے اس جگہ کو دیکھا جہاں دم دار ستارے کا آخری حصہ قطب ستارے

سے علیحدہ ہوتا تھا..... اس نے افق کا دائیں سے بائیں کو جائزہ لے کر کرہ پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ اسے گھمایا یہاں تک کہ اس کی حیثیت وہی ہوگئی جو اس وقت آسمان پر ستاروں کی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے افق کے حلقے کو ٹٹولنے لگا۔

''یہ اس طرح لگایا جاتا ہے اور اسے اس طریقے سے بند کیا جاتا ہے۔'' میمون نے اپنی خشک آواز میں کہا۔

''ہاں۔ ہاں'' عمر نے جواب دیا۔ بالآخر اس کے پاس وہ گرانقدر خزانہ آ گیا تھا جس پر اساتذہ نے ریاض کیا تھا۔ اور اس کے پہلو میں بغداد کا ایک ریاضی دان سنتری کی طرح پہرا دینے کو موجود تھا اس کے سامنے وہ چیز رکھی جو بوعلی سینا کے مسلسل مشاہدے کا نتیجہ تھی۔ لیکن عمر کو اس بات پر کوئی فخر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

جب توتوش اگلے دن اس سے ملنے آیا تو وہ اسے دیکھ کر بولا۔ ''ارے، خدا کی قسم! تم تو ایسے سنیاسی معلوم ہو رہے ہو جو جنگل بیابانوں سے نکل کر آیا ہو۔ ہم نے تمہیں کہاں کہاں تلاش کیا! تم نظام الملک کو کیا جواب دو گے اور اس کے غصے کو کس طرح ٹھنڈا کرو گے؟ خیر کوئی بات نہیں..... اب جبکہ تم واپس آ گئے ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

عمر نے پوچھا۔ ''میری غیر موجودگی میں یاسمین کی طرف سے کوئی پیام یا نشانی تو نہیں پہنچی۔؟''

مخبروں کے سربراہ نے ہمدردی سے کہا۔ ''اچھا اس لڑکی کی طرف سے؟ نہیں میرے خیال میں کوئی نہیں۔ میں نے تو کچھ سنا نہیں۔''

''لیکن تمہارے آدمیوں کو تو اس کی خبر ملی ہوگی؟''

اپنے ہونٹ سکیڑ کر توتوش نے اظہار افسوس کرتے ہوئے سر ہلا کر انکار کیا۔ وہ بولا۔ ''میرے آدمیوں نے باز کی طرح جستجو کی لیکن انہیں کچھ پتہ نہیں چلا کیا ہوا، بازار میں اور لڑکیاں ملتی ہیں نوخیز اور ایرانی بلبلیں، اور سمرقند کے رستے آنے والی چینی کنیزیں جو بہت ہی سلیقہ مند اور نہایت ہوشیار ہوتی ہیں، لیکن نظام الملک ناراض ہے۔ ہمیں اسے دکھانے کے لیے کچھ کام کرنا چاہیے..... اس کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی منصوبہ ہونا چاہیے.....''

عمر خاموش تھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں کسی منصوبے کا خیال نہ تھا۔

''نوجوان خواجہ! سوچو۔ اس منصوبے کو یاد کرو جو تم ایوان دانش سے لے کر چلے تھے۔ اگر تمہیں سرپرست مل جاتا تو اس وقت تمہارے ذہن میں کیا کام کرنے کا خیال تھا؟''

''میں ایک نئی تقویم بنانا چاہتا تھا۔''

''کیا؟''

''وقت ناپنے کا صحیح پیمانہ، جس میں گھنٹے نہ ضائع ہوں۔''

توتوش نے عمر کو تشویش ناک نظر سے دیکھا۔ غلاموں نے اسے اطلاع دی تھی کہ ہمارے نئے آقا کی حرکات وسکنات بہت عجیب ہیں اس نے مسکرا کر عمر سے کہا۔ ''ہماری حالت پر رحم کرو۔ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے چاند بنایا ہے جب وہ پہلی بار نمودار ہوتا ہے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ اب نیا مہینہ شروع ہو گیا۔ یقیناً کوئی فانی بندہ ایسا آلہ نہیں بنا سکتا جو ہمیں چاند سے زیادہ صحیح وقت بتا سکے۔

ہاں تو پھر؟'' عمر نے غصے سے بے چین ہو کر کہا۔ ''مصریوں نے بھی ایسا آلہ بنایا ہے۔ عیسائیوں نے بھی بنایا ہے لیکن تم نے جو یہاں یہ لکڑی کا چھوٹا سا تختہ لگایا ہے یہ تو بچوں کے کھیلنے کا کام آ سکتا ہے۔ ذرا آ کر دیکھو تو۔ پیچھے پیچھے خواجہ میمون اور آگے وہ دونوں اس لکڑی کے ڈنڈے کو دیکھنے گئے۔ توتوش نے شاہی نجاروں کی مدد سے اس ڈنڈے کو اپنی نگرانی میں بڑی محنت سے وہاں لگوایا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ڈنڈا نیچے لگی ہوئی چکنی مٹی پر بہت صاف اور حسین سایہ ڈالتا تھا، لیکن عمر کے دل میں جو ریگستان کی سڑکیں طے کر کے آیا تھا اس وقت غصے سے آگ لگی ہوئی تھی وہ چیخ کر بولا۔ ''یہ ڈنڈا تو ہوا کے جھونکوں سے جھکتا اور دھوپ سے خراب ہو جاتا ہے، کیا ہم بچوں کی طرح گھروندے بنا رہے ہیں؟ ہمیں تو وہ چیز چاہیے جو کافروں کے پاس تھی۔ آدمی کے قد سے پانچ گنا اونچا سنگ مرمر کا مینار جس کا پہلو اور جس کی چوٹی ناخن کے برابر باریک ہو پھر اس کی بنیادیں مٹی اور سنگ مرمر کا پختہ فرش ہو جس پر اس کے سائے سے مثلث کی شکل بنے۔ فرش کے پتھر چکنے صاف اور تانبے کی ٹانگوں سے جڑے ہوئے ہوں اور ان کی سطح پانی کی طرح ہموار ہو۔ اچھا تم کاریگروں کو میرے پاس بھیج دو۔ میں انہیں بتا

دوں گا کہ کیا کام کرنا ہے۔"

توتوش نے آہستہ سے جواب دیا۔"پہلے مجھے نظام الملک کی منظوری لینا چاہیے۔ایسا مینار بنانا تو میرے خیال میں کافروں کا مندر بنانا ہوا....."

"سورج کے سائے میں روزانہ جو بال برابر فرق ہوتا ہے، اس کو ناپنے کا واحد طریقہ یہی ہے۔"

"بال برابر" توتوش نے اپنی پگڑی سنبھالتے ہوئے کہا اور خواجہ میمون کو ایک طرف لے جا کر آہستہ سے اس کے کان میں کہنے لگا۔"تمہارا کیا خیال ہے، کہیں عمر کا دماغی توازن تو نہیں بگڑ گیا۔؟"

"وہ اپنے ہوش وحواس میں ہو یا نہ ہو، اس کا تو مجھے علم نہیں، لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ وہ حساب لگانے کے معاملے میں احمق نہیں ہے" خواجہ میمون نے یہ الفاظ اس طرح مسکرا کر کہے کہ اس کی داڑھی کے بال ہلنے لگے۔ پھر وہ بولا۔"جس قسم کا ستون عمر چاہتا ہے وہ یقیناً صحیح ہوگا۔ اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر وہ صحت کے ساتھ بنایا گیا تو اتنا ہی درست اور صحیح ہوگا جتنا وہ سامنے رکھا ہوا بوعلی سینا کا عظیم کرہ ہے....."

توتوش نے یہ قصہ جو اس کی سمجھ سے باہر تھا نظام الملک کو سنایا عمر کے غائب ہو جانے سے خود نظام الملک کے منصوبوں میں خلل پڑ گیا تھا، وہ توتوش کے بیان کو بے توجہی سے سنتا رہا، پھر توتوش نے اسے بتایا کہ وقت کو ناپنے کے متعلق عمر کی تجویز کو خواجہ میمون نے بھی منظور کیا ہے۔

وزیر اعظم نظام الملک نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا۔"وقت کا گوشوارہ بنانا تو ہماری روایات کے منافی ہے..... اور علماء اس کے مخالفت کریں گے۔ عیسائیوں کے پاس رومی عہد سے ایک تقویم آ رہی ہے۔ ساسانیوں کا بھی سال مقرر ہے اور ہم ایرانیوں کے پاس بھی فتح اسلام سے قبل یزدگردی سنہ موجود تھا۔ میرا خیال ..... میرا خیال ہے کہ گوشوارے کا بنانا خطرناک ہوگا۔"

توتوش نے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی۔"پہلے تو عمر مجھ سے یہ کہتا ہے کہ وقت صرف ایک ہوتا ہے اور اب نظام الملک یہ کہہ رہے ہیں کہ وقت چار

مختلف قسم کا ہوتا ہے۔ خدا میری عقل پر رحم کرے۔"

نظام الملک نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔"چار تقویمیں ہیں۔ اور ملک شاہ اب بھی عمر کو طلب کر رہا ہے۔"

"اور عمر کو دن میں ایک ایک منٹ کا وقت ناپنے کے لیے پانی کے گھڑیال کی ضرورت ہے۔ معلوم نہیں وہ اس کا کرے گا کیا..... کیا وہ سوتے اور جاگتے ہر لمحے اسے تکا کرے گا؟" "اس کی مدد سے بہار وخزاں کے موسم میں اس دن کا تعین کرے گا جب شب و روز کے درمیان ایک لمحے کا فرق بھی نہیں رہتا۔ بڑے ستون کے ذریعے وہ اس لمحے کا اندازہ بھی کر سکے گا جب دوپہر کے وقت سورج کا عکس سردیوں میں سب سے لمبا اور گرمیوں میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اور ستاروں کی گردش کا مشاہدہ کر کے وہ ان دونوں کے حسابات میں ترمیم کر سکے گا۔ ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عمر کیا کرے گا۔"

توتوش نے منہ ہی منہ میں کہا۔"انشاء اللہ۔"

"خدا نے چاہا تو ہم ملک شاہ کی تخت نشینی کی یاد میں نئی تقویم پیش کر دیں گے۔"

نظام الملک کو فوراً احساس ہوا کہ یہ منصوبہ بہت عمدہ رہے گا۔ سلطان اس بات میں خوش ہوگا کہ صرف اس کے لیے ایک نئی تقویم بنائی گئی ہے۔ اور عمر سے وہ دو باتوں پر خوش ہو کر ممکن ہے میری امید کے مطابق خیام کے اس لڑکے کو شاہی منجم کا خطاب دے دے۔ وہ بولا۔"میں اس کے لیے پانی کے نئے گھڑیال کا انتظام کروں گا، لیکن وہ کس وجہ سے یوں آوارہ پھرتا رہا؟"

آنکھیں میچ کر توتوش مسکرایا اور کہنے لگا۔"خدا ہی بہتر جانتا ہے، آپ کے غلام کو اس کا کچھ علم نہیں ہے۔"

"تمہارا فرض ہے کہ اب تم اسے آوارہ نہ پھرنے دو، کیونکہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

نظام الملک سے رخصت ہونے کے بعد توتوش جلدی سے اپنے گھر پہنچا۔ اکثر وہ لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر ایک پرانے کارخانے کے گوشے میں جہاں سے بازار اور مسجد کا صحن نظر آتا تھا، چھپ جایا کرتا تھا۔ اس جگہ وہ اپنی ایسی چیزیں رکھتا تھا جو

کسی کو دکھانی نہیں چاہتا تھا۔ اس خفیہ جگہ پر ایک گونگے مصری غلام کا پہرا رہتا تھا جو اپنے آپ کو ان کمروں کا مالک بتاتا تھا۔ یہاں ایک صندوق کے اندر سے جس میں تین تین تالے پڑے تھے تو توش نے چاندی کا ایک نازک بازو بند نکالا جس میں آسمانی رنگ کے حسین موتی جڑے ہوئے تھے۔

یہ بازو بند مرحوم سلطان کا محبوب اور کبڑا مسخرا منارے میں لایا تھا۔ کبڑے مسخرے نے کہا کہ یہ تحفہ یاسمین نام کی ایک عورت نے بھیجا ہے اور یہ کہلایا ہے کہ میرا دل درد سے بے چین ہے اور مجھے حیفہ جانے والی مغربی سڑک پر لے جایا جا رہا ہے۔

''عمر صرف اس معاملے میں جذباتی ہے۔ اور کچھ بھی ہو میں اسے مغربی علاقے میں حیفہ تل نہ جانے دوں گا، کیونکہ مجھے نظام الملک کے غضب کا نشانہ بننا پڑے گا۔'' تو توش نے فیصلہ کیا کہ میں چاندی کے اس تحفے سے نجات حاصل کر لوں گا۔ اس تحفے کو اپنی جیب میں رکھ کر تو توش نے صندوق بند کیا اور وہ باہر نکل آیا۔ اور ایک چشمے پر پہنچا جہاں کمسن بچوں کی ایک ٹولی کھیل میں مصروف تھی۔ تو توش نے جیب سے چاندی کا بازو بند نکال کر چشمے میں پھینک دیا۔ جب چاندی کا یہ بازو بند چشمے کی تہ میں پتھروں سے جا کر ٹکرایا تو اس نے منہ پھر کر دیکھا تک نہیں۔ پہلے وہاں خاموشی تھی، پھر اسے ہلکی ہلکی چیخ پکار اور چھوٹے چھوٹے قدموں کے جلد جلد چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ تو توش نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہ تھا اور چاندی کا بازو بند غائب ہو چکا تھا۔

تو توش مسکرایا۔ ''پتھر کو پتھروں میں اور ریت کے ذرے کو ریگستان میں چھپانا چاہیے۔''

نظام الملک رصد گاہ کے معاملات سے مطمئن تھا۔ موسم گرما ختم ہونے سے قبل رصد گاہ میں پانی کا گھڑیال نصب ہو چکا تھا۔ اس گھڑیال میں ایک چھوٹا پہیا تھا جو ایک گھنٹے میں ساٹھ بار گھومتا تھا اور ایک بڑا پہیا بھی تھا جو ایک گھنٹے میں صرف ایک بار چکر لگاتا تھا۔ ایک نشان لگے ہوئے پیمانے پر نیزے کی سی نوک رکھنے والی چاندی کی سوئی لگی تھی جو ایک پہر سے دوسرے پہر تک پورے پیمانے پر پھر جاتی اور پھر واپس چلنے لگتی تھی۔ کم از کم تو توش کے نزدیک یہ گھڑی تعجب انگیز حد تک صحیح تھی۔ لیکن خرمہ

میمون نے اسے بتایا تھا کہ تقریباً ایک سال کے عرصے میں وہ یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ صحیح وقت اور اس گھڑی کے وقت کے درمیان کتنا فرق ہے! تو توش نے جواب دیا کہ اس گھڑیال میں اس چھوٹے سے سوار کی کمی ہے جو نیزے سے دنوں کا نشان لگائے جیسا کہ محل میں ہوتا ہے۔ اس پر میمون نے تو توش کو ترحمی سے ایک نظر دیکھا۔ وہ خاموش رہا، گویا اس کا یہ مطلب ہوا کہ ریاضی کے ماہروں کو دنوں کی یاد دلانے کے لیے فرضی قصوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

عمر خیام کی رصد گاہ میں بالآخر تمام آلات اپنی اپنی جگہ لگا دیئے گئے اور مشاہدہ کرنے کے لیے چار اور اشخاص منتخب کیے گئے۔ سنگ مرمر کا نیا ستون تعمیر ہو چکا تھا اور اب میمون بھی یہ کہتا تھا کہ ہم وقت کا نئے سرے سے تعین کرنے کا زبردست کام شروع کرنے والے ہیں۔ میمون کی رائے تھی کہ یہ کام سات سال میں پورا ہوگا، لیکن عمر کے خیال میں وہ چار پانچ سال میں ختم ہو سکتا تھا۔

تو توش نے تعجب سے کہا۔ ''بخدا! ہم تو چار پانچ ہفتوں میں ایک محل تعمیر کر لیتے ہیں۔''

عمر کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ بولا۔ ''جی ہاں! اور جب آپ کا محل ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن جائے گا اور اس میں چھپکلیاں رہنے لگیں گی تب بھی ہمارا گوشوارہ ایسے ہی قائم رہے گا۔''

جاسوسوں کا سرغنہ، موٹا تو توش ہنسا اور کہنے لگا۔ ''اگر میرے پاس محل ہوتا تو مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہ ہوتی کہ مرنے کے بعد مجھے چھپکلیوں کے درمیان ڈال دیا جائے تو کیا ہوگا۔''

تو توش نے نظام الملک کو مطلع کر دیا کہ رصد گہ میں چھ منجم تعینات کر دیئے گئے ہیں اور وہ اپنا کام شروع کرنے کے لیے کیل کانٹے سے بالکل لیس ہیں۔ یہ اطلاع پانے کے بعد نظام الملک نے یہ منصوبہ بنایا کہ موسم خزاں میں اعتدال شب و روز سے پہلے کے ہفتے میں جس میں عمر نے اپنا مشاہدہ شروع کرنے کے لیے کہا تھا سلطان ملک شاہ کے لیے نشاپور میں ایک چھوٹا سا ڈرامہ کیا جائے۔

نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو یہ ترغیب دی کہ جس روز وہ ہرن کے شکار کو جائے، واپسی میں منارے کا معائنہ کرے۔ اس دن دوپہر تک رصد گاہ کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ باغیچے میں قالین بچھا دیئے گئے اور درختوں کے نیچے مٹھائی کے تھال اور شربت کے گلاس رکھ دیئے گئے۔"

مدرسے سے معلمین کا ایک وفد رصد گاہ میں پہنچا۔ اس کے ساتھ الجبرے کا ماہر استاد علی بھی آیا۔ تمام معلمین درباری خلعتوں میں ملبوس تھے۔ پھر بڑی مسجد سے ملاؤں کی ایک جماعت بھی آئی جو دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ نظام الملک نے ان ملاؤں کا بڑا شاندار خیر مقدم کیا اور انہیں اس تخت کے بالکل قریب بٹھایا جو ملک شاہ کے لیے بچھایا گیا تھا اور جس پر ریشم کا تخت پوش بچھا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ملا اس مذہبی مجلس کے رکن ہیں جسے زبردست اقتدار حاصل ہے لیکن جسے سائنس کی ایجادوں سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہے۔ اس نے عمر کو ہدایت کی کہ تمام احتیاط سے ان کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور ان کے سامنے کچھ نہ بولنا۔

عمر کسی سے کچھ کہنا یا بحث میں پڑنا ہی نہ چاہتا تھا۔ وہ تو محسوس کر رہا تھا جیسے کسی دعوت میں بطور مہمان بلایا گیا ہو اور اس وقت جب رسمی آداب و کورنش کا سلسلہ ختم ہوا تو سب لوگوں کی نگاہیں سواروں کے اس دستے پر مرکوز ہو گئیں جو دریا کی ڈھلان سے اوپر آ رہا تھا تو عمر مطمئن ہو گیا۔

پزیرائی کے قالین بچھنے سے پہلے ہی ملک شاہ نے اپنا شکار کا نیزہ ایک غلام کے ہاتھ میں دیا اور رصد گاہ کے دروازے پر گھوڑے سے اتر پڑا۔ وہ گرد میں اٹا ہوا تھا اور بھرپور سواری کرنے کی وجہ سے بہت خوش تھا، لیکن عمر نے محسوس کیا کہ نوجوان سلطان کو نظام الملک اور بوڑھے ملاؤں سے مل کر حقیقی مسرت نہیں ہوئی۔ ملک شاہ کی گردن میں ہار پڑے تھے، اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ جانوروں کے سے جچے تلے انداز سے چلتا تھا، بات کرتے وقت نہ وہ اپنے ہاتھ اٹھاتا تھا اور نہ اونچی آواز سے بولتا تھا۔

عمر نے نظام الملک کے ساتھ جا کر سلطان کو مودبانہ کورنش پیش کی تو اس نے نوجوان نجومی کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "اچھا یہ ہی ہے وہ شخص؟"

عمر نے حسب توقع جواب دیا۔ "جی ہاں میں وہی ہوں دنیا کے آقا سلطان ملک شاہ کا غلام۔"

"خراسان کی سڑک پر تو ہمارے حضور حاضر ہوا تھا، اور تو نے ہم سے آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کی تھی۔ حالانکہ ہمارے مصاحبین نے جھوٹی باتوں کا طومار باندھ رکھا تھا۔ ہم تیری پیشین گوئی کو نہیں بھولے ہیں۔ بتا! اب تو ہم سے کیا لینا چاہتا ہے؟"

سلطان اور عمر نے ایک لمحہ کے لئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عمر نے سر جھکا لیا۔ ایک طرف وہ جنگجو سلطان تھا جس کے خیالات اسلامی دنیا کی گہما گہمی سے ابھی تک الگ تھے اور جو ابھی تک اپنے اسی مورث اعلیٰ خاقان کا فرزند تھا جس نے دنیا کے بلند ترین علاقے کے اس پار مویشیوں اور انسانوں پر سلطنت کی تھی ..... اور دوسری طرف وہ طالب علم تھا جو ابھی تک تصورات کی دنیا میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ملک شاہ کی عمر بیس سال تھی اور عمر کا سن بائیس سال!

"میں چاہتا ہوں کہ مجھے شاہی ملازمت میں لے لیا جائے۔"

ملک شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "منظور ہے، اچھا اب ہمیں دکھا! کہ تو نے یہاں کیا بنایا ہے؟"

سلطان سنگ مرمر کے اونچے ستون کو دیکھ کر خوش ہوا۔ اور اس نے دوسرے آلات کو بھی شوق سے دیکھا۔ جب بوڑھے میمون نے جو مہمانوں کے ہجوم اور بادشاہ کے حضور میں عجب بے تکا معلوم ہو رہا تھا سلطان کو آسمان کے عظیم کرہ کے متعلق بتانا شروع کیا تو ملک شاہ نے عمر کی طرف دیکھا اور اسے گلوب کی تشریح کرنے کا حکم دیا، کیونکہ وہ اس نوجوان نجومی سے واضح الفاظ میں اس کی صراحت چاہتا تھا۔

ملاؤں کا صدر یہ نہ برداشت کر سکا کہ سلطان سائنس کے آلات سے اتنی دلچسپی لے، وہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے آگے بڑھا اور بولا: "غور سے سنو کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ اگر تم اس کی عبادت کرنا چاہتے ہو تو سورج یا چاند کی پرستش نہ کرو بلکہ اس اللہ تعالیٰ کے آگے جھکو جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے۔"

سب ملاؤں نے "حق ہے حق ہے" کہا لیکن عمر نے فوراً جواب دیا کہ "کلام

اللہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ دن اور رات کی نشانیاں ہیں اور چاند سورج بھی۔ تاوقتیکہ ان نشانیوں کی تشریح نہ ہو جائے ہم انہیں کیسے سمجھیں گے۔؟"

سب لوگ سناٹے میں آ گئے۔ نظام الملک کو خوف تھا کہ ملا بحث شروع کر دیں گے تو سلطان کا مزاج بگڑ جائے گا۔ لیکن صدرالعلماء نے بات نہ بڑھائی ملک شاہ بھی خاموش رہا۔ اس کے آباؤ اجداد جو بت پرست، ترک اور وحشی تھے اسلام قبول کر چکے تھے اور ملک شاہ مذہب کا اتنا ہی سختی سے پابند تھا جتنا کہ نظام الملک۔ اس نے پرتپاک انداز میں ملاؤں کے صدر سے اجازت چاہی اور جب اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا تو عمر کو اپنے قریب بلا کر کہا۔

"وزیر دولت نے ہم سے درخواست کی ہے کہ تجھے شاہی منجم کا عہدہ دے دیا جائے۔ ہم نے اسے منظور کر لیا ہے کل دربار میں تجھے ایک اعزازی خلعت عطا کیا جائے گا۔" پھر سلطان اس کی طرف جھکا اور پھر بولا۔ "کبھی کبھی ہمارے پاس بھی آ کر بیٹھا کر۔ اپنے سر کی قسم! ہمیں اکثر شگون معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

سلطان نے گھوڑے کی باگ موڑی اور اچانک گھوڑے کی ٹاپوں کی تیز آوازیں گونجنے لگیں۔ چند لمحوں میں سلطان دریا کی ڈھلان پر جا رہا تھا اس کے پیچھے گروہ در گروہ شاہی امراء اور شکاریوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

اس کے بعد جب نظام الملک عمر سے تنہائی میں ملا تو اس نے کہا۔ "تو نے برا کیا۔ صدرالعلماء کی بات کاٹی۔ ممکن ہے کہ اب وہ تیری راہ میں روڑے اٹکائیں۔"

"لیکن کیوں میرے سرپرست۔ مجھے علماء سے کیا سروکار ہے۔"

"نہیں! عمر! آئندہ ان کو نہ چھیڑنا! بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ ابھی بہت سی باتیں ہیں جو تو نہیں جانتا اور جو تجھے سیکھنی ہیں۔ پہلے تو دربار میں تیرا تقرر عمل میں آئے گا اور تجھے بغیر کوئی ٹیکس ادا کیے بارہ سو مثقال سالانہ تنخواہ ملے گی۔"

عمر نے تو خواب میں بھی اتنی بڑی رقم کا تصور نہیں کیا تھا۔ اس نے چونک کر نظام الملک کی طرف دیکھا۔ لیکن نظام الملک نے بے توجہی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور ممکن ہے کہ ملک شاہ تجھے اور تحائف بھی دے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ

تجھ پر مستقل عنایت کرے گا لیکن یہ نہ بھولنا کہ جس شخص سے وہ بدظن ہو جاتا ہے اس کے ساتھ فولاد کی سی سختی سے پیش آتا ہے۔ محل کے اندر اس کے جاسوس ایسے چھپے ہوئے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں اپنی مہال میں چھپی رہتی ہیں۔ تیرے عروج کی بنیاد اسی کی عنایت پر قائم ہے۔ وہ نہ رہی تو تو بھی کہیں کا نہ رہے گا۔"

عمر کو حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا اس کا مطلب ہے کہ اپنے کام میں انہماک کے ساتھ ساتھ اپنے نوجوان سلطان کی، جسے وہ دل سے پسند کرتا ہے، عنایت حاصل کرنے کی کوشش بھی کرنی ہوگی۔ نظام الملک نے اس کے ان خیالات کا اندازہ لگا لیا اور سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن تو اطمینان رکھ تجھے میری سرپرستی حاصل ہے اور سردست خدا کے فضل سے کسی میں میری علانیہ مخالفت کرنے کی ہمت نہیں، لیکن مجھے بھی اپنا کام کرنا پڑتا ہے....."

نظام الملک نے رازداری سے عمر کو بتایا کہ وہ سلطان کے لیے نئی سلطنت کا نقشہ تیار کر رہا ہے۔ تین نسلیں پہلے جب تک سلجوق ترک نہیں آئے، عالم اسلام میں اختلافات، جنگ وجدال اور طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ خود بغداد میں موجود خلیفہ کو اس اقتدار کا عشر عشیر بھی نصیب نہ تھا جو کسی زمانے میں ہارون الرشید کو حاصل تھا۔ یہاں تک کہ سلجوق ترک فاتح قبائل کو لے کر خلیفہ کی امداد کو آئے۔ شیر دل سلطان الپ ارسلان مشرق سے آندھی کی طرح اٹھا اور مغرب کی جانب خراساں میں دشمنوں کا صفایا کرتا ہوا، فاتح و کامران اور خلیفہ کی جانب سے تسلیم شدہ سلطان کی حیثیت سے بغداد میں داخل ہوا۔

پھر حیفہ فتح ہوا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو بھی نئی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اور یہ تو عمر نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا کہ ملاذگرد میں بازنطینی عیسائیوں کو زچ کر کے سلطان نے ان پر فتح حاصل کی تھی اب سلطان کی وسیع سلطنت سمرقند سے قسطنطنیہ کی شہر پناہ تک پھیلی ہوئی تھی اور قیصر روم ملک شاہ کو خراج ادا کرتا تھا۔ نظام الملک نے منصوبہ بنایا تھا کہ آگے چل کر ملک شاہ کی ایک لڑکی کا موجودہ خلیفہ سے عقد کر دے،

اور ملک شاہ کی شادی وہ قسطنطنیہ کے بازنطینی بادشاہ کی لڑکی سے کرا ہی چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوجوان سلطان کا اسلامی دنیا کے قانونی سربراہ اور قیصر روم دونوں سے گہرا تعلق قائم کر دے۔

خاموشی کے ایک چھوٹے سے وقفہ میں نظام الملک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس موسم سرما میں سلطان اپنی فوج لے کر حیفہ جائے گا، جہاں سے وہ بیت المقدس پر فوج کشی کرے گا اور دنیا کے اس تیسرے مقدس ترین شہر کو عزیز مصر سے ..... جو ایک فسادی اور کم ظرف انسان ہے آزاد کرا لے گا۔''

عمر کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ آدمی کس اعتماد کے ساتھ یہ منصوبہ بنا رہا ہے کہ فلاں شہر کو فتح اور فلاں علاقے کو سلطنت میں شامل ہونا ہے۔ نظام الملک اسے روزانہ اپنے پاس بلاتا اور گھنٹوں محصول کی تحصیل اور قانون کے نفاذ کے طریقوں کی تفصیلات، فوج کی نقل و حرکت، اور ان جاسوسوں کے انتظام کے حالات بتایا کرتا جو تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور جو سلطان کی آنکھوں اور کانوں کی حیثیت رکھتے تھے اس نے بڑی تفصیل سے عمر کو ملک شاہ کے مزاج اور افتاد طبع کا حال بتایا اور اسے مطلع کیا کہ سلطان کو شکار کا بہت شوق ہے وہ عورتوں کے ساتھ بے حس کنیزوں کا سا سلوک کرتا۔ اور شگونوں پر بہت اعتقاد رکھتا ہے۔ یہ سب باتیں بتا کر نظام الملک نے آخر میں اس سے کہا۔ ''ہمیشہ یاد رکھنا کہ اس کا دادا وحشی تھا۔ اگر ملک شاہ کو یہ وہم ہو جائے کہ اس کا نجومی دشمنوں سے تنخواہ پاتا ہے تو ایسے نجومی کو تباہ کرنے کے لیے یہ وہم ہی اس کے لیے کافی ہے۔''

عمر خوب سمجھتا تھا کہ بد دماغ آدمی کسی شخص کو بھی تباہ کر سکتا ہے۔

نظام الملک نے عمر کو کہا۔ ''یوں تیرا کام بہت اہم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تجھے زائچوں اور شگونوں پر اعتقاد نہیں ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرا صرف یہ عقیدہ ہے کہ ستاروں کی مقررہ راہ پر گردش خدائے برتر کی قوت کا اظہار کرتی ہے۔ جب ملک شاہ تجھ سے کوئی کام شروع کرنے کے لیے نیک ساعت پوچھے یا یہ دریافت کرے کہ فلاں کام میں کامیابی ہوگی یا ناکامی تو تو اس کے زائچے کی مدد سے صحیح حساب لگانا اور یہ کوشش کرنا کہ کوئی اور اسے متاثر نہ کر سکے پھر یہ بھی یاد رکھنا کہ دوسرے بہت سے لوگ

تیرے ہر کام کو حسد کی نظروں سے دیکھیں گے۔''

''بجا فرمایا'' عمر نے کہا۔ اسے یہ تجربہ تو ہو ہی چکا تھا کہ جاسوس کسی کی نقل و حرکت کی کس طرح نگرانی کرتے ہیں۔ پھر اگر ملک شاہ نے کبھی اس سے ستاروں کی علامتوں کا حساب لگانے کے لیے کہا تو یہ کام کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا اور یہ حساب نجوم کے ان اصولوں کے مطابق جو کلدانیوں کے میناروں کی طرح قدیم ہیں با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اگر یہ علامتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں تو کیا ہوا؟ اگر ملک شاہ پوچھے گا تو یہ علامتیں پوری طرح اسے بتائی جا سکتی ہیں۔

نظام الملک نے عمر کو اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا۔ ''ممکن ہے کبھی کبھی وہ تجھ سے ان امور مملکت کے مطالب اور نتائج پوچھے جو میرے ہاتھ میں رہتے ہیں ایسے موقع پر تو میرے پاس پیغام بھیج کر یہ معلوم کر لینا کہ کیا جواب دینا بہتر ہوگا کیونکہ ان امور کی منصوبہ بندی ضروری ہے اور یہ منصوبہ بندی صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔

عمر نے معنی خیز نظروں سے نظام الملک کی طرف دیکھا۔

نظام الملک مسکرایا اس کا دماغ اس وقت کہیں اور معلوم ہوتا تھا وہ بولا۔ ''خدا کے فضل سے حکومت کی باگ دو ہاتھوں میں ہے، ایک ہاتھ تو اس بادشاہ کا ہے جو تاج پہنتا ہے اور دوسرا اس وزیر کا جس کے سر پر وزارت کی دستار ہے۔ بادشاہ جنگ کرتا، ملک فتح کرتا اور لوگوں کو سزائیں اور انعام دیتا ہے اور وزیر کے ہاتھ میں نظم و نسق محصول کی وصولیابی اور دوسرے ملکوں کے ساتھ حکمت عملی کا تعین ہوتا ہے۔ میں ملک شاہ کی ایمان داری سے خدمت کرتا ہوں، لیکن بالآخر میرا فرض یہ ہے کہ نئی مملکت کا سنگ بنیاد رکھ دوں..... اس لیے میں تجھ سے صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ حکمت عملی سے متعلق امور میں تو مجھ سے مشورہ کر لیا کر۔ یہ بات طے ہے نا؟''

''یقیناً'' عمر نے جواب دیا، اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس سنجیدہ مزاج انسان نے جو ملک شاہ، اس کی اپنی اور متعصب علماء کی نسبت زیادہ عقلمند تھا اسے اپنا معتمد بنا لیا ہو۔ نظام الملک کی دیانتداری اتنی ہی غیر متزلزل تھی جتنا کہ سنگ مرمر کا وہ نیا ستون۔

نظام الملک اب پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے عمر سے کہا۔ ''اچھا تو، تو نے مجھ

سے وعدہ کرلیا ہے" اسے دل میں جو خوشی محسوس ہو رہی تھی اس کا اظہار اس نے چہرے سے نہ ہونے دیا۔ جب سلطان الپ ارسلان کا اچانک انتقال ہوا تھا اسی وقت سے وہ اس فکر میں تھا کہ عمر کو تلاش کرے اور اس نوجوان سائنس دان کو اپنی سرپرستی میں لے کر ملک شاہ کا نجومی مقرر کرادے۔ اس نے توتوش سے کہا۔ "اب ہم ملک شاہ کو اپنا ہم رائے بنانے کے لیے اس کا اثر استعمال کر سکتے ہیں۔

لیکن عمر کی پہلی ہی درخواست نے نظام الملک کا یہ اطمینان چھین لیا۔ عمر نے اس سے کہا کہ منارے کی رصدگاہ میں جو مشاہدے کیے جائیں گے وہ معمولی نوعیت کے ہیں اور خواجہ میمون اس کی اعانت کے بغیر محض دوسرے نجومیوں کی مدد سے ایک سال تک یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ اس عرصے میں میری خواہش ہے کہ میں سلطان ملک شاہ کے ہمراہ مغرب کے سفر پر جاؤں..... اور اصل واقعہ یہ تھا کہ اس سے سفر پر چلنے کے لیے خود سلطان نے کہا تھا۔

عمر نے نظام الملک کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے خود سلطان کو اس سفر پر جانے کی ترغیب دی ہے دراصل وہ مغرب کی سڑکوں پر یاسمین کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ عمر کے پاس اب دولت، اقتدار، ملازمین اور شاہی عنایات غرضیکہ سب کچھ تھا اور اب وہ اپنی محبوبہ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔

توتوش نے جب نظام الملک سے یہ خبر سنی تو وہ مسکرایا اور اس نے اپنے دل میں کہا۔ "خواجہ بزرگ! ایک مرتبہ تم نے مجھے اس بات پر ڈانٹا تھا کہ خیام کا یہ بیٹا میری نگرانی سے کیسے نکل بھاگا، لیکن تمہاری سرپرستی میں آئے اسے ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا کہ وہ سلطان کا ہم پیالہ و ہم نوالہ بن کر راہ پیمائی کے لیے جا رہا ہے" لیکن توتوش نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ نظام الملک سے کہا۔

"قسمت میں یہی لکھا تھا۔"

دسواں باب:

بابل کے کھنڈر

سلطان کی فوجیں دریائے فرات کو عبور کرنے کے انتظار میں ساحل پر خیمہ زن تھیں۔ ان امراء کے خیمے جن میں عمر بھی شامل تھا اور جو سلطان کے مصاحبین میں شامل ہوتے تھے، فرات کے ساحل پر کھجوروں کے باغ میں نصب کیے گئے تھے ان خیموں کے پیچھے شکستہ دیواریں اور مٹی کے وہ ٹیلے تھے جو دراصل بابل کے کھنڈر تھے۔ عمر نے ان کھنڈروں کو دیکھنے میں کچھ وقت گزارا لیکن جب سلطان سیر و شکار میں مصروف نہ ہوتا تو وہ اپنے خیموں میں رقاصوں اور شعبدہ بازوں کے کرتب دیکھتا۔

بابل کے کھنڈروں کے ایک صحن کو پردوں سے سجا دیا گیا تھا اور سنگ مرمر کے ایک زینے پر قالین بچھا کر بادشاہ اور اس کے مصاحبین کے لیے تخت بنا دیا گیا تھا۔ یہاں ایک روز شام کے وقت سلطان نے عمر کو طلب کیا۔

سلطان ملک شاہ نے گرمجوشی سے عمر کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ "ستاروں کا مطالعہ کرنے والے! ہمارے پاس بیٹھ کر ان کتوں کے کمالات دیکھو۔"

قالین پر ایک طرف عمر کے لیے نشست بنا دی گئی۔ تخت کے آگے رقص زور و شور سے جاری تھا۔ ناچنے والوں کا استاد اپنے گیت ایک نئی دھن میں گا رہا تھا۔ اس کے پاؤں پر لگے ہوئے گھونگرو مخصوص تال میں بج رہے تھے۔ اور انگلیاں اس ڈھول پر تھرک رہی تھیں جو اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ جب وہ رقص کے دوران میں چکر لگاتا

یار کتا تو اس کے بال ماتھے پر لہراتے۔

ناچنے والوں کا استاد یکا یک رکا اور اس نے عمر کے سامنے آ کر انعام کے لیے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ ماتھے پر لٹکے ہوئے بالوں کی اوٹ سے وہ اپنی چمکیلی آنکھوں سے عمر کو دیکھ رہا تھا۔ عمر نے اس کی طرف ایک سکہ پھینک دیا۔ رقاص نے اس سکے کو کمال مہارت سے اپنی انگلی کی نوک پر گھمانا شروع کر دیا اور اس دوران میں کنکھیوں سے عمر کو دیکھتا رہا۔ پھر چیخ کر کہا۔ ''اے جادوگر! میں اولے برسا سکتا اور آندھیاں چلا سکتا ہوں۔ میں دل کا حال بھی بتا سکتا ہوں۔''

عمر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تب تو تو واقعی جادوگر ہے۔''

''برج جدی کے ستاروں کی قسم! اس بجلی کی قسم! جو ستاروں کا مطالعہ کرنے والے پر گرتی ہے۔ میں جادوگر ہوں۔ تو سوچ رہا ہے کہ میں سخت بدمعاش ہوں، لیکن تو پھر بھی مجھ سے خوف زدہ ہے۔''

اس کی نگاہیں عمر کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور ملک شاہ جو اس وقت خوشی کے عالم میں تھا اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

''ستاروں کا حال بتانے والے! اب تو میرے دل کا حال بتا، نہیں تو مجھے صرف اتنا بتا دے کہ آیا تو میرے دل کا حال بتا سکتا ہے یا نہیں۔''

وہ اپنا بھدا سر ہلا کر عمر کو تکے جا رہا تھا فوراً ہی وہ بولا۔ ''بتا! میں اس دربار سے کون سے دروزے سے باہر جاؤں گا۔ دیکھ! یہاں چار دروازے ہیں۔ مشرقی، جنوبی، مغربی اور شمالی! تو اے ستاروں کا حال جاننے والے مجھے بتا! میں کس دروازے سے نکلوں گا۔

عمر اس کے سوال پر قہقہہ لگا کر ہنسا، مگر ملک شاہ کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ سلطان جھکا ہوا بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا، جیسے یہ رقاص اور شاہی منجم دو غنیم ہوں جن کے درمیان تلوار سے مقابلہ ہو رہا ہے۔

عمر نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ تو بہت معمولی بات ہے۔.....''

''لوگ کہتے ہیں کہ تو بڑا عاقل ہے۔ بتا! میں کس دروازے سے باہر جاؤں گا؟''

دوسرے رقاص بھی اپنے استاد کے پاس آ کر جمع ہو گئے اور سلطان کے

مصاحب بھی گفتگو سننے کے لیے قریب آ گئے۔ ملک شاہ بڑے شوق سے عمر کے جواب کا منتظر تھا۔ عمر نے رقاص کو سمجھانا شروع کیا کہ ستاروں کے مطالعے کا ایسی شعبدہ بازی سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن وہ پوری بات کہہ بھی نہ پایا تھا کہ یاد آیا سلطان کو یقین ہے کہ میں انسانوں کے خیالات بتا سکتا ہوں۔ اس نے سوچا کہ ملک شاہ کے اس اندھے عقیدے کو کسی بھی استدلال سے نہیں بدلا جا سکتا۔ عمر نے اپنے دل میں کہا کہ اب تو کوئی چارہ ہی نہیں۔ یہ آوارہ رقاص مجھے جال میں پھنسانا چاہتا ہے۔ بس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں اس کی چالاکی کی اپنی حاضر دماغی سے کاٹ کروں۔

عمر نے کہا۔ ''میرے لئے ایک قلم.....اور ایک کاغذ لاؤ۔''

ایک چوبدار آگے بڑھا اور اس نے مودب ہو کر عمر کو ایک کاغذ اور ایک قلم پیش کیا۔ عمر نے یہ چیزیں لے لیں، لیکن وہ فکر میں غرق تھا۔ اسے چالاکی کا جواب چالاکی سے دینا تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ ''اچھا تو یہ ہوتا ہے شاہی منجم کا فرض!'' اگر میں ناکام ہوا تو ملک شاہ اسے کبھی نہ بھولے گا۔ کاش میں اس دروازے کا صحیح اندازہ لگا سکوں!.....رقاص نے کہا تھا کہ چار دروازے ہیں۔ مشرقی، جنوبی، مغربی اور شمالی۔ چاروں میں سے کس دروازے سے.....یہ دروازے صاف نظر آ رہے ہیں اور ان سب دروازوں میں چوبدار ٹہل رہے ہیں.....لیکن رقاص نے یہ کیوں کہا کہ کس دروازے سے؟''

عمر نے کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے تہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اگر یہ رقاص شعبدہ بازی کر سکتا ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ملک شاہ کی اجازت لے کر وہ زینے پر گیا اور ایک پتھر کا سرا اٹھا کر جو غالباً کسی مجسمے کا پائدان ہو گا اس نے مڑے ہوئے کاغذ کو وہاں رکھ دیا اور پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے رقاص سے کہا۔ ''اب تم جاؤ۔''

رقاص کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور مشرقی دروازے کی طرف دوڑا۔ اس کے گھونگرو بج رہے تھے۔ پھر وہ خوشی کا ایک نعرہ لگا کر گھوما اور دیوار کی طرف لپکا۔ زردوزی کا پردہ پکڑ کر ایک طرف گھسیٹا جس کے پیچھے سے دیوار میں ایک بغلی دروازہ نمودار ہوا۔

رقاص نے چیخ کر کہا۔ ''میں اس دروازے سے جاتا ہوں'' رقاص کے جانے

کے بعد پردہ گر گیا۔ تماشائیوں کی صفوں سے مدھم آواز میں خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔

ملک شاہ نے چوبدار کو وہ کاغذ لانے کا حکم دیا جو عمر نے پتھر کے نیچے دبایا تھا۔

پرچے کو سلطان نے آہستہ سے کھولا اور اس کی تحریر پڑھ کر تعجب سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر اس نے بلند آواز سے وہ پرچہ پڑھا۔

''پانچویں دروازے سے۔'' یا اللہ! اے غیب کے حالات بتانے کے ماہر! تو نے اس کے دل کا حال سچ سچ معلوم کر لیا۔''

عمر نے قیافہ شناسی سے کام لیا تھا کہ جب یہ رقاص چار دروازوں پر اتنا زور دے رہا ہے اور جب اس کا امکان ہے کہ میں ان چار دروازوں میں سے اتفاقاً صحیح دروازہ بتا دوں تو یہ بھی ممکن ہے کہ اسے دربار سے باہر جانے کا ایک اور دروازہ بھی معلوم ہو حالانکہ یہ دروازہ نظر سے اوجھل ہے۔

ملک شاہ نے اپنے نجومی کی کمر تھپک کر کہا کہ تو دوسرا بوعلی سینا ہے، پھر اس نے خزانچی کو حکم دیا کہ عمر کا منہ سونے سے بھر دیا جائے۔ خزانچی نے فوراً سونے اور چاندی کے ڈلیوں سے بھرا ہوا وہ طشت اٹھایا جو ہمیشہ سلطان کے قریب رکھا رہتا تھا اور یہ ڈلیاں عمر کے منہ میں بھرنا شروع کر دیں۔ پھر سلطان بولا۔ اور اس کتے کے بچے رقاص کے منہ میں ریت بھر دو یہاں تک کہ وہ ریت سے اٹ جائے خدا کی قسم! اس نے ہمارے آقائے دانش سے گستاخی کی ہے۔''

جب عمر سلطان سے رخصت ہو کر چلا تو ایک غلام بڑی شان کے ساتھ سونے کے سکوں سے بھرا طشت لے کر اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ عمر نے دیکھا کہ دربار کے ایک دروازے پر لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس مجمع میں دو سپاہی زبردستی رقاص کے بازو پکڑے ہوئے ہیں۔ تیسرا سپاہی چاقو سے اس بدمعاش کا منہ کھول رہا ہے۔ اور چوتھا سپاہی بورے سے ریت نکال کر اس کے زخمی منہ میں بھر رہا ہے۔ رقاص کا چہرہ تکلیف سے سیاہ پڑتا جا رہا ہے اور وہ درد سے بری طرح کراہ رہا ہے۔

رقاص نے عمر کو درباری زندگی میں آج پہلی مرتبہ ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔ یقیناً اسے کسی حاسد نے اکسایا تھا۔ عمر نے نفرت سے منہ

پھیر لیا اور کھجوروں کے جھنڈ میں اپنے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ غلام بھی طشت لیے اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اس وقفے میں اس نے للچائی ہوئی نظروں سے اپنے کندھے پر سونے سے بھرے ہوئے طشت کو ایک نظر دیکھا۔

رات کو عمر دیر تک کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ وہ حبشی غلام جو سونے کا طشت لے کر اس کے ساتھ آیا تھا روزانہ کی طرح خیمے کے دروازہ پر نہیں سو رہا ہے۔ وہ اس جگہ لیٹا ہوا رینگ رہا تھا اور کچھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔ اتنے میں خیمے کے دروازے پر ایک اور سایہ نظر آیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے جس کی وجہ سے عمر کو اپنا مطالعہ ترک کرنا پڑا۔

عمر کو اٹھتا دیکھ کر غلام چیخ کر بولا۔ ''حضور! یقیناً یہ جادو کی رات ہے۔ حضور! آپ کا غلام خوف زدہ ہو رہا ہے۔'' دوسرے آدمی نے غلام کی ہاں میں ہاں ملا کر اور عمر کو سلام کر کے کہا ''ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم آقائے دانش کے قدموں میں بیٹھ سکیں۔ ہمیں رات سے ڈر لگ رہا ہے۔''

چراغ کے قریب کھسکتے ہوئے اس نووارد نے عمر کو بتایا کہ عشاء کی نماز کے بعد وہ بابل کے کھنڈروں میں ٹہل رہا تھا کہ اس نے ایک ٹیلے پر روشنی دیکھی۔ یہ چاند کی روشنی نہیں تھی، کیونکہ جیسا کہ آقائے دانش کو علم ہے اس شب چاند نہ نکلا تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں روشنی کا ایک ہالہ تھا جس میں ایک سفید پوش آدمی کی شکل نظر آ رہی تھی۔ نووارد نے کہا: ٹیلے کے اور قریب پہنچا تو میں نے دو چیزیں اور دیکھیں..... ان میں ایک نیم عریاں انسان تھا جو زمین پر سانپ کی طرح رینگ رہا تھا اور دوسرا ایک دیو پیکر بھورے رنگ کا عقاب تھا جو روشنی کے اس ہالے کے اوپر چکر کاٹ رہا تھا۔

حبشی غلام جس نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن متاثر اتنا ہی تھا جیسے خود دیکھا ہو چیخ کر بولا۔ ''واللہ! یہ روشنی سب سے اونچے ٹیلے پر تھی اور سفید پوش، اس عقاب سے باتیں کر رہا تھا۔ عقاب اسی دوران میں سانپ بن گیا۔ اس کے پاس ایک چاقو بھی تھا۔ ارے ارے وہ تو عجیب جادو تھا، اور ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔''

نووارد نے اپنی اہمیت جتاتے ہوئے کہا۔ ''وہ شخص جو رینگ رہا تھا رقاص تھا جس کے منہ اور پیٹ میں ریت بھرا ہوا تھا۔ آقائے دانش میں نے انہیں آپ کا نام بھی

لیتے سنا۔ انہوں نے عجیب جادو دکھایا۔ ''کہاں؟''

''سامنے اس اونچے ٹیلے پر۔''

غالباً اس غلام نے ٹیلے پر رقاص کو دفن کیے جاتے دیکھ لیا ہوگا..... پھر بھی عمر یہ نہیں چاہتا تھا کہ دو خوف زدہ حبشی غلام رات بھر اس کے پاس بیٹھے رہیں۔ چنانچہ وہ ٹیلے کی طرف روانہ ہو گیا اور نو وارد بھی بادل ناخواستہ اس کے پیچھے پیچھے چلا اور حبشی غلام تو اس کے اتنے قریب چل رہا تھا کہ عمر کے قدم پر اس کا قدم پڑتا تھا۔ خیمے سے روانہ ہونے کے بعد وہ شکستہ دیواروں کی طرف جانے والے راستے پر مڑے یہاں تک کہ عمر اس جگہ پہنچا جو کسی زمانہ میں ایک چوڑی سڑک رہی ہوگی۔ نو وارد یہاں آ کر اپنے چراغ کی روشنی تیز کرنے کے بہانے ٹھہرا۔ اس نے عمر سے آہستہ سے کہا۔ ''حضور! وہ جگہ یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔ وہاں دائیں طرف۔ آپ کا غلام، آپ کا یہ غلام یہیں ٹھہر کر انتظار کرے گا.....''

عمر نے نو وارد سے چراغ لے لیا اور آگے بڑھا۔ جلد ہی اس کے کانوں میں پھاوڑا چلانے اور کسی کے زمین کھودنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں غلام اس کھنڈر سے بھاگ کر واپس جا رہے تھے وہ بہت تیز دوڑ رہے تھے، اور عمر تنہا دونوں طرف دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اونچائی پر ایک مدھم سی روشنی نظر پڑی۔

یہ روشنی اس کھنڈر پر تھی جسے لوگ مندر کہتے تھے۔ عمر نے دن میں یہ جگہ دیکھی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ یہاں سے ریت کے ٹیلوں پر کون سا راستہ جاتا ہے۔ جب وہ ٹیلے پر پہنچ گیا تو اس نے اس روشنی کی طرف بڑھنا شروع کیا جو شکستہ دیوار کے ایک طاق پر نظر رہی تھی۔ اس روشنی کے ہالے میں بیٹھا ہوا آدمی عمر کو دیکھ کر اس انداز سے اٹھا جیسے وہ اس کی آمد کا منتظر تھا۔

زمین کی طرف اشارا کرتے ہوئے اس نے عمر کو ایک لاش کی طرف متوجہ کیا۔ یہ لاش رقاص کی تھی۔ اس کے سینے میں چھرا گھونپا ہوا تھا۔ وہ شخص بولا۔ ''میں نے اس کے دکھ کا خاتمہ کر دیا۔''

عمر نے اس شکاری پرندے کو دیکھا جو قریب ہی اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اسے خیال ہوا کہ یہ پرندہ باز وغیرہ ہوگا، لیکن وہ عقاب تھا، جب عمر اس کے قریب پہنچا

تو عقاب نے پر پھڑ پھڑانے بند کر دیئے۔ وہ اپنی چمکیلی آنکھوں سے عمر کو تک رہا تھا۔

اس شخص نے کہا۔ ''یہ میرا رفیق ہے جو اونچے مقامات پر میرے ساتھ رہتا ہے..... اور آسمان کی بلندیوں سے نیچے اتر آتا ہے۔'' ''تو کون ہے؟''

''پہاڑوں کا رہنے والا اور رے کا باشندہ'' اس شخص نے یہ جملہ اپنی ٹھوڑی کو آگے کرتے ہوئے کہا اور اس کی چمکیلی آنکھیں اور چمک اٹھیں۔

رے کا قدیم شہر ان پہاڑوں کی ترائی میں واقع تھا جو ایران کی بلند ترین اور برف پوش چوٹی دیم آوند کے گرد پڑتی تھی۔ اگرچہ اس شخص کا ایرانی ہونا بھی ممکن تھا، لیکن اس کا لہجہ مصریوں کا سا تھا اور آواز کے لوچ سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کئی زبانوں سے واقفیت ہے۔

اس نے عمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''تو خیام ہے بادشاہ کا منجم۔ تجھے سکون حاصل نہیں..... اسی وجہ سے تو یہاں بعل کے مندر میں ایک ایسے طالب علم سے باتیں کرنے آیا ہے جسے بہت سے لوگ پاگل سمجھتے ہیں۔ میرا نام حسن بن صباح ہے۔

''حسن بن صباح! تم عجیب طریقے سے تدفین کرتے ہو۔''

حسن عمر سے سن میں کسی قدر بڑا تھا۔ اس کی آواز اور اس کے قوی ہاتھوں میں حیوانوں کی سی سختی اور طاقت تھی۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں حقیقت کی تلاش میں ہوں اور بہت سی چیزوں کی حقیقت کی جستجو رکھتا ہوں۔ میں نے اس رقاص کو سلطان کے خیمے کے ایک دروازے کے باہر پڑا دیکھا، جہاں اسے کتوں کے چیرنے پھاڑنے کے لیے پھینک دیا گیا تھا۔ اس لیے میں اسے یہاں ٹیلے پر لے آیا۔ یہاں عقاب اس کا گوشت کھا کر اس کی ہڈیاں صاف کر دیں گے۔ اسے درد سے نجات دلانے کے لیے میں نے اس کے سینے میں چھرا گھونپ دیا۔ خیمے کا ہر شخص اسے مارتے ڈرتا تھا کیونکہ ملک شاہ نے اس احمق رقاص کے منہ میں صرف ریت بھرنے کا حکم دیا تھا..... لیکن مجھے دوستوں کی اور سچے دوستوں کی تلاش ہے۔ اسی لیے میں عرصے سے بابل میں مقیم ہوں۔''

حسن بن صباح کسی دین دار مسلمان یا درباری کے لہجے میں گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ عمر کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید وہ خود ملک شاہ کا کوئی معتمد ہو۔ حسن نے بے

ساختہ اس سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے کبھی کسی نشان کے ظاہر ہونے کا انتظار کیا ہے۔؟''

عمر نے جواب میں اس سے یہ سوال کیا۔ ''صباح کے بیٹے! کیا تم نے بھی بابل میں کوئی نشانی دیکھی ہے؟''

''ہاں جب یہ رقاص مرا تھا اس وقت، کیونکہ اب اور اس لمحے میری ملاقات اس آدمی سے ہوئی ہے جو اپنے خیالات میں واضح اور حقیقت کا جویا ہے۔ اے خدا! کاش عمر خیام میرا دوست ہو سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسا ہونا مقدر ہو چکا ہے..... لیکن ستارے ڈوب رہے ہیں۔ اب بہت رات ہو گئی اور میں ٹیلے سے نیچے اترتا ہوں۔''

اچانک چراغ بجھ گیا، لیکن حسن نے کسی پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ اس نے کہا کوئی بات نہیں میں اس کھنڈر کی بھول بھلیوں سے اتنی اچھی طرح واقف ہوں جتنی اچھی طرح رند میخانے سے واقف ہوتا ہے۔ اس نے عمر کا ہاتھ پکڑا اور تنگ راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ ایک بار ٹیلے پر وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا لیکن حسن لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑھتا ہی چلا گیا۔ عمر نے پیچھے عقاب کے پر پھڑ پھڑانے کی آواز سنی جیسے وہ ان کے ساتھ آ رہا ہو۔ پھر کوئی الوداعی کلمہ کہے بغیر ہی حسن نے عمر خیام کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس کے ساتھ پردوں کے پھڑ پھڑانے کی آواز بھی دور اندھیرے میں مدھم ہوتی چلی گئی۔ اپنے خیمے میں پہنچ کر عمر نے دیکھا کہ چراغ کے قریب غلام سمٹے بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

عمر اپنی اور حسن کی ملاقات پر غور کرتا رہا۔ عمر نے سوچا کہ حسن عجیب انسان ہے، اسے میرے وہاں پہنچنے کی توقع بھی تھی ..... وہ نو وارد غلام جو اس کے خیمے میں یہ قصہ سنانے آیا تھا اب غائب ہو چکا تھا..... عمر نے سوچا اس کی ایک انجانے اور انوکھے طریقے سے آزمائش کی گئی ہے۔ بلاشبہ وہ روشنی تو اس چراغ کی تھی جسے ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا گیا تھا، لیکن ہرن کے شکار کے علاوہ کون عقاب کو سدھاتا ہے؟

عمر نے کئی مرتبہ فوج کے سپاہیوں سے اس حسن بن صباح کا حال پوچھا جو مصریوں کے لہجے میں بولتا ہے لیکن اسے اس کا کوئی جاننے والا نہ ملا۔

گیارھواں باب:

بیت المقدس کی مشرقی شہر پناہ

عمر کو اب ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ نظام الملک اس پر نگاہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کے بعد پھر کبھی عمر کے سامنے کسی آوارہ شعبدے باز کو آنے اجازت نہ دی گئی جب وہ خیمے تنہا ہوتا تو ایک ہندو منشی اس کے پاس آتا اور بلخ و سمرقند کے معاملات اور ملک شاہ کی جملہ کاروائیوں پر بات چیت کیا کرتا۔

عمر کو نظام الملک کے خطوط مل رہے تھے اور یہ اس کے لئے بہت مددگار تھے۔ بظاہر ان خطوں میں نظام الملک اپنے کام کے لیے لکھتا، لیکن دراصل یہ بحث ہوتی کہ کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے اور کن خطرات سے بچا جائے۔ ان خطوط ہی سے عمر کو یہ معلوم ہوا کہ ملک شاہ کی فوجوں کے لیے بیت اللہ المقدس فتح کتنا ضروری تھا۔ ملک شاہ، خلیفہ بغداد کا جسے کروڑوں مسلمان اسلام کا پیشوا مانتے تھے منظور نظر بن چکا تھا۔ اور سلجوق ترک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔ انہیں بیت المقدس کو مصر کے بدعتی خلیفہ کے ناجائز قبضے سے نکال کر اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا کام ابھی باقی تھا۔

توسیع سلطنت ہی کے مقصد سے ملک شاہ کو شمال میں کافر بازنطینیوں کے خلاف بھی فوج کشی کرنے کی ضرورت تھی۔ جب تک اسلام کا یہ مجاہد جہاد کے راستے پر چلتا رہے گا، اس وقت تک اسے اپنی فوج کے لیے سپاہیوں کی کمی نہ ہو گی..... کوہستانی علاقوں سے مزید ترک قبائل کے سوار دستے نیشاپور پہنچ رہے تھے اور نظام الملک انہیں

فوج میں شامل ہونے کے لیے مغرب کی جانب روانہ کر دیتا تھا۔

عمر خیام اب اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ نظام الملک کی حیثیت اس کاری گر جیسی ہے جو اپنے کرگھے پر بیٹھا بے معنی انداز میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنتا رہتا ہے لیکن یہ ٹکڑے کسی بڑے قالین کے اجزا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ملک شاہ نے جب اس سے مشورہ کیا کہ بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لیے ساعت نیک ہے یا نہیں تو عمر نے کسی پس وپیش کے بغیر کہا یقیناً یہ مہینہ نہایت مبارک ہے۔ اور مریخ کا سیارہ آپ کے ستارے کا حامی ہے۔"

ملک شاہ! خود بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ بات درست ہے، لیکن وہ اپنے منجم پر اس قدر بھروسا کرتا تھا کہ اگر عمر اعتراض کرتا تو ملک شاہ اپنا منصوبہ بدل ڈالتا۔

اس وقت سلطان کی فوجیں حیفہ کے سرخ میدان میں خیمہ زن تھیں عمر نے یہ طے کیا کہ وہ امیر عزیز کی سوار فوج کے ساتھ جو بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کی جا رہی تھی جنوب کا سفر کرے گا.....

عمر مغربی سمندر دیکھنا چاہتا تھا..... اس نے اپنی زندگی میں سمندر کا ساحل کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور وہ بیت لمقدس میں مسجد اقصیٰ کی زیارت بھی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا ارادہ ملک شاہ پر ظاہر کیا۔ اس دوران میں عمر حیفہ نیز ان شہروں کے بازاروں میں جو راستے میں پڑتے تھے مشہد کے اس پارچہ فروش کی بے سود تلاش میں مصروف رہا جو ایک نوجوان بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

عمر کے علم میں تھا کہ حیفہ سے بہت سے کاروان جنوب کی طرف دمشق جاتے اور وہاں سے مصر کا صحرا عبور کرتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے جنوبی سڑک پر یاسمین کا کچھ پتا مل جائے عمر نے اپنے دل میں کہا کاش مجھے اطلاعات حاصل کرنے کے لیے تو توش کے سے ذرائع حاصل ہوتے!

"اچھا تم زیارت کے لیے جاؤ تو میرے لیے مسجد اقصیٰ کی محراب میں دعا کرنا" ملک شاہ نے اسے روانگی کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

نوجوان ترک سلطان نے اس بات کو نہایت مناسب سمجھا کہ وہ خیام، جسے

خدا نے علم و دانش سے نوازا ہے، اس فوجی مہم کے دوران زیارت سے مشرف ہو، لیکن اس نے عمر کو اجازت دینے سے قبل یہ احتیاط برتی کہ اس عرصے کے لیے جس میں عمر کو باہر رہنا تھا اس سے سعد اور نحس دنوں کا نقشہ بنوالیا۔ ملک شاہ کی راس میں مریخ، زحل اور مشتری تینوں ستارے جمع تھے، اس لیے اس زمانے میں اہم واقعات پیش آنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ سلطان نے عمر خیام کو سفر پر لے جانے کے لیے شاہی نشان اور نصف درجن حبشی غلاموں کا محافظ دستہ بھی دیا۔

اس دستے کے افسر بمباشی کو سلطان نے یہ حکم دیا کہ اس کے دو آدمی، سوتے جاگتے عمر کی حفاظت کریں۔ چنانچہ عمر جہاں بھی جاتا وہ مستعد تیرانداز ہمیشہ اس کی حفاظت کے لیے ساتھ ہوتے، کیونکہ بمباشی نے اپنے ان سپاہیوں کو بتا دیا تھا کہ جس شخص کی نگاہ سے عمر اوجھل ہوا اس کا سر اڑا دیا جائے گا، لیکن عمر انہیں ایسی ایسی گلیوں میں لے گیا جن کی وہ توقع بھی نہ کر سکتے تھے۔ دمشق سے جہاں اس نے بازار کا گوشہ گوشہ چھان مارا وہ انہیں لبنان میں چناروں سے ڈھکے ہوئے میدان میں لایا اور وہاں سے ہرمان کی بلند اور چمکدار برف پوش چوٹی کے قریب سے گزرتا ہوا پھر انہیں ساحل سمندر میں لے آیا۔

عمر کئی کئی گھنٹے ساحل سمندر پہ ٹہلتا رہتا۔ نسیم بحری میں گہرے سانس لیتا اور وہ عجیب وغریب اشیاء اٹھا اٹھا کر دیکھتا جنہیں موجیں ساحل پر پھینک دیتی تھی۔

یہ وہی ساحل تھا جہاں یونانی اور رومی اپنے بادبانی جہازوں کے ذریعے پہنچے تھے اور جہاں انہوں نے سنگ مرمر کی وہ بندرگاہیں بنائی تھیں جو اب تقریباً ویران پڑی ہیں۔ یہیں طیر کی وہ سرزمین تھی جو دور تک سمندر کے اندر چلی گئی ہے اور اسی جگہ سد سکندری تھی جس کے بنیادیں اب تک پانی میں نظر آتی ہیں۔ عمر کوہ کرمل کی ان بلندیوں پر بھی چڑھا جہاں بہت سے عیسائی راہبوں نے حیات وموت کی منزل طے کی تھی۔

عمر میدانوں کی طرف بھی گیا اور پہاڑوں کی اس ڈھلان پر پہنچا جہاں کسی زمانے میں جھیل تھی۔ حبشی غلاموں کا کہنا تھا کہ اس وادی میں زمین کے اندر شیطان دفن ہیں کیونکہ وہاں گندھک کے چشمے، ویران محل کی دیواروں کی پچی کاری اور وہ باریک نم

زدہ لوگ نظر آ رہے تھے جنہیں یہودی کہا جاتا ہے۔

وہ بیت المقدس پہنچے تو انہیں مانوس ماحول میسر آ گیا۔ سلطان کی فوج نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد دیہات کے کافروں کو خوب لوٹا تھا۔ وہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے ہوئے کھیتوں اور خانقاہوں کی ان سیاہ دیواروں کے پاس سے گزرے جنہیں لوٹ کر آگ کی نذر کر دیا گیا تھا۔ بعض جگہ انہیں کچھ عجب قسم کے لوگ نظر آئے..... برہنہ سر مرد اور بچوں کو گود میں لیے ہوئے بے نقاب عورتیں..... یہ لوگ لاشوں کے ڈھیر دفن کرنے کے لیے قبریں بناتے دکھائی دیتے۔

سڑکوں پر انہیں غلاموں کے وہ قافلے ملتے جنہیں تاجروں نے شمال کی طرف دمشق بھیجنے کے لیے ترک سپاہیوں سے خریدا تھا۔ اسی وقت عمر کو خراسان سڑک پر زوئی اور یرماق کے ساتھ سفر کرنا یاد آ گیا۔

عمر امیر عزیز کے خیمے میں رک گیا کیونکہ بمباشی کا کہنا تھا کہ رات کے وقت بیت المقدس کے اندر قیام کرنا محفوظ نہ ہوگا۔ بہر حال دن کے وقت عمر مسجد اقصیٰ کی زیارت کرنے گیا جو جنگ کے اثر سے بالکل محفوظ رہی تھی۔ عمر نے دیکھا کہ مسجد کے مرمریں احاطے میں ان ملاؤں کا ہجوم ہے جو فوج کے ساتھ آئے تھے اور جو اب مسجد اقصیٰ پر قابض ہو گئے ہیں۔ منبر پر بیٹھا ہوا امام خلیفہ بغداد اور سلطان ملک شاہ کا خطبہ پڑھ رہا ہے۔ مصری مولوی شہر چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ ہجوم سے بچنے کے لیے عمر مسجد کے گنبد میں چلا گیا۔ یہاں کھڑکیوں کے شیشوں پر رنگ ہونے کی وجہ سے کچھ اندھیرا سا تھا اور خاموشی بھی۔ یہاں عمر نے اس پتھر کو بوسہ دیا جو مسلمانوں کے نزدیک سنگ اسود کے بعد سب سے متبرک پتھر ہے۔ نیم کافر حبشی سپاہی بھی اس کے ساتھ احتراماً سجدے میں جھک گئے، لیکن وہ گنبد کے مرمریں ستونوں اور سنہری پچی کاری کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

عمر نے سجدے سے اٹھایا تو کسی نے آہستہ سے کہا ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ''۔

''وعلیکم السلام'' عمر نے جواب دیا۔ اور مڑ کر دیکھا تو حسن بن صباح ایک شخص کو ساتھ لیے اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس مرتبہ حسن زائروں کا سا لباس پہنے تھا اور

اس دفعہ اس نے عربی زبان میں جس میں اسے اتنی ہی مہارت تھی جتنی کہ فارسی میں، بات چیت شروع کی۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''الحمد اللہ کہ اس نے مجھے میرے دوست سے پھر ملایا۔ کیا تم یہ معلوم کرو گے کہ پتھر کے اس گنبد میں پتھر کے علاوہ اور کیا ہے؟''

سب لوگ حسن کو دیکھنے لگے۔ حسن میں یہ وصف تھا کہ جب وہ بولتا تو ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ لوگ اس کے اور قریب آ گئے اور اس نے انہیں سمجھانا شروع کیا کہ اس پتھر پر جو نشان ہے وہ حضور نبی کریم ﷺ کا نقش پا ہے۔ یہ نقش پتھر پر اس وقت بنا تھا جب آنحضرتؐ اس مقام سے عرش پر تشریف لے گئے تھے، اور اس پتھر کے کناروں پر جو سوراخ ہیں وہ حضرت جبرئیل کی انگلیوں سے اس وقت بنے تھے جب انہوں نے اس پتھر کو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ جانے سے روکا تھا۔ حبشی سپاہی اس معجزے کا ثبوت دیکھنے کے لیے اور قریب آ گئے اور تعجب سے بلند آوازیں لگانے لگے۔

حسن نے بتایا کہ ''نیچے وہ غار ہے جہاں قیامت کے دن روحیں جمع ہوں گی۔ آؤ! میرے پیچھے آؤ!''

اس نے ایک چراغ جلایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسن ہر چیز سے واقف ہے۔ حسن نے ایک مولوی سے اس غار میں اترنے کی اجازت مانگی اور سرگوشی کے انداز میں وہاں کچھ روحانی نشانیوں کی طرف اشارہ کیا۔ حبشی سپاہی جو خود اور زرہ بکتر پہنے تھے خوف زدہ ہو گئے، لیکن حسن کے ساتھی نے جو ایک توانا شخص تھا اور کفتان پہنے تھا، عمر سے کہا کہ اس غار میں تو بمشکل بیس سے زیادہ روحیں نہ آ سکیں گی تاوقتیکہ وہ ذرات سے بھی چھوٹی نہ بن جائیں۔

زیارت گاہ میں داخل ہو کر حسن نے چراغ ایک ستون کی طرف کر کے کہا۔ ''عرصہ ہوا کہ اسلام کے ایک خلیفہ نے حضور نبی کریمؐ کے انتقال کے بعد ان الفاظ کو سنہری حرفوں میں لکھوایا تھا۔ سامنے دیکھو!''

عمر نے دیکھا کہ خط کوفی میں کوئی عبارت تحریر ہے، لیکن وہ اس کو آسانی سے پڑھ نہ سکتا تھا۔ حسن نے یہ عبارت روانی سے پڑھ کر سنائی:

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کا کوئی شریک ہے..... یقیناً ابن مریمؑ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ لہٰذا خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں۔ یاد رکھو کہ اس میں تمہارے لیے بہتری ہے۔"

حسن نے عمر کا شانہ پکڑ کر کہا۔ "جب سے یہ الفاظ لکھے گئے ہیں انہیں بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے اور پڑھا تو ان سے بھی کم لوگوں نے ہے..... لیکن ان کا مطلب کس نے سمجھا ہے؟ لیکن تم یاد رکھنا اور غالباً تم ان کا مطلب سمجھو گے۔"

ہجوم سے پریشان ہو کر حسن نے عمر کو ساتھ لیا اور باہر نکل آیا۔ وہ اسے شہر کی تنگ گلیوں میں لے گیا۔ حسن راستے میں عمر کو وہ چیزیں دکھاتا جاتا تھا جن پر کسی اور کی نظر نہ پڑتی۔ حسن کا ساتھی ان کے پیچھے پیچھے اپنے خیالات میں غرق چل رہا تھا۔

حسن نے ایک جگہ ٹھہر کر کہا۔ "یہ وہ محراب اور کھڑکی ہے جہاں سے سلطنت روما کے اعلیٰ حکام نے یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں سے اس وقت گفتگو کی تھی جب حضرت عیسیٰ روح اللہ کو صلیب پر چڑھانے کے لیے سپاہیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اب اس پہاڑی کو جس پر صلیب نصب کی گئی تھی عیسائیوں نے بھلا دیا ہے۔"

حسن بن صباح مسلح ترک دستوں کو ہٹاتا اور سڑکوں پر مال غنیمت کے متعلق بحث کرتا جاتا تھا، اس نے مسکرا کر کہا کہ ہمیشہ سے بیت المقدس کا یہ مقدر رہا ہے کہ بادشاہوں کی فوجیں اس کی شہر پناہ کو توڑیں اور اس کے باشندوں کا قتل و خون کریں۔ جی ہاں! تھوڑی ہی مدت میں اور ہمارے آقا حضورﷺ کی آخری زندگی میں فارس کے بادشاہوں نے یہودیوں کے اکسانے پر اس شہر کو تباہ کیا اور پھر قیصر روم ہرقل کی فوجوں نے دوبارہ اس شہر کو واپس لے لیا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے یہودیوں کا زبردست کشت و خون کیا۔ ہمارے خلیفہ دوم حضرت عمرؓ جب اس شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے پرامن طریقہ اختیار کیا اور کشت و خون سے دامن بچایا۔ حرم کے پتھر کو تم دیکھ چکے ہو انہوں نے اس کو گندگی اور کوڑے کرکٹ سے صاف کیا۔ حقیقت میں یہ وہی پتھر ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے معبد میں لگا ہوا تھا۔ لیکن اب اب ان ترکوں نے جہالت کے باعث قتل و غارت کی۔ ان کی حکمرانی دیرپا ثابت نہ ہو

گی کیونکہ نئے غنیم ان سے یہ شہر چھین لیں گے۔"

اس کے ساتھی نے پوچھا۔ "کون سے غنیم؟"

حسن بن صباح نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "یہ راز تو غیب کے پردے میں ہے میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں سے بیت المقدس چھن جائے گا۔ جی ہاں! کوئی نیا اور زبردست غنیم ان سے یہ شہر چھین لے گا، کیونکہ انہوں نے یہاں جنگ کی ہے۔ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں۔ یاد رکھو کہ اس میں تمہارے لیے بہتری ہے، لیکن حق بتانے والی تحریر پر کون توجہ کرے گا؟"

عمر کے ذہن میں نظام الملک اور سلطان ملک شاہ کا خیال ابھرا جو اپنی وسیع و عریض سلطنت کا نقشہ بنا رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے ننگے سر لوگوں کو اپنے مردے دفن کرتے یا خانقاہوں کی جلی ہوئی دیواروں کے منظر نہیں دیکھے تھے۔ حسن کے پرجوش الفاظ نے عمر کو بہت متاثر کیا۔

دوسرے آدمی نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ انسان تین خداؤں کو مانتے ہیں۔ ایک یہودیوں کا خدا یہووا ہے۔ دوسرا عیسائیوں کا خدا ہے اور تیسرا قرآن شریف کا اللہ ہے۔"

حسن نے کہا۔ "تینوں مرتبہ تو نے ایک ہی خدا کا نام لیا ہے۔ اگر ایک ہی خدا کو مانا جائے تو کیا حرج ہے۔ کاش یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو اس حقیقت کا بھی کچھ ادراک ہوتا کہ اللہ سے بھی بڑی ایک ہستی ہے..... (نعوذ باللہ)"

حسن یکایک بولتے بولتے رک گیا اور اپنے گرد ایک متجسس نظر ڈال کر انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ انہیں پھر حرم کی طرف واپس لے چلا لیکن اس دروازے کی طرف مڑا جو مشرق کی جانب کھلتا تھا۔ وہ اس قبرستان میں پہنچے جو شہر پناہ سے بالکل ملا ہوا تھا۔ یہ راستہ ایک چٹیل وادی کے اندر جاتا تھا اور اس کے قریب ہی ایک خشک نالے کے کنارے سلطان کے سپاہی ان بھیڑ بکریوں کو ہنکا کر لے جا رہے تھے جنہیں وہ دیہات سے لوٹ کر لائے تھے۔ عمر کے محافظ سپاہیوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ بھیڑوں کے گلے کے درمیان سے گزرنا چاہتا ہے آگے بڑھ کر بھیڑوں کو ہٹایا اور راستہ بنانے کی

کوشش کی۔ سلطان کی فوج کے سپاہیوں نے عمر کے محافظوں کی شاہی وردی دیکھی تو وہ بھی ان کی مدد کرنے لگے۔

حسن بن صباح کے ساتھی نے عمر سے مسکرا کر کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی فوجیں تمہاری غلام ہیں۔'' یہ شخص بھاری جثے کا آدمی تھا اور بھاری بھاری قدموں سے چلتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے تجربہ کاری اور چالاکی ٹپکتی تھی۔ وہ جچے تلے انداز میں بولتا تھا اور اس کی باتوں سے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنا محال تھا۔ حسن بن صباح اسے اقرونوس کہہ کر پکارتا اور یہ کہا کرتا تھا کہ وہ تمام تاجروں کا دادا ہے۔

''کیوں نہیں، فوجیں سلطان کا حکم مانتی ہیں اور استاد عمر سلطان کو منصوبہ بنا کر دیتا ہے؟ عمر صرف شاہی منجم ہی نہیں بلکہ وہ نوجوان سلجوقی بادشاہ کا خاص مشیر اور پیشین گوئی کرنے والا بھی ہے۔'' حسن نے اپنے ساتھی کو بتایا۔

اقرونوس نے عمر کو نگاہوں میں تولنے والے انداز سے دیکھا۔ اب وہ ایک پتھریلی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے، ان کے راستے میں زیتون کے درختوں کا ایک جھنڈ بھی پڑا۔ ان بل کھائے درختوں میں انہوں نے ایک عیسائی پادری کی لاش دیکھی۔ پادری سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ صلیب کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور کٹا ہوا سفید سر پتھروں میں چمک رہا تھا۔ حسن نے کہا۔ ''یہ عیسائیوں کی عبادت گاہ ہے۔ جس پہاڑی پر ہم چڑھ رہے ہیں اسے کوہ زیتون کہتے ہیں۔''

شام کے سورج کی کرنیں بے آب و گیاہ پہاڑی پر چمک رہی ہیں یہ تینوں آدمی پہاڑی پر خاموش بیٹھے تھے اور ان کے سامنے وادی میں آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ دور مسجد اقصیٰ کا گنبد سورج کی سنہری شعاعوں میں چمک رہا تھا۔

عمر جانتا تھا کہ اس وادی کا نام وادی جہنم ہے، اور مولویوں کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن جب اعمال کا حساب کتاب ہوگا تو جن لوگوں کو جہنم میں جانا ہوگا ان کی روحیں اسی وادی سے گزریں گی۔ نیچے ڈھلان پر اسے عجب شکل کی قبریں دکھائی دے رہی تھی۔ ان قبروں پر اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ سورج آگ کے گولے کے مانند سرخ ہو گیا تھا اور بیت المقدس کے میناروں کے قریب ڈوبتا نظر آ رہا تھا۔

قریب ہی کچھ بوڑھے قطار باندھے آہستہ آہستہ پہاڑی سے وادی میں اتر رہے تھے۔ ان میں ہر شخص اپنے سے آگے والے کا کپڑا یا کندھا پکڑے ہوئے تھا اور وہ لڑکھڑاتے اور گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کا سر آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور کوئی سر جھکائے تھا۔ کیونکہ یہ سب اندھے تھے۔

حسن یکا یک چیخ کر بولا۔ ''دیکھو! وہ ہمارا قافلہ جا رہا ہے۔ ہاں! ہم آسمان کو دیکھتے اور اندھی آنکھوں سے زمین ٹٹولتے ہیں۔ کاش ہمیں حقیقت کا علم ہو سکتا۔''

اقرونوس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ہمیں کافی معلومات ہیں۔

حسن نے سورج کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھی وہ بولا۔ ''نہیں ہم اندھے ہیں۔ ہمیں صرف گذشتہ کے متعلق علم ہے۔ پرانے پتھروں اور مدفون ہڈیوں کے علاوہ ہمارے نزدیک اور کیا چیز متبرک ہے؟ اگر قرآن شریف کے بتائے ہوئے اللہ سے بھی بڑا کوئی اللہ ہو تو کیا ہو؟'' (نعوذ باللہ!)

اقرونوس خاموش تھا۔ وہ انگلیوں سے اپنی داڑھی میں کنگھی کر رہا تھا۔ اور عمر ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ گیند کو دیکھنے میں محو تھا۔ لیکن حسن بن صباح اس وقت تقریر کرنے کے جوش میں تھا۔ وہ ایک نئے خدا کا پرچارک تھا جس تک عقل انسانی کی پہنچ نہیں۔ اس نے کہا کہ ماضی کے تمام مذاہب اس آخری منزل پر پہنچنے کے زینے ہیں۔ کسی حد تک ہر مذہب نے انسانوں کو علم کی روشنی دی ہے اور اسی طرح ان چھ نبیوں نے بھی جن کے نام آدمؑ نوحؑ ابراہیمؑ عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ وقت کب آ جائے جب ساتواں نبی پیدا ہو اور آخری حقیقت کو ظاہر کرے۔''

''لیکن یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ نبی ہے؟'' اقرونوس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

یہ معلوم ہو جائے گا، کیونکہ ماضی میں جب اس کے ظہور کا وقت نہ تھا وہ ہمارے ساتھ رہ چکا ہے۔ وہ امیر المومنین علیؓ المرتضیٰ کی نسل میں ساتواں امام ہوا ہے اور شیر خدا کے روحانی اوصاف کا وارث ہے۔ کچھ لوگ اسے ساتویں امام اور کچھ اسے نقاب پوش کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ امام غائب مہدی ہے جس کا ہمیں انتظار ہے۔''

سورج شہر کی دیوار اور میناروں کی آڑ میں ڈوب چکا تھا۔ اقرونوس نے ایک سرد آہ بھری۔

حسن نے تقریر کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا کہ ''مہدیؑ اس وقت بھی موجود تھا جب اس سرزمین میں حضرت موسیٰ السلام نے ید بیضا اور روح اللہ نے دم عیسیٰ کے معجزے دکھائے۔ اور وہ پھر آئے گا۔''

عقب میں کسی شخص کے چلنے کی آواز آئی۔ عمر کے محافظ سپاہیوں میں سے ایک سپاہی نے جو حسن کی عالمانہ گفتگو کے دوران میں اونگھتا رہا تھا۔ چونک کر کہا کہ اب خیمے کو واپس چلنے کا وقت آ گیا ہے۔ حسن مسکرایا۔ وہ بھی اب واپس جانا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''سپاہی خواہ وہ روسی ہو یا ترک۔ آخری فیصلہ اسی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔''

اپنے خیمے میں آ کر عمر نے، منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا۔ لیکن کوہ زیتون پر اس نے جو دھندلی دھندلی روشنی دیکھی تھی اسے بہت دیر تک اس کا خیال آتا رہا۔ ابھی وہ آرام کرنے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ تاجر اقرونوس اس کے خیمے میں آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکا سفید ریشم کا ایک تھان سر پر اٹھائے داخل ہوا اور خیام کے قدموں میں ڈال دیا۔

''ایک ناچیز تحفہ۔'' اقرونوس نے کہا۔ ''اس ملاقات کی یادگار کے طور پر اگر ایک بے بضاعت تاجر عالیجاہ کی کوئی خدمت کر سکتا ہو تو.....''

حسن کے متعلق تیری کیا رائے ہے۔''

اقرونوس نے اپنی بھوری داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

''دیکھنے میں تو وہ کچھ دیوانہ سا نظر آتا ہے لیکن اس سے زیادہ وسیع معلومات رکھنے والا کوئی دوسرا شخص میں نے اب تک نہیں دیکھا۔ بہت سے لوگ ہیں جو اس کے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں..... میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ عالیجاہ کسی کے جویا ہیں۔ میں نے کارواں سرائے میں اڑتی سی ایک خبر سنی تھی۔''

''کیا؟''

''کئی مہینے گزرے میں نے سنا تھا کہ مشہد کا ابوزید نامی ایک پارچہ فروش جس نے نیشاپور میں اپنی دوسری شادی رچائی تھی.....'' اتنا کہہ کر اس نے عمر کو تجسس کی نظر

سے دیکھا۔

''پھر اس کا کیا ہوا؟''

''وہ چند روز حلب میں مقیم رہا پھر شمال کی جانب چلا گیا۔ لیکن اس واقعے کو کئی مہینے گزر رہے ہیں۔''

عمر نے ایک گہرا سانس لیا۔ آخر اسے اتنا تو معلوم ہوا کہ یاسمین حلب آئی تھی، اور شاید اب کہیں اس کا پتا چل جائے۔

''تو میرے لیے دو تحفے لایا ہے۔'' عمر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس صلے میں اپنی طرف سے میں تجھے کیا پیش کروں۔''

''جی، میرے لیے۔ آپ کی نوازش ہی کافی ہے۔'' اقرونوس نے ذرا تامل کیا۔ ''البتہ آپ ذرا حسن کا خیال رکھیں۔ وہ ہمیشہ آپ کا دوست رہے گا۔ ممکن ہے کسی وقت اسے آپ کے دامن فیض سے مستفید ہونے کی ضرورت پیش آ جائے۔''

اقرونوس سلام کر کے رخصت ہو گیا تو عمر کے دماغ میں کچھ یادیں ابھر آئیں۔ وہ اٹھ کر نظام الملک کے خطوط کے صندوقچے تک گیا اور اس میں سے ایک خط نکال کر غور سے پڑھنے لگا، جس میں اسے ایک ملحد جماعت کے فتنے سے خبردار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وزیر مختار نے اپنے بلیغ انداز میں لکھا تھا۔ ''یہ لوگ ایک مہدی کے ظہور کی تبلیغ کرتے ہیں جو اسلام کے قوانین اور تمام موجودہ بادشاہوں کا خاتمہ کر دے گا اور وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ان کا مذہب دنیا کا ساتواں اور آخری مذہب ہے۔ وہ اس مردود کے پردوں میں پوشیدہ طور پر تبلیغ کر رہے ہیں جس نے اپنے آپ کو خراسان کا نقاب پوش مشہور کر رکھا ہے۔ جب یہ دشمنان دین اپنے قبیح جھوٹ کا پرچار کرتے ہیں تو سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ خدا ان خبیثوں کو دائمی عذاب میں مبتلا کرے۔''

عمر نے سفید ریشم کے تھان پر ایک نظر ڈالی اور مسکرایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کپڑے کو نظام الملک نے دیکھا ہوتا تو حالت غیظ و غضب میں کبھی کا نذر آتش کر دیا ہوتا، لیکن عمر نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس کی ایک نفیس عبا تیار کرائے گا۔

بارھواں باب:

ساعت رنگیں

چھ درویش اونی کمبل اوڑھے حوض کے کنارے بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک کبڑا بھی چیتھڑوں میں لپٹا بیٹھا تھا۔ اپنی لکڑی کے سہارے جھکا ہوا وہ اپنے قریب سے گزرنے والوں کے سامنے اپنا ٹیڑھا ہاتھ پھیلا کر خدا کے نام پر مانگ رہا تھا۔ لوگوں ڈھیلی ڈھالی عبائیں پہنے اپنی بھری ہوئی خورجیاں یا صندوق اٹھائے اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ نقاب پوش عورتیں ایک دوسرے کے کانوں میں چپکے چپکے اپنے سودے سلف کی باتیں کرتی ہوئی آ جا رہی تھیں۔ کمسن لڑکیاں اپنے شیر خوار بھائیوں اور بہنوں کو اپنی لچکیلی کمروں پر اٹھائے لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک مال دار عرب کے خچر کے گلے کی گھنٹیاں بجتی جا رہی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں میں سکے لیے انہیں شمار کر رہا تھا۔

''میں مصیبت زدہ ہوں'' کبڑے نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں زور سے کہا۔ ''مصیبت زدہ پر رحم کرو۔ خدا کے نام پر.....''

''نوحہ گر! کرائے کا رونے والا'' عرب نے بڑبڑاتے ہوئے ایک سکہ اس کے کشکول میں ڈال دیا اور سکوں کی تھیلی زین میں اڑس لی۔

''یا ہو! یا حق! رحم کرو۔ بیماروں کو اللہ کے نام پر دو۔''

''تو مسجد میں جا کر کیوں نہیں بیٹھتا۔'' ایک ملا بڑبڑایا، جس کی عبا زمین پر گھسٹتی جا رہی تھی۔

میں ایک ایسی ہستی کے لیے بھیک مانگ رہا ہوں جو نان شبینہ کی محتاج ہے۔''

وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن فوراً ہی ایک عورت کبڑے فقیر کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس کے بغل میں ایک گٹھڑی تھی۔ ''یہ لیجیے۔'' اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس گٹھڑی میں سے نکال کر کبڑے فقیر کو دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس درویش کی خدمت میں حاضر ہے جو خشوع وخضوع سے آہ وزاری کرتا ہے۔'' (تمام عورتیں یہ سمجھتی تھیں کہ سب درویش دنیا والوں کے گناہ بخشوانے کے لیے خدا کے سامنے آہ زاری کرتے ہیں)۔

''ہاں۔ یہ اس کے لیے ہے جس نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔'' کبڑے نے روٹی کا ٹکڑا لیتے ہوئے کہا۔

ایک اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سوار۔ بھاری نقرئی کام کا خلعت پہنے، عمر خیام، جو سلطان کے دربار سے واپس آ رہا تھا۔ ادھر سے گزرا۔

''میرے آقا!'' کبڑے نے اس کے طرف دوڑتے ہوئے چلا کر کہا۔

جب اس نے رکاب پکڑی تو اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

''حضور ٹھہر جائیے! میں دو سال دس ماہ سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔''

اس مضطرب چہرے کی طرف جھک کر دیکھتے ہوئے۔ عمر کو یاد آیا کہ یہ وہی شاہی مسخرا ہے جو ایک بار چشمے کے پانی میں چاند کا عکس دیکھ کر اس کے ڈوب جانے پر رویا تھا۔ ''جعفرک'' بے ساختہ عمر کی زبان سے نکلا۔ وہ اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں اور سفید گدھے کی عدم موجودگی پر حیران سا ہو رہا تھا۔

''جعفرک! تیرا یہ حال ہو گیا ہے کہ تو اب درویشوں اور فقیروں کے ساتھ رہتا ہے۔ تو نے مجھے یاد کرنے میں اتنی دیر کیوں کی۔''

''آپ کی یاد؟''

''بے شک۔ نقرئی بازو بند آپ کے مکان پر پہنچا کر..... میں..... واپس چلا آیا اور مہینوں انتظار کرتا رہا۔ پہلے تو وہ خوب تندرست ہو گئی۔ کبھی کبھی ہنستی بھی تھی۔ میں ضرور آپ کے گھر لے آتا، لیکن ایک بیوقوف مسخرا ایک حسین عورت کو ساتھ لے کر اتنا لمبا سفر کس طرح کر سکتا ہے؟ پھر! ہمارے پاس پیسہ بھی تو نہ تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ

آپ ضرور آئیں گے۔ کیا آپ نے یاسمین کو فراموش کر دیا؟"

عمر نے اس کا دبلا پتلا بازو پکڑ لیا۔ "کیا وہ یہاں ہے..... اس وقت؟"

"میں اس کے لیے بھیک مانگتا ہوں" جعفرک نے روٹی کا ٹکڑا دکھاتے ہوئے کہا۔

"وہ ہر شام مجھ سے پوچھتی ہے کہ عالیجاہ کی تشریف آوری کی کوئی اطلاع تو نہیں آئی۔"

عمر تڑپ اٹھا۔ "مجھے اس کے پاس لے چل۔"

لگام پکڑ کر جعفرک اس انبوہ میں سے گھوڑے کو نکال کر ایک گلی میں لے آیا وہ پاؤں گھسیٹتا ہوا ساتھ ساتھ چلتا رہا لیکن روٹی کا ٹکڑا بدستور اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔

"اف، بیماری کے عفریت نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔" اوپر کی طرف سر اٹھا کر اس نے کہا۔ "تھوڑی دیر انتظار کرنا عالیجاہ کو ناگوار تو نہ ہوگا؟ بس ذرا سی دیر۔ میں جا کر اسے مطلع کروں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کرشمہ دکھایا ہے۔"

جب جعفرک ایک لوہار کی دکان کے برابر والے دروازے میں غائب ہو گیا تو عمر گھوڑے سے اتر پڑا اور گھوڑے کے شانے کی طرف جھکتے ہوئے اس نے خود سے کہا کہ یاسمین اس سڑک پر اوپر والے کمرے میں موجود ہے۔ آخر کار جب جعفرک نیچے اتر کر آیا۔ تو مسخرے نے مسکراتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرے۔

"اوہو۔ کیا نیرنگیٔ زمانہ ہے۔ یا تو اتنے زمانے تک ایک معصوم فاختہ کی طرح خاموش تھی۔ یا اب یہ عالم ہے کہ پھڑ پھڑا رہی ہے۔ کپڑوں میں بسانے کے لیے عطر چاہیے۔ ہاتھوں میں رچانے کے لیے مہندی اور آنکھوں میں سرمہ لگانے کے لیے پریشان ہے اور کہہ رہی ہے کہ میں عالیجاہ سے عرض کر دوں کہ پہننے کے لیے اس کے پاس ریشمی کپڑے نہیں ہیں....."

"کیا وہ مجھ سے ملنے کو تیار ہے؟ میں اوپر جا سکتا ہوں؟"

اندھیرے زینے میں پتھریلی سیڑھیوں پر ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کرتا ہوا وہ درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا چلا گیا جہاں دھندلی دھندلی شکلیں اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

حتیٰ کہ وہ چھت پر پہنچ گیا جہاں سنتروں اور گیلے کپڑوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں چھپر کے نیچے میلے کچیلے گدے پر یاسمین لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے صرف اس کی آنکھوں سے پہچانا۔

"میری جان آرزو" عمر نے گھٹنوں کے بل جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"میرے آقا۔ تم کتنے شان دار نظر آتے ہو..... ہائے میرے پاس تو ٹاٹ کا ایک بوسیدہ ٹکڑا بھی نہیں کہ تمہیں اس پر بٹھا سکوں....." اس کا سانس پھول کر حلق میں اٹک گیا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے بازو عمر کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ عمر نے یاسمین کے رخساروں پر گرم گرم آنسو محسوس کیے۔

یاسمین کو ذرا قرار آیا تو وہ کھسک کر عمر کے پہلو سے جیسے چپک گئی۔ عمر نے دیکھا کہ اس کا چہرہ کس قدر پیلا پڑ گیا ہے۔ صرف اس کی زلفوں کی خوشبو اور سیاہ آنکھیں جو محبت سے بھرپور ہیں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔

"جب میں بیمار تھی تو میں ستاروں کو اوپر آتے اور گزرتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی۔" اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "کیوں کہ یہ وہی ستارے تو تھے جو "بیت النجوم" کے اوپر نظر آتے تھے..... کیا پردے پر اژدہے کی تصویر اب بھی وہاں موجود ہے ہاں۔"

"جان جاں۔ میں آج بھی کمرے کر ہر چیز کو تصور میں دیکھ سکتی ہوں..... کیا سب چیزیں ویسی ہی ہیں؟"

"ہر چیز۔ اپنی جگہ موجود ہے اور تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

یاسمین نے پھریری لیتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ "میں بھی یہی سمجھتی تھی۔ لیکن میں ستاروں کے نام یاد نہیں رکھ سکی۔ بجز جوزا اور ایک دو اور ستاروں کے۔"

مجھے جعفرک نے اور بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم ہمارے آقائے ولی نعمت سلطانؒ کے دربار میں بہت بڑے آدمی ہو گئے ہو..... تمہاری آستین پر کس قدر خوبصورت نقرئی کام بنا ہوا ہے۔"

"میں تیرے لیے خطائی ریشم کے کپڑے لاؤں گا اور زرکار پاپوش" "اور ا..ک کی مٹھائی بھی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "نہیں نہیں! ہمیں عمدہ قسم کی ضیافت کرنی

چاہیے، اور اس میں پینے کے لیے شربت بھی ہوں۔"

"تیرے ہونٹوں کی شراب بھی ہو۔"

یاسمین نے شرماتے ہوئے عمر کے رخساروں کو چھوا، اور بڑی پیاری نظروں سے اس کے نفیس چمڑے کے بنے ہوئے گھڑ سواری کے جوتوں کو دیکھا۔ "کاش میں تندرست ہوتی۔ میں جب یہ سوچتی ہوں تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ واللہ تیری کنیز اپنی خوبصورتی کھو چکی ہے!"

"میری محبوبہ! تو اب پہلے سے بھی حسین ہے۔"

"یاسمین نے بے اختیار اپنی انگلیاں عمر کے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ عمر نے ان کو چوم لیا، لیکن یاسمین نے توجہ بھی نہ کی۔ "اچھا یہ بتاؤ..... ذرا میری طرف دیکھو۔ چپ چاپ۔ کیا تم نے شادی کر لی ہے اور تمہاری وہ بیوی ستاروں کے محل والے میرے کمرے میں سوتی ہے؟"

کیسی شادی اور کیسی بیوی؟ عمر نے نفی میں سر ہلایا اور وہ مطمئن ہو گئی۔

"تمہارے ساتھ کیا بیتی۔ مجھے بتاؤ۔ عمر نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا.....

یاسمین نے کہا۔ جب میری شادی ہوئی تو میرا دماغ جل اٹھا، اور میں نے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ جب ..... جب ابوزید نے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا۔ میں دل برداشتہ ہو گئی اور پھر مجھے بخار آ گیا..... مجھے بند محملوں میں بٹھا کر ادھر ادھر سفر کراتے رہے۔ خدا جانے میں کہاں کہاں گئی۔ کوہستانی علاقے کی ایک سرائے میں میں نے کبڑے جعفرک کو دیکھا جسے مجھ پر ترس آ گیا۔ میں نے جلدی سے اسے نقشین نقرئی بازو بند دیا اور خوشامد درآمد کر کے اسے راضی کر لیا کہ وہ تمہارے پاس نیشاپور میرا پیغام لے جائے جہاں وہ جا رہا تھا۔ لیکن یہاں حلب میں میرا خاوند مجھ سے خفا ہو گیا اور اس نے کہا کہ میں نے اس کی توہین کی ہے۔ اس کا مذاق اڑایا ہے۔ اس نے گھر سے باہر جا کر گواہوں کی موجودگی میں مجھے طلاق دے دی۔ کیونکہ میں بیمار تھی۔ بددماغ تھی۔ اس کے بعد وہ چلا گیا....."

"مجھے بازو بند یا تیرے پیغام کا مطلق علم نہیں ہے۔" عمر نے سے حیرت کہا۔

"لیکن اب میں ایک مطلقہ عورت ہوں....."

"نہیں نہیں! عمر نے اس کا درد محسوس کرتے ہوئے کہا۔ تم تو وہ دوشیزہ ہو جس کی اب شادی ہونے والی ہے..... میری حور! بس ایک گھنٹہ اور گزرے گا کہ تو میری ہو جائے گی۔"

"اس حور کے پاس نہ حسن ہے نہ دولت۔"

یاسمین نے دکھ بھری آواز میں کہا لیکن اس تصور سے اس کا چہرہ سرخی سے دمکنے لگا اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ عمر کے جانے کے بعد وہ گدے پر لیٹ گئی۔ اس کے تمام جسم میں درد ہو رہا تھا۔

باہر سڑک پر آ کر عمر نے جعفرک کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام لی۔ "میں قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تا کہ میں یاسمین کو اپنے حبالہ عقد میں لے لوں۔ آج ہی شام تک ..... تم حلوائی کی دکان پر جاؤ..... لو یہ بٹوا لو۔ مٹھائیاں اور حلوا خوان میں چن کر لے آؤ، اور شربت بھی اور سرخ شراب بھی۔ محلے کی تمام لوگوں کو اس تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دو اور ہاں۔ باجے والوں کو بھی لاؤ۔ اور شمع برداروں کو بھی ..... چھت پر روشنی کا انتظام کرو..... خدا کے لیے اس میں کوئی تساہل نہ ہونے پائے!" وہ لپک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور چل دیا۔ اس نے حیرت سے تکتے ہوئے چہروں اور فقیروں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔

"مومنو!" جعفرک نے نقدی کی تھیلی اوپر اٹھاتے ہوئے پکار کر کہا.....

"مومنو! آؤ! یہاں دعوت عام ہے۔"

نقاب پوش یاسمین کی موجودگی کے قوی احساس کے ساتھ عمر نے قاضی کی خشک آواز کو سنا جو اس کے قریب قالین پر بیٹھا ہوا تھا..... "ایک کتب فروش کی دختر۔ اور اس کا جہیز کیا طے ہوا ہے؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کون کون سی املاک وہ تمہارے سپرد کرنا چاہتی ہے۔"

قاضی کی پشت پر بیٹھا ہوا کاتب شادی کی شرائط لکھتا جا رہا تھا۔

"املاک" عمر مسکرایا۔ زلفیں اتنی سیاہ جیسی کالی آندھی، کمر اتنی خوبصورت جیسے

سرونو دمیدہ..... اور دل جو محبت کے علاوہ ہر چیز سے نا آشنا ہے۔ اس سے زیادہ اسے کوئی اور چیز مجھے پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ذرا جلدی کیجئے۔

''لکھو۔ قابل اعتنا قیمت کی کوئی چیز نہیں۔'' قاضی نے کاتب کو ہدایت دی۔ ''اور اب یہ فرمایئے کہ عالیجاہ اسے کیا عنایت فرمائیں گے۔''

''ہر چیز جو میرے پاس ہے۔''

قاضی نے کہا۔ عالی جاہ نکاح نامہ میں معقول شرائط درج کی جاتی ہیں۔ ہمیں تفصیل درج کرنا ہوگی کہ حق مہر میں کیا دیا جا رہا ہے۔ املاک منقولہ وغیر منقولہ کیا ہوں گی۔ زمین کہاں اور کتنی ہوگی۔ اس کی اندازاً قیمت کیا ہوگی۔ غلاموں کی تعداد اور ان کی قیمت وغیرہ۔

عمر نے پیچھے مڑ کر کاتب سے کہا۔ ''لکھو قابل قدر قیمت کی ہر چیز۔

قاضی پریشان ہوگیا۔ ''رب کعبہ کی قسم نکاح کی ایسی شرائط کبھی کسی نے نہ سنی ہوں گی؟ اور پھر اس طرح کی بات دوسروں کی حق تلفی ہوگی۔

عمر نے پیچھے مڑ کر طشت میں سے مٹھی بھر اشرفیاں اٹھائیں اور قاضی کے منہ میں بھر دیں۔ پھر دو مٹھی اشرفیاں گواہوں کی گود میں ڈال دیں۔ سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے کاتب کے ہاتھ سے نکاح نامہ لے کر اس پر گواہوں کے دستخط کروائے۔ حاضرین مرحبا کی صدائیں بلند کرنے لگے۔

''تیرے الفاظ سونے کی طرح قیمتی ہیں۔'' اس نے قاضی سے کہا جو کھانستا جا رہا تھا اور اب ایک پالتو جانور کی طرح جوش عقیدت سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ''آج سے پہلے ایسے سنہری الفاظ کس کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اب نکاح کی تقریب انجام پا چکی ہے۔ شادیانے بجاؤ۔ حاضرین! اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ عمر خیام نے آج کی رات ایک دوشیزہ سے نکاح کیا ہے۔''

عمر اٹھ کر چھت کی منڈیر پہ گیا اور جھک کر سڑک کو دیکھا جو روشنی سے جگمگا رہی تھی اور جہاں فقیر، درویش اور محلے کے بچے جمع تھے۔ شہنائی بج رہی تھی۔ نے نواز ایک محبت بھرا نغمہ گا رہے تھے۔ اور شادیانوں کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی۔

''لوگو! عمر نے چلا کر کہا۔ ''پیٹ بھر کر کھاؤ اور جب مٹھائی ختم ہو جائے تو حلوائی کو بھی کھا جانا۔ بتاؤ! تم میں سے کون ایسا ہے جو خوش نہیں ہے؟''

''نہیں۔ آقائے عمر۔ ہم سب بہت خوش ہیں۔''

''کس کس کو برنج، شیرینی اور شربت نہیں ملا؟''

''اللہ کی قسم، کوئی شخص بھی ایسا باقی نہیں رہا۔''

''اس کے باوجود تم لوگ غریب اور مصیبت زدہ ہو۔ آج کی رات عمر خیام سے زیادہ کوئی مال دار نہیں ہے۔ اس کی دولت کا کوئی شمار نہیں اور نہ کوئی خیام سے زیادہ نشے میں چور ہے۔ کیونکہ کہ آج اس نے جنت کی شراب پی ہے۔ پھر تم بھی غنی ہو جاؤ۔ طشت میں سے اشرفیاں سڑک پر الٹ دو۔'' اس نے اپنے تحویل دار کو حکم دیا۔

''آقا..... پورا طشت؟''

پیتل کا لمبا چوڑا طشت اس سے چھین کر گلی میں الٹ دیا۔ مجمع ٹوٹ پڑا۔ اطمینان و خوشی کا شور بلند ہوا۔ بچے گرد و غبار میں اٹ گئے اور مرد و زن زمین پر گھٹنے ٹیک کر چمک دار سکے چننے لگے۔

عمر نے یاسمین کو اپنے بازوں میں اٹھایا۔ جس نے اپنی لرزتی ہوئی بانہیں عمر کی گردن میں حمائل کر دیں۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ہوا سڑک پر آ گیا جہاں ایک پالکی ان کا انتظار کر رہی تھی عمر نے یاسمین کو نرم گدوں پر لٹا دیا۔ اس نے یہ پالکی مع دو خواجہ سراؤں کے اپنے دوست عزیز سے عارضی طور پر مستعار لی تھی۔

''میری پیاری دلہن۔'' عمر نے یاسمین کے کان میں کہا۔

''آج سے تو ہمیشہ کے لیے میری ہے۔''

خواجہ سراؤں نے پالکی کے دروازے بند کر دیئے اور لوگوں کا وہ جم غفیر جن کے ساتھ یاسمین نے غربت و افلاس کے کتنے ہی مہینے گزارے تھے ایک امیر کبیر کی دلہن کے محافے سے الگ ہٹ گیا۔

''الحمد للہ!'' انہوں نے ایک زبان ہو کر شور مچایا۔ تعریف ہو آقائے دانش کی، جس نے ہمیں اشرفیاں عطا کی ہیں۔ ''خیام مرحبا۔''

"کوئی ہے ایسا امیر کبیر جیسا کہ باب ختا سے آنے والا عالیجاہ امیر عمر۔" ایک درویش نے چلا کر کہا۔

"کوئی بھی نہیں۔" دوسرا دوسرا درویش چلایا۔ "سلامتی ہو اس پر۔"

"خدا اس کا راستہ ہمیشہ صاف رکھے۔"

ایک چھوٹی سی لڑکی گلاب کی پتیاں ایک ٹوکری میں بھرے مجمع میں سے دوڑی ہوئی آئی اور ان پتیوں کو عمر کے گھوڑے کے سموں پر نچھاور کر دیا۔

"کس طرف" ایک خواجہ سرا نے عمر سے استفسار کیا! کیا سلطان کا منظور نظر رہنمائی کی تکلیف گوارا کرے گا؟"

"بازار کی طرف۔"

"لیکن بازار بند ہو چکا ہے۔ عصر کی نماز کے بعد سے بند ہے۔"

"اچھا" عمر نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا جلدی کرو۔"

لمبے تڑنگے سیاہ فام غلام پالکی اٹھائے تھے۔ خواجہ سرا نے جعفرک سے کہا کہ شاید امیر اس وقت نشے میں ہے۔

"تجھے ایسی شراب سے سرشار ہونا زندگی بھر نصیب نہ ہوگا۔"

جعفرک نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

قریبی بازار کے بند دروازے پر انہوں نے ایک عون باشی کو مع نصف درجن نیزہ برداروں کے تعینات پایا اس کے ہاتھ میں ایک چینی قندیل تھی۔ عون باشی نے شان دار پالکی اور خواجہ سراؤں پر نظر ڈالتے ہوئے جو بہت عمدہ لباس پہنے تھے، عمر کو بڑے ادب کے ساتھ سلام کیا۔

"نہیں، عالیجاہ" اس نے عمر کو آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"یہ دروازہ رات کے وقت سلطان کے حکم سے بند رہتا ہے۔"

سلطان کی عنایت و نوازش سے آج کی رات میرے لیے کوئی چیز بند نہیں۔" عمر مسکرایا۔ "لو، یہ انگوٹھی بطور ثبوت اپنے پاس رکھو کہ میں نے تمہیں دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ جلدی کرو۔"

"ارے کمبخت! کیا تو شاہی منجم کو اتنی دیر تک منتظر رکھے گا۔"

جعفرک نے چلا کر افسر کو کہا۔

دس سواروں کے افسر نے انگوٹھی لے لی اور مشکوک انداز سے سر ہلایا۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے پھاٹک کا ایک پٹ کھول دیا اور اپنے ماتحتوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا، جیسے ہی دروازہ کھلا ایک باریش شخص جس کے سر پر سیاہ ٹوپی تھی چپکے سے پالکی کی پیچھے پیچھے بازار کی محراب دار چھت میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ باریش شخص بڑی تیزی سے عمر کی رکاب پکڑنے کے لیے دوڑا۔ "یا خواجہ" اس نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔ "ادھر تشریف لائیے اس طرف۔

زراق کی دکان پر ختن کا ریشمی کپڑا، زبرجد کے آویزے ملاحظہ فرمائیے۔ زراق کے یہاں سونے میں جڑے ہوئے ایسے نفیس لعل اور یاقوت ہیں جیسے کہ حور کے لبوں کی سرخی، کیا امیر دانش چاندی کے جڑاؤ لاجورد خریدنا پسند فرمائیں گے اور مرمریں پیالے، صدفی طشت.....؟"

ایک اور باریش شخص تیزی سے آگے بڑھا۔ دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ "اے غریبوں کے والی۔ ادھر جانے کی تکلیف نہ فرمائیے۔ زراق کی دکان کا تمام سامان یہاں تیار ہوتا ہے۔ بازار حلب کی پشت کی دکانوں پر..... اسے کیا معلوم زبرجد اور سنگریزے میں کیا فرق ہے۔ اس جانب زحمت فرمائیے۔ اپنے غلام شولم انطاکی کی دکان کی طرف۔ اسی ہفتے میرے یہاں زربفت کے تھان آئے ہیں۔ دمشقی زربفت کے، جس پر موتی ٹکے ہوئے ہیں....."

پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ایک تیسرے تاجر نے کہا۔ "کافر کتو۔ یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ دریدہ دہنو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ عالی مرتبت امیر کو اپنی دلہن کی لوریں گردن کے لیے قیمتی جواہرات کی ضرورت ہے؟ اس جانب۔ آقا۔ اپنے غلام سطام کی دکان پر تشریف لائیے، جو سچا مسلمان اور سید زادہ ہے۔"

"تحمل، تحمل؟" عمر نے چیخ کر کہا۔ "میں ہر چیز خریدوں گا اور اس کی قیمت سلطان بہ نفس نفیس عنایت فرمائیں گے، کیونکہ آج کی رات دوبارہ آنے والی نہیں....."

اور جیسے رات پلک جھپکتے میں گذر گئی۔ گرمی کا موسم شباب پر تھا۔ عمر خیمے کے دروازے پر لیٹا یاسمین کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ اور بار بار اپنی انگلیوں پر لپیٹ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک بار پھر زندگی عود کر آئی تھی۔ رات کی سنسناہٹ اب کچھ معنی نہیں رکھتی تھی۔ گذشتہ تین سال کی طویل مدت اس سائے کی طرح معدوم ہو چکی تھی، جو سمندر کی سطح سے بلند ہو کر پھر سمندر ہی میں ڈوب جاتا ہے۔

ستاروں کی دودھیار روشنی میں یاسمین کا صاف شفاف بازو اس کے پہلو میں چمک رہا تھا۔ یاسمین کے سینے پر پڑی ہوئی چادر اس کے سانسوں کے ساتھ ساتھ زیروبم پیدا کر رہی تھی۔ ساج کی خوشبو خیمے کی فضا کو مہکا رہی تھی۔

''میرے دل کی ملکہ کو ابھی تک نیند نہیں آئی'' اس نے سرگوشی کے انداز میں یاسمین سے کہا۔ یاسمین نے عمر کی طرف کروٹ لی۔ ''میں بے حد خوش ہوں۔'' اس نے نحیف آواز میں کہا۔ ''اور..... میں اپنی خوشی کا اندازہ لگا رہی ہوں۔ کیوں؟ ایسا کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟''

''اگر ایسا کرنا غلط ہے تو میں بھی بڑا گنہگار ہوں۔''

اونہوں۔ یاسمین نے اپنی انگلیاں خیام کے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے۔ میری آنکھ اکثر اس وقت کھل جاتی تھی جب تارے ڈوب رہے ہوتے تھے دل تمہیں یاد کر کے تڑپ اٹھتا تھا۔..... ایسے وقت اپنے دل نواز سے دور ہونا کس قدر اندوہناک ہوتا ہے..... اور اس وقت میرا دل اس خوف سے دھک دھک کر رہا ہے کہ خدانہ کرے تو پھر مجھ سے جدا ہو جائے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ ہم دونوں نیشاپور جائیں گے۔ بیت النجوم میں۔ میں سلطان سے واپس جانے کی اجازت طلب کروں گا۔''

''ایسا کرنے کی بھلا تمہیں جرات کیسے ہوگئی؟'' پھر وہ خود ہی ہنس کر کہنے لگی۔ ''میں بھول ہی گئی تھی کہ تم ایک صاحب اقتدار شخص ہو۔ تم میرے لیے کتنے کپڑے اور قیمتی سامان بازار سے خرید لائے ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھکارن سے ایک دم شہزادی بن گئی ہوں۔''

''تو میری زندگی ہے۔ تین سال سے میری روح بیمار تھی۔''

''میں سمجھتی ہوں تمہاری روح بڑی مردانہ ہے۔'' وہ خاموش ہو کر پھر کچھ سوچنے لگی۔ ''کیسا عجیب معلوم ہوتا ہے..... میں..... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے اس وقت سے محبت کرتی ہوں جب تم کتب فروشوں کی گلی میں آتے جاتے تھے اور شروع میں..... نہیں۔ مہینوں تک مجھ پر ایک پریشانی طاری رہی۔..... مجھے ڈر لگتا تھا۔ اس خیال سے مجھے خوف آتا تھا کہ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ تمہیں کیا معلوم کہ لوگوں کا ایک ایک لفظ مجھے کس قدر اذیت پہنچاتا تھا؟ تم اندازہ نہیں کر سکتے..... اور کچھ دن بعد، تمہاری یاد کے سوا، میں نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ جب تم میرے ساتھ ہوتے تھے تو مجھ پر ایک جادو سا ہو جاتا تھا۔ اور جب میں تم سے الگ ہوتی تھی تو میرا تمام جسم کرب واضطراب کی آماجگاہ بن کر رہ جاتا تھا۔

آسمان کی سیاہی آہستہ آہستہ سفیدی میں تبدیل ہو رہی تھی اور خیمے کی اجلی دیواریں اپنی اصلی شکل اختیار کر رہی تھیں۔

''وہ دن اب بیت گئے۔'' عمر نے کہا۔

وہ اس کی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا اور اس کی شفاف جلد کے پھیکے پن کو بھی۔

''سب کچھ گزر گیا بجز اس درد کے۔''

''کیا؟'' عمر نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تجھے اب کس بات کا رنج ہے، یاسمین؟ دیکھ، شمشیر سحر نے رات کا سیاہ پردہ تار تار کر دیا ہے، اور ہم ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ اے میرے دل کی تسکین! اب کوئی غم نہ کر! یہ ہماری محبت کی سحر ہے۔ اس سے جی بھر کے لطف اٹھا۔ یہ ہماری اپنی ہے، اور وہ تمام صبحیں جو اس کے بعد آئیں گی ایسی حسین نہ ہوں گی۔''

''سچ کہتے ہو۔ ایسی نہ ہوں گی۔'' وہ مسکرائی۔

''اور تمام لوگ جو ابھی تک محو خواب ہیں۔ اس بات کو کیا جانیں۔ دیکھ آفتاب کی پہلی کرن سلطان کے خیمے کو بوسہ دے رہی ہے۔ مجھے غسل کر کے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا چاہیے، تاکہ ہم اس پڑاؤ سے روانہ ہو سکیں۔''

''نہیں! جانِ جاں! ذرا اور توقف کرو، چند لمحوں کے لیے تا کہ، تمہارے چہرے پر میں دن کی روشنی کا عکس دیکھ سکوں۔''

عمر جانے کے لیے بیتاب تھا اس نے سلطان سے نیشاپور جانے کی اجازت طلب کی۔ اور جیسے ہی ملک شاہ نے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اس نے سفر کے لیے محافظوں کا ایک دستہ منتخب کیا۔ اونٹوں پہ سامان لد گیا۔ جتنے عرصے میں اس کے غلام بوروں میں سامان بند کر رہے تھے، عمر نے یاسمین کے لیے ایک پردہ دار محمل ڈھونڈ نکالا جسے دو گھوڑوں پر کسا جا سکے۔ اس نے جعفرک کے لیے ایک سفید گدھا بھی خرید لیا۔

''جعفرک۔ اب تجھے بھیک مانگنے کی کبھی نوبت نہ آئے گی۔'' عمر نے کہا۔

مسخرے نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔ ''حضور! میں آپ کو ایک بات یاد دلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ رستم کی طرح طاقتور ہیں، لیکن یاسمین بہت کمزور ہے، وہ اس خوشی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔''

''ہاں تو ایک دانش مند بے وقوف ہے۔''

''نہیں حضور! میں تو ایک لنگڑا لولا ہوں'' جس نے درد و کرب کی چاشنی چکھی ہے، وہی ایک عورت کے احساسات کا اندازہ کر سکتا ہے؟''

سفر پر روانہ ہوتے وقت، جب بڑے بڑے امیر گھوڑوں پر سوار ہو کر، عمر خیام کو کچھ دور رخصت کرنے آئے تو جعفرک اپنے گدھے پر بیٹھا، آگے آگے تھا۔

''اے امرائے نامدار!'' اس نے پیچھے مڑ کر زور سے کہا، ''صرف ایک احمق ہی صاحبان شمشیر کے آگے چل سکتا ہے۔''

اس رات یاسمین کو پہلے تو سردی لگی اور اس کے بعد تیز بخار ہو گیا۔ اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا، لیکن جب عمر پریشان ہونے لگا تو وہ مسکرائی۔

''اصل میں مجھ سے خوشی برداشت نہ ہو سکی۔ میں بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی۔''

تیرھواں باب:

ٹیلے پہ قبر

قافلہ دوسری رات دریائے فرات کے کنارے تمری کی جھاڑیوں سے گھرے ہوئے ایک قطعے میں خیمہ زن ہوا۔ دوسرے دن صبح کو وہ ان کشتیوں پر دریا عبور کر سکتے تھے جو قافلوں کو دریا پار کرانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یاسمین کئی چادروں میں لپٹی ہوئی لیٹی تھی۔ اس کے رخسار تمتمائے ہوئے تھے۔ عمر جب خیمے میں کسی ضرورت سے ادھر ادھر چلتا پھرتا تو یاسمین کی آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔

یاسمین نے دکھ کے ساتھ کہا ''دیکھو تو سہی میں کیسی بدقسمت بیوی ہوں''

''میرا سرتاج میری خدمت کر رہا ہے اور میں لیٹی ہوں۔''

اسے خوش کرنے کے لیے عمر پھول دار شالیں اور موتی ٹکے نقاب اس کی مسہری کے پاس لے گیا۔ یاسمین نے محبت کے ساتھ ان پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ عمر نے اسے ایک چاندی کی تاج نما کلاہ دکھائی جس کی پیشانی پر ایک یاقوت جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ ''بہت خوبصورت ہے'' اس نے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کل میں اپنے بالوں میں کنگھی کر کے اسے پہنوں گی..... کچھ دن بعد ہم اپنے دریا کے کنارے ایک کوشک بنائیں گے..... نہیں، بلکہ اپنا ذاتی تالاب بنوائیں گے جس میں سفید ہنس تیرتے ہوں گے؟''

اور پھر ایک لمحے کے بعد اسے سرسام ہو گیا..... بیماری نے بڑی تیزی سے

اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ عمر نے فوراً جعفرک کو طلب کیا جس نے دیکھتے ہی اپنا منہ پھیر لیا۔

"طاعون" جعفرک نے زیرِلب کہا۔

"نہیں۔ طاعون نہیں ہے۔" عمر نے چیخ کر کہا۔ "غور سے دیکھ! یہ محض بخار ہے۔ خدا سے دعا کر کہ صبح ہوتے تک اتر جائے۔"

اب اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ "سوائے دعا کے۔ جعفرک نے کہا۔"

سردی کم کرنے کے لیے خیمے کے چاروں طرف آگ روشن کر دی گئی جس کے عکس سے خیمے کی دیواریں سرخ نظر آ رہی تھیں یاسمین کراہ رہی تھی اور بار بار اپنا سر تکیے پر پٹخ رہی تھی۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ عمر خیام اس پر جھکا ہوا ہے یا کبڑا جعفرک ایک کونے میں سکڑا ہوا اسمائے الٰہی کا ورد کر رہا ہے۔ آگ بجھ گئی اور اس کا عکس دیواروں پر ناچنا بند ہو گیا۔

یکا یک عمر کی آواز ابھری۔ "قندیل روشن کرو۔ اس نے ابھی مجھ سے کچھ کہا ہے۔ اس نے مجھے چھوا ہے۔ اس کا بخار اتر گیا ہے۔"

جعفرک وہ قندیل لے کر ان کے پاس پہنچا تو یاسمین بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کیے۔ اس کا ایک ہاتھ عمر کی گردن میں حمائل تھا اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

میری زندگی..... میری روح۔"

پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اور جعفرک خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ شاید عمر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جعفرک سمجھ گیا کہ یاسمین کا تنفس بند ہو چکا تھا۔ اس نے قندیل نیچے رکھ دی اور عمر کے کندھے کو پرسہ دینے کے لئے تھپتھپایا۔

خیمے کے چاروں طرف بجھی ہوئی آگ کے گرد قافلے والے بیٹھے رہے حتیٰ کہ ریگستانی ہوا کے ایک جھونکے نے دھند کا پردا چاک کر دیا اور سورج کی سرخ گیند اچھل کر افق پہ آ گئی۔ اس دوران میں کبھی کبھی جعفرک بھی باہر آ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا۔

"وہ ابھی تک خاموش ہے۔" جعفرک نے کہا۔ "وہ اب بھی گلاب سے اس کی بند آنکھیں دھو رہا ہے۔"

"انا اللہ وانا الیہ راجعون" ایک سپاہی نے کہا۔ "اس نے طاعون سے وفات پائی۔"

"وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ مر چکی ہے لیکن وہ اسے عروسی زیور پہنا رہا ہے اور اس کے سینہ بند کو گھنڈیاں لگا رہا ہے۔"

"بہتر تھا کہ وہ صدمے سے بیتاب ہو کر چیختا چلاتا۔ اپنے کپڑے پھاڑتا۔ جیسا کہ لوگ اس قسم کے المناک موقعوں پر کرتے ہیں۔"

"خدا کرے وہ روئے، لیکن وہ روتا کیوں نہیں۔ ہے ہے! وہ زمین پر کیسی ڈھلی ڈھلائی لیٹی ہے۔ کتنی جوان تھی وہ..... اس کی مثال ریگستان کے اس پھول کی سی ہے، جو بارش کے بعد کھلتا ہے اور جسے دوسرے ہی دن ہوا کے تیز جھونکے اڑا لے جاتے ہیں۔"

قافلے کے لوگ بڑی بے چینی سے چل پھر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ بڑی غیر متوقع بات تھی کہ دوران سفر ایک ٹیلے پر ناشپاتی کے درخت کے نیچے انہیں اتنی کشادہ قبر کھودنی پڑے گی اور میت والے خیمے میں پردہ دار محمل لے جانا پڑے گا۔ تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اور تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟ وہ بڑی بے چینی سے اس کشتی کو دیکھ رہے تھے جو دریا کے کنارے کھڑی تھی۔

کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے ایک شخص نے زور دے کر کہا۔ "خدا مصیبت زدوں کی حفاظت کرتا ہے۔"

"بے شمار لڑکیاں ہیں" ایک باتونی سپاہی نے کہا۔ "اسی نقرئی سکوں کے عوض اس وقت بغداد میں....."

"کتے" جعفرک چیخا" ابے گندی نالی میں لوٹنے والے! تجھے کیا معلوم کہ محبت کی آگ میں جلنا اور تڑپنا کیا چیز ہے۔؟"

وہ بکتا جھکتا خیمے میں داخل ہوا اور پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر

بعد باہر آیا اور غلاموں کو حکم دیا کہ محافہ اٹھا کر چوٹی پر قبر تک لے جائیں۔

"جلدی کرو۔" اس نے ڈانٹ کر کہا۔ آقا نے اسے محافے میں لٹا دیا ہے۔ اور اپنے ہاتھوں سے تحائف اس کے پہلو میں سجا دیئے ہیں۔ آقا کا خیال ہے کہ اب اس کی محبوبہ کی رخصتی کا وقت آ گیا ہے۔ آخری سفر پر روانہ ہونے کا۔ جلدی کرو۔ وہ دیکھو وہ خود زمین پر لیٹا ہوا ہے۔"

"ہم جنازہ اٹھانے والے تو نہیں ہیں۔" اونٹوں کے نگہبان نے کہا۔

"یا خدا..... شاید وہ ایک لاش کو کشتی پر نہ لے جانا چاہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ قبر تک لے چلو۔ قبر تیار چکی ہے۔ اب دیر نہ کرو۔"

جعفرک خوفزدہ غلاموں کو اپنے ساتھ لیے خیمے کے پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ "حضور اب ہم چلنے کو تیار ہیں۔ جب تک تمام انتظام مکمل ہو۔ آپ تھوڑی دیر یہیں قیام کریں۔" اور سرگوشی کے انداز میں غلاموں سے کہا۔ "احمقو! جلدی کرو۔ اسے سب کچھ معلوم ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ آہستہ سے۔ ورنہ وہ اٹھ کھڑا ہو گا، اور بولنے لگے لگا۔"

خوف اور اضطراب سے کانپتے ہوئے انہوں نے بھاری محافہ اٹھایا خیمے سے باہر آئے اور تیزی سے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ جنازہ قبر میں اتار کر ہاتھوں اور پیروں سے اسے مٹی اور خس و خاشاک سے بھر دیا۔ اوپر سے پتھر چن کر قبر کی ظاہری شکل مکمل کر دی۔ اس کے بعد وہ بھاگتے ہوئے نیچے اترے اور خیمے کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اونٹوں پر سامان بار کیا جانے لگا۔ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں پر زینیں کس لیں۔

"حضور" جعفرک نے چلا کر عمر سے کہا۔ "ہم تیار ہیں۔ اب کوچ کرنے وقت آ گیا ہے۔"

عمر جب خیمے سے باہر آیا تو اس نے اپنی دستار کے کونے سے اپنے ہونٹ چھپا رکھے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ اڑتی ہوئی خاک، اور اداس اور سنسان دریا کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے انتظار کرتے ہوئے آدمیوں کی طرف، جو ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ دیکھ کر حکم دیا۔ "اس خیمے کو آگ لگا دو اور دفان ہو جاؤ، اور یہ سب

سامان جو تمہارے پاس ہے وہ بھی لے جاؤ۔ میں تمہارے چہرے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ خبردار! تم میں سے کسی کی منحوس صورت اب مجھے نظر نہ آئے!"

"آقا! جعفرک نے احتجاج کیا۔"

"آپ بھی چلئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہاں طاعون ہے۔"

کشتی نے دریا پار کر لیا انسان اور جانور دریا کے دوسرے کنارے پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ عمر خیمے کی سیاہ راکھ سے اٹھتے ہوئے، دھوئیں کو غور سے دیکھتا رہا۔ بل کھاتے ہوئے دھوئیں کی آمیزش سے اڑتی ہوئی دھول بھی سیاہ نظر آ رہی تھی، حتی کہ سورج کی سرخ گیند بھی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے آسمان پر قندیل لٹک رہی ہو۔ خاکستری زمین خالی خالی نظر آ رہی تھی۔ جہاں تک اس کی نگاہ کام کرتی تھی، خلا ہی خلا تھا۔ کارواں کے تمام آثار معدوم ہو چکے تھے اور وہ آگ جس نے خیمے کو بھسم کر دیا تھا اب اس کے دل میں بھڑک اٹھی تھی۔ جل رہی تھی۔ جلا رہی تھی۔ اس کے تمام جسم کو.....

"حضور، جعفرک کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔" وہ بپھرا ہوا دریا ہے۔ موت کا پیش خیمہ۔"

پانی طغیانی کی وجہ سے اس کے قدموں کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے پھسل پھسل کر اس میں گر رہے تھے۔ جعفرک نے اپنا بازو عمر کے کندھے پر رکھ دیا، اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی کے اس طوفان کو دیکھنے کے لیے زمین پر بیٹھ گیا جو اس کے اتنے قریب سے گزر رہا تھا۔

ٹن، ٹن، ٹن۔ اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ایک زنجیر کھڑ کھڑائی اور ایک نئے کارواں کی ایک قطار دریا کے اس پار انتظار کے لیے رک گئی۔ کشتی ایک بار پھر دریا عبور کر کے واپس آ گئی۔ اجنبی لوگ اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے کے لیے لے جانے لگے۔

"نہیں۔ یہ طاعون نہیں۔" جعفرک کی آواز بلند ہوئی۔" آقائے دانش عمر کو بخار بالکل نہیں ہے۔ وہ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ

اسے اتنی اذیت پہنچے گی..... خداوندا۔ اسے کیا دیا جائے؟ کیا تیرے پاس آنسوؤں کا تحفہ بھی نہیں؟''

ایک بڑا جام عمر کے ہاتھ سے مس ہوا اس نے جام پر نظر ڈالی وہ سرخ شراب سے بھرا ہوا تھا۔

''دریا کا پانی'' اقرونوس تاجر کی آواز آئی۔'' پینے کے لیے مناسب نہیں۔ آپ یہ پیجئے۔''

عمر کے ہونٹوں سے جام لگا۔ اس نے ایک گھونٹ پیا اور پھر جام خالی کر دیا اقرونوس نے اسے دوبارہ بھر دیا۔ شراب میں مسالے کی آمیزش تھی، جس نے عمر کے دماغ میں بھڑکتی ہوئی آگ کو جیسے ٹھنڈا کر دیا۔ وہ پیتا رہا حتیٰ کہ آسمان پر سیاہ پردے لہرانے لگے اور سورج مغرب کے ٹیلوں میں کہیں چھپ گیا تھا۔

چودھواں باب:

سیاہ پتھروں کا درہ

لمبے موٹے بالوں والا ایک خچر عمر کو اپنی پشت پر لادے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا عمر غنودگی کے عالم میں زین پر بیٹھا ادھر ادھر ہل رہا تھا اس کے کانوں میں اونٹوں کی گھنٹیاں بجنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

رات کو اسے نیند نہ آئی تو اس نے اقرونوس کی دی ہوئی شراب کے کئی جام پیے اور شتربانوں سے باتیں کرتا رہا۔ وہ لوگ اسے پاگل سمجھ کر بڑے شریفانہ انداز سے اس کی باتوں کا جواب دیتے رہے۔ جب باتیں کرنے سے بھی اسے سکون میسر نہ ہوا اور بہت دور دریا کے کنارے قبر میں لیٹی ہوئی نقاب پوش یاسمین کے تصور نے اس کے جسم میں ایک دفعہ پھر آگ سی بھڑکا دی تو اس نے شراب کی صراحی طلب کی اور اس وقت تک تھوڑی تھوڑی پیتا رہا جب تک ستارے چلتے چلتے آسمان کے دوسرے کنارے پر نہ جا پہنچے۔

''وہ بہت کمزور ہو گیا ہے'' جعفرک نے اقرونوس تاجر سے کہا۔

''پیاسا رہنے کے مقابلے میں'' اقرونوس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''پیتے رہنا بہتر ہے۔''

''لیکن کل کیا ہوگا، اور کل کے بعد آنے والی کل.....؟''

''جب کل ہوگی تو دیکھا جائے گا۔''

عمران کی باتیں سن رہا تھا وہ اپنے گدے پر اٹھ کر بیٹھ گیا، اور ان کی طرف دیکھا۔ ''اگر گزری ہوئی کل آنے والی کل سے منقطع ہوتی تو زندہ رہنا کس قدر آسان ہو جاتا۔'' وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ ''اگر ہم ماضی کے چہرے پر نسیاں کی نقاب ڈال دیں اور اگر ہم مستقبل کے پردے کو کبھی نہ سرکائیں تو ''آج'' کسی اور چیز سے کبھی نہ بدل سکے!!'' ''سلامتی'' جعفرک زیرلب بڑبڑایا۔ ''خدا تجھے سلامت رکھے!''

وہ ریگستان کی سطح سے کوہستان کرد پر چڑھ رہے تھے۔ اس قدیم سڑک پر جو زائرین کی آمدورفت کی کثرت سے چکنی ہو گئی تھی۔ ایک روز تیسرے پہر کے بعد کارواں کے تمام تاجر پتھروں کے ایک ڈھیر کے قریب رک گئے۔ ان پتھروں کا رنگ بھورا تھا اور جسامت آدھے انسانی جسم کے برابر تھے۔

کچھ پتھروں پر انسانی چہروں کے نقوش پائے جاتے تھے اور لڑھکنے کی وجہ سے تمام پتھروں کے کنارے گھسے ہوئے تھے۔ کارواں کے سب تاجر سواریوں سے اتر کر ان پتھروں کے قریب گئے۔ دھکیل کر اور کھینچ کر انہوں نے ان پتھروں کو سڑک پر کچھ دور لے جا کر چھوڑ دیا۔

اقرونوس نے کہا۔ ''وہ ان پتھروں کو مکے کی سمت جانے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ سیاح پتھر پہاڑوں سے روانہ ہوئے ہیں۔ ہر مسلمان ان کے سفر میں ان کی مدد کرتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں کم عمر تھا تو یہ پتھر قصر شیریں کے بازار میں پڑے تھے۔'' لوگ کہتے ہیں کہ جو مسافر ان پتھروں کو آگے دھکیلنے کے لئے ہاتھ لگاتا ہے۔ وہ قزاقوں سے محفوظ رہتا ہے۔

جعفرک نے ان پتھروں کی زیارت کی۔ وہ بالکل معمولی پتھر تھے، لیکن انہیں سڑک پر آرام سے پڑے دیکھ کر تعجب ضرور ہوتا تھا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ ان پتھروں کو بغداد پہنچنے میں کتنا عرصہ لگے گا اور آیا یہ کبھی ریگستان عبور کر کے مکہ معظمہ تک پہنچ بھی سکیں گے، لیکن تاجر اس شام مسلسل بلند آواز سے عبادت کرتے رہے۔ جو لوگ حج کی سعادت حاصل کر چکے تھے، وہ قزاقوں کے پیش قبضوں اور تیروں سے محفوظ رہنے کے لیے بار بار اپنے تعویذ نمایاں کرتے تھے۔

کیونکہ ان پہاڑیوں میں کرد اپنے پڑاؤ سے نیچے اتر کر اونٹوں کی قطاروں پر حملہ کیا کرتے تھے۔

رات سلامتی سے گذر گئی تو صبح کے وقت تاجروں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک بار پھر سیاہ پتھروں کو تھوڑی دور اور آگے دھکیلا۔ اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ جس شخص کے پاس شراب ہو، وہ کارواں سے پیچھے رہے۔

''وہ ہماری بصارت اور سماعت سے دور رہ کر اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے کیونکہ اس کی ہمراہی ہمارے لیے منحوس ہے اور ہم پر مصیبت نازل کر سکتی ہے۔ وہ ہمارے کارواں کے غبار کے پیچھے پیچھے آ سکتا ہے۔''

اسی جوش و خروش میں انہوں نے اقرونوس کو کہا کہ ''تو یونانی اور کافر ہے۔ تو بھی شراب فروش کے ہمراہ پیچھے قیام کر۔''

''آگے سڑک پر خطر ہے۔'' بھورے بالوں والے اقرونوس نے احتجاج کیا۔ ''اور کارواں سے علیحدہ آدمیوں پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں صرف ان کے گھوڑوں ہی کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں یونانی نہیں ارمنی ہوں۔''

''واللہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی..... خنزیر کا گوشت کھانے والے؟ تیری وجہ سے ہم اپنے اوپر مصیبت نازل کرالیں؟''

اقرونوس خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا..... کیونکہ بغداد کے سوداگر مسلح تھے اور ان کے ساتھ حفاظتی سواروں کا دستہ بھی تھا۔ جب وہ سوار ہو گئے اور اونٹوں کی قطاریں سڑک کے اوپر کی جانب چل پڑیں تو بھی عمر اپنے خچر کے پاس ایک سیاہ پتھر پر بیٹھا رہا۔

''خواجہ عمر! چلئے!'' انہوں نے آواز دے کر کہا۔

''نہیں۔ تم بغیر شراب کے چلے جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گا۔''

''یہ بڑی نادانی ہے۔'' جعفرک نے لقمہ دیا۔ ''کہ ہم پیچھے رہ جائیں۔ یہ مقام بیوقوفوں کے لیے ہے۔ آپ حج بیت اللہ سے سرفراز ہو چکے ہیں، سوار ہو جایئے!''

شراب فروش دبلا پتلا آدمی تھا اور بے حد شکایتیں کر رہا تھا۔ جب کارواں

روانہ ہو گیا تو اس نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اس وقت تک انتظار کرنے کا حکم دیا جب تک کارواں نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔ ''جو کچھ آج ہونا ہے، تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔'' اس نے بڑی بے دلی سے کہا۔ ''اور جو تقدیر کا لکھا ہے وہ پیش آ کر رہے گا۔ میری تقدیر میں لکھا ہے کہ میں ایک احمق، ایک شرابی اور ایک ارمنی کے ساتھ سفر کروں۔''

کارواں کا آخری حصہ بھی درے کے دہانے پر نظروں سے اوجھل ہو گیا شراب فروش نے اپنے اونٹ کھڑے کئے اور اس کے ملازمین نے اپنے اپنے اسلحہ اٹھا لیے۔ جعفرک بھی اپنے گدھے پر سوار ہو گیا۔ تیز دھوپ میں وہ آہستہ آہستہ درے کی طرف بڑھنے لگے۔

جب وہ قلہ کوہ سے چکر کاٹ کر ڈھلان کی طرف اتر رہے تھے تو ساربانوں نے اپنے جانوروں کو روک لیا۔ ''سنو'' انہوں نے چلا کر کہا۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے تمام گھاٹی گونج اٹھی۔ دور کہیں آدمیوں کے چیخنے کی آواز سنائی دیں اور شراب کے تاجر نے چلا کر کہا کہ بس اب کرد آیا ہی چاہتے ہیں ہم سب قتل کر دیئے جائیں گے۔

''ہمیں اپنے جانور چھپا دینے چاہئیں۔'' اقرونوس نے مشورہ دیا۔ ''ہم بھاگ کر جان نہیں بچا سکتے۔''

ساربانوں نے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کو تنگ گھاٹی میں ایک خشک دریا کے چڑھاؤ کی جانب ہانک کر چھپا دیا۔ گھڑسواروں نے تمرس کی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے پناہ لے لی۔

اوپر کی طرف، افق پر انہوں نے کچھ گھڑسواروں کو دیکھا جو نیزے ہلاتے سرپٹ چلے جا رہے تھے۔ قریب ہی چیخ پکار، کنکروں کے بجنے اور پتھروں کے لڑھکنے کی ملی جلی آواز سنائی دیں۔

''بلاشبہ'' جعفرک نے زیر لب کہا۔ ''انہی پہاڑیوں نے ان لوگوں کو جنم دیا ہے۔''

ایسا لگ رہا تھا جیسے کردوں نے ان کا محاصرہ کر لیا ہے اور لوٹ مار کی تلاشی

میں ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔ اقرونوس نے اپنے شانوں کو جھکا دیا اور اس وقت تک سکون سے انتظار کرتا رہا جب تک خاموشی طاری نہ ہو گئی۔

جعفرک نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا..... ''انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا''۔

لیکن وہ دبکے بیٹھے رہے اور جب ایک گھنٹے تک ہر طرف سناٹا چھایا رہا تو تاجر نے آگے بڑھنے کی حامی بھری۔ بظاہر کرد جا چکے تھے۔

لیکن پہلے ہی موڑ پر حیرت زدہ ہو کر انہوں نے اپنی باگیں روک لیں۔ ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی جگہ میں کارواں کا پسماندہ حصہ پڑا تھا۔ رسیاں تھیلے، پھٹے ہوئے بورے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ سوائے ایک لنگڑے گدھے اور چند کتوں کے، بغداد کے تاجروں کے تمام جانور مع مالکوں کے غائب تھے۔ چند ساربان، پریشان حال، ٹوٹے پھوٹے سامان کے نیچے ادھر ادھر دبے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

کسی قسم کے ہتھیار کا پتا نہ تھا اور مسلح نگہبان جیسے ہوا میں تحلیل ہو چکے تھے۔

اقرونوس نے، جو پہاڑی قبیلوں کے اس سے زیادہ حملے دیکھ چکا تھا بڑی آزردگی سے سر ہلایا۔ ''افسوس'' اس نے کہا۔ ''کردوں نے ہمارے بغدادی بھائیوں پر حملہ کیا ہے اور کارواں کو اس پرندے کی طرح پکڑ کر لے گئے ہیں جو اپنے نچے ہوئے پر پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ غالباً ہمارے کچھ دوست تو اپنے گھوڑوں کی برق رفتاری کے سہارے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، لیکن باقی یرغمال کے طور پر کام آ گئے ہیں۔ ہم نے انہیں لے جاتے ہوئے کردوں ہی کی آواز سنی تھی۔ افسوس ان کے محافظ ان کی حفاظت نہ کر سکے..... وہ اب کردوں کے غلام ہیں۔''

ایسے ہی ایک حملے میں اس کے کپڑوں کی ایک گانٹھ تو ضرور ضائع ہو گئی تھی لیکن وہ خود بچ نکلا تھا۔

''بے شک'' شراب کے تاجر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''قسمت میں یہی لکھا تھا۔''

لیکن عمر ہنسا۔ ''ہماری شراب محفوظ ہے۔ جس قیمت کا مال ہمارے پاس ہے،

اس کے مقابلے میں، ان تاجروں کا آدھا بھی نقصان نہیں ہوا۔ لٹے ہوئے کارواں کے بچے کھچے آدمیوں اور پیچھے بھاگتے ہوئے کتوں کے ساتھ وہ لوگ تیزی سے میدان کے اوپر کی سمت سفر کرنے لگے۔ کردوں کے خوف نے ان کی رفتار اور بھی تیز کر دی اور اس رات وہ پڑاؤ کرنے کے لیے بھی کسی جگہ نہ رکے۔ تھکے ہوئے بوڑھے چاند کے سائے میں وہ پہاڑوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھتے رہے، اور جعفرک نے اقرونوس سے کہا کہ یہ لوگ بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے مردے اپنی قبریں تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔

''پھر بھی۔ اس ویرانے میں عمر خیام خوش نظر آتا ہے۔''

''اچھا مجھے ایک بات بتا'' ارمنی نے جواب میں پوچھا۔ ''تو نے کہا تھا کہ تین سال ہوئے تو اس کے گھر اس لڑکی یاسمین کا پیغام لے کر گیا تھا۔ لیکن عمر کا بیان ہے کہ اسے اس لڑکی کے متعلق کوئی خبر نہ مل سکی حتیٰ کہ اس نے تجھے حلب کے درویشوں کے درمیان دیکھا۔''

''خدا گواہ ہے، جیسا کہ تو کہتا ہے کہ میں نے اسے بیت النجوم میں تلاش کیا۔ وہ وہاں نہ تھا۔ آخر میں ایک نشانی اور پیغام وہاں چھوڑ آیا تھا۔''

''لیکن ظاہر ہے اسے کوئی پیغام نہیں ملا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ چل، خیام سے سچ سچ بیان کر۔''

''نہیں ابھی نہیں وہ اس لڑکی کی یاد میں مغموم ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کس بات سے ڈر لگتا ہے؟ چل آگے بڑھ!'' اقرونوس نے اپنے خچر کو ایڑ لگائی اور مسخرے کے گدھے کی لگام پکڑ کر کھینچتا ہوا عمر کے قریب لے آیا۔ ''جعفرک کہتا ہے۔'' اقرونوس نے عمر سے کہا۔ ''تین سال ہوئے وہ یاسمین کا ایک پیغام لے کر تمہارے گھر آیا تھا اور ایک نشانی بھی وہاں چھوڑ گیا تھا، لیکن تم اس واقعے کو بھول گئے ہو؟''

عمر نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کی طرف دیکھا۔

جعفرک نے گھگھیا کر عمر سے کہا۔ ''مجھے حیرت ہے آپ نے اتنے طویل عرصے تک نہ تو اسے اپنے پاس بلایا اور نہ تلاش کیا۔''

''وہ کیا نشانی تھی؟ کیا پیغام تھا؟''

''ایک نقرئی جڑاؤ بازو بند، اور یہ پیغام کہ یاسمین بیمار ہے اور وہ مغرب کی سمت حلب جا رہی ہے۔''

عمر کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے یاسمین کے بازو پر وہ بازو بند باندھا تھا۔ ''مجھے کسی نے اس بارے میں نہیں بتایا۔ تو نے کس سے گفتگو کی تھی..... ملازم سے؟ یا خواجہ میمون سے؟''

''نہیں'' جعفرک نے اپنی گردن نفی میں ہلائی۔ ''وہ چھوٹے سے قد کا ایک مضبوط آدمی تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی ریشمی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ جب وہ بولتا تھا تو معلوم ہوتا تھا، گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ یاسمین کیا واقعی سخت بیمار ہے؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ خداوند کریم یاسمین کی حالت پر رحم فرمائے۔''

''بس خاموش!'' عمر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو توش تھا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھ سے سب کچھ چھپایا۔''

عمر مزید کچھ نہ بولا تو جعفرک پیچھے ہٹ گیا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کی گفتگو عمر کے کانوں تک نہ پہنچ سکے گی ارمنی تاجر سے مخاطب ہوا۔

''اس بات کا کیا مقصد تھا؟ تجھے اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اب اس کی کیفیت دیوانوں کی سی ہے۔''

''تو نہیں سمجھتا اس بات کی قیمت میرے لیے اتنی ہے جتنی کپڑے سے لدے ہوئے کئی اونٹوں کی۔''

اقرونوس مسکرایا وہ جعفرک کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس بات کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

اور جعفرک کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر سوچتا رہا کہ آخر نظام الملک کے جاسوسوں کے سربراہ توتوش سے عمر کو لڑوانے میں اقرونوس کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔

پندرھواں باب:

شمسی تقویم

رصد گاہ کے دیوان خانے میں خواجہ میمون اپنے دونوں ہاتھ آستینوں میں لپیٹے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں رصد گاہ میں اس کے چھ معاونین اور رصد گاہ ارغند کا منظرالاسفزاری بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے چوکیوں پر وہ کاغذات بکھرے تھے جن پر ان کے سال بھر کے کام کی جدولیں اور دیگر اعداد و شمار درج تھے۔

خواجہ میمون اپنی خشک آواز میں بتا رہا تھا کہ وہ لوگ کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ سلطان کا نوجوان منجم عمر خیام ہاتھ پھیلائے لیٹا تھا۔ لگتا تھا اس پر نشے کی کیفیت طاری ہے۔ عمر کے پیچھے کبڑا مسخرہ جعفرک دیوار سے ٹیک لگائے جھکا بیٹھا تھا۔ خواجہ میمون کو محسوس ہوا کہ ریاضی دانوں کے سامنے اس کی توہین کی جا رہی ہے۔ سائنس دانوں کا دربان ایک مسخرہ؟ کتنی عجیب بات تھی۔

اس نے اپنی تفصیلی روئداد کو مختصر کرتے ہوئے سرد مہری کے ساتھ کہا۔ ''موسم بہار میں ۲۰ مارچ کو نقطہ اعتدال پر طلوع آفتاب کے وقت اور ہمارے مقررہ وقت میں تین گھنٹے نو منٹ کا فرق رہا۔''

''تین گھنٹے'' ''اور نو منٹ۔'' عمر نے دہرایا۔

میمون نے سر جھکا لیا۔ عمر کی عدم موجودگی میں اس نے پوشیدہ طور پر اس بات کی انتہائی کوشش کی تھی کہ سورج کے طلوع و غروب کے اوقات کا زیادہ سے زیادہ صحیح

تعین کر سکے تا کہ وہ اس تخمینے کے لئے داد و تحسین کا حق دار گردانا جائے۔

''ایک ہتھوڑا لے کر اس آبی گھڑی کو توڑ ڈالو۔'' عمر نے کہا۔

''نہیں، نہیں، عالی جاہ'' اسفزاری نے وضاحت کرنے کی کوشش کی، جس کے ذمے آبی گھڑی کا حساب رکھنا تھا۔ ''سورج کے اوقات اور آبی گھڑی کے اوقات میں سترہ منٹ سے زیادہ کا فرق نہیں ہے۔ ممکن ہے اس سے قدرے زیادہ ہو۔ لیکن.....''

''یا خدا'' عمر نے بیٹھتے ہوئے چلا کر کہا۔ ''گھڑی اس قدر صحیح ہے؟''

''انشاء اللہ''

''تو پھر تم سب وفان ہو جاؤ۔ ان آلات کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بازار سے لونڈے اور وقت کا شمار کرنے کے لیے اصفہان کی رقص کرنے والی نازک اندام لڑکیاں لے کر آؤ..... تم کس منہ سے اپنے آپ کو ریاضی کا ماہر کہتے ہو۔ جاؤ۔ مدرسوں میں جا کر لونڈے پڑھاؤ۔''

تمام مددگار اسفرازی کے ساتھ دیوان خانے سے باہر نکل آئے۔ صرف بوڑھا میمون بے حس و حرکت وہاں بیٹھا رہا۔

''حضور'' جعفرک نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ''چھ گھنٹے تو یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ میں تو اکثر تو بوز کھا کر کبھی کبھی غنودگی کے عالم میں اتنا وقت گزار دیتا ہوں اور اس کا خیال بھی نہیں کرتا۔''

''تو پھر تجھے بھی منجم ہونا چاہیے۔'' عمر نے تالی بجا کر غلام کو بلاتے ہوئے کہا۔ ''شراب لے کر آ..... شیراز کی سرخ شراب، سر بمہر صراحی میں سے۔''

خوفزدہ غلام نے شراب سے ساغر بھر دیا اور عمر آہستہ آہستہ پینے لگا۔ میمون کو یوں محسوس ہوا جیسے خیام کے جسم میں شیطان حلول کر گیا ہے۔ لیکن وہ طے کئے بیٹھا تھا کہ جب تک وہ خود کو حق بجانب ثابت نہ کر لے گا۔ وہاں سے نہ ٹلے گا۔ اقرونوس بڑی دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا عمر نے ایک گہرا سانس لیا اور ایک کاغذ اٹھا کر دیکھا۔

''یہ جدول کس نے بنائی ہے؟''

"عالی جاہ!" میمون نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے خود ان کی جانچ پڑتال کی ہے۔ اس میں آپ کو کوئی غلطی نہ ملے گی۔"

عمر نے جدول کے ہندسوں پر ایک نظر دوڑائی اور کاغذ کا ایک قطعہ اور اٹھا لیا۔ اس کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کیا۔ "تو قسم کھا کر کہتا ہے کہ تیرے تخمینے بالکل صحیح ہیں۔ اور اسفراری بھی قسمیہ بیان کرتا ہے کہ آبی گھڑی غلط نہیں ہے۔ تم میں سے ایک شخص ضرور غلطی پر ہے..... لیکن کون؟"

"گھڑی ٹھیک کام کر رہی ہے۔ ہاں ایک مہینے کے بعد اس کا فرق معلوم ہوا تھا۔" میمون اب سرکشی پر اتر آیا۔ "چیخ کر یہ کہنا بہت آسان ہے کہ دفان ہو جاؤ۔ لیکن کعبے کی قسم میں نے بذات خود ان نتائج کی صحت کا تعین کر لیا ہے۔"

"کیا بطلیموس کی جدول نجوم کے ذریعے؟"

"جی ہاں! یقیناً"

"نیشاپور کے عرض البلد کا تعین کر کے؟ بطلیموس نے اپنے مشاہدات اسکندریہ میں بیٹھ کر کیے تھے۔"

"مجھے تو اس کا یقین ہے۔ کیا عالی جاہ خود اس کی تصدیق فرمانا گوارا کریں گے؟ گذشتہ ماہ کی یہ جدول حاضر ہے۔"

عمر نے قلم اٹھا کر ایک مختصر سا حساب لگایا، اور میمون کے اعداد و شمار سے اس کا مقابلہ کیا اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" عرض البلد کا تعین بھی صحیح ہوا ہے۔ ستاروں میں بھی کوئی فرق نہیں۔ گھڑی بھی درست ہے۔ اس کے باوجود چھ گھنٹے کا فرق آتا ہے۔ بغداد کے علامہ! تیرے پاس اس کا کیا جواب ہے؟"

میمون نے آہستگی سے سر ہلایا۔ "یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"بطلیموس کی جدول لے کر آؤ۔"

عظیم مخطوطہ عمر کے سامنے پیش کیا گیا۔ عمر نے میمون کی جدولوں کا پہلا صفحہ اٹھایا اور سر جھکا کر حساب لگانے میں مشغول ہو گیا۔ اقردنوس اٹھ کر اپنے بستر میں جا لیٹا

اور جعفرک ایک غالیچے پر سکڑ کر سونے کے لیے لیٹ گیا، میمون الو کی طرح ٹکٹکی باندھے خاموشی سے انتظار کر رہا تھا۔ جب چراغ کی لو سے شعلہ سا بھڑک کر بجھ گیا تو میمون نے اٹھ کر چراغ میں تھوڑا سا تیل اور ڈال دیا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا" عمر نے بے خیالی میں کہا اور نیا صفحہ اٹھا لیا جب روشن دانوں سے صبح کی روشنی چھن چھن کر اندر آنے لگی اور چراغ کی لو مدھم پڑ گئی تو عمر بھی کام کے اختتام تک پہنچ گیا۔ اور میمون دم بخود کوئی بات سننے کا انتظار کرنے لگا۔

"اعداد و شمار بالکل صحیح ہیں" وہ بڑبڑایا۔

عمر نے بطلیموس کے مخطوطے کے پہلے اور آخری صفحے کا پھر مطالعہ کیا۔

"تیرے تخمینے یقیناً صحیح ہیں۔" عمر نے زیر لب کہا۔ "اور اسی لیے چھ گھنٹے اٹھارہ منٹ کا فرق مسلسل چلا آ رہا ہے۔ تیرا پہلا اندراج..... یہ ہے۔ اور ایسا ہی آخری ہے، اور دونوں میں سورج کے وقت سے چھ گھنٹے اٹھارہ منٹ کا فرق ہے۔"

میمون نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اس کی تصدیق کی۔ "یہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ غلطی یہاں ہے" عمر نے بطلیموس کے بوسیدہ مخطوطے پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"معاذ اللہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ غلطی ..... صدیاں گزر جانے کے بعد....." فرط حیرت سے میمون کا حلق خشک ہو گیا۔

"ایک مستقل غلطی۔ ہاں۔"

"کاش ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ اسے کس طرح درست کیا جائے۔" عمر مسکرایا۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں سے تفکر کے آثار نمایاں تھے..... "لیکن اسکندریہ کے اس عظیم شخص کو قبر میں سوئے ہوئے زمانہ گزر گیا۔"

بوڑھے آدمی کے چہرے پر بطلیموس سے بے اعتقادی کے آثار پیدا ہوئے کیونکہ اس کی جدول نجوم صدیوں سے مسلمان سائنس داں استعمال کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ نیشاپور کی جامع مسجد کے میناروں کو گرتا ہوا دیکھ سکتا تھا لیکن یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ بطلیموس غلطی کر سکتا ہے۔

Pakistanipoint
Waqar Azeem

"اوہو۔" اس نے درد انگیز لہجے میں کہا اس غلطی کی دریافت کا تاثر اس پر حاوی ہو رہا تھا۔ "تو پھر ہماری ساری محنت اکارت گئی خرمی کی بھی۔ اور دوسرے تمام لوگوں کی بھی ..... قائم ستاروں کی تمام جدولیں غلط ہو گئیں۔ بالکل غلط۔" بہت دل برداشتہ ہو کر اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اگر کمرہ کا فرش کناروں سے بلند ہو گیا ہوتا تو اسے اس قدر تعجب نہ ہوتا، لیکن عمر کی سیاہ آنکھیں ساکت تھیں۔

"ٹھہرو! میمون۔ ذرا ٹھہرو۔ غلطی بہت معمولی ہے، لیکن متواتر اور مستقل۔" یہ یہاں سے پہلے خانے میں اور آخری میں بھی۔ یہ مشاہدات بالکل صحیح کئے گئے تھے۔ مگر فلکیاتی جدول کے تناظر میں۔ قدرے غلط۔" وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے کمرے کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر خیرہ کار آفتاب کو تکنے لگا۔ "صحیح اور غلط..... ایسا ہونا ناممکن نہیں، لیکن ہے۔ کاش ہم اس پردۂ راز کو چاک کر سکتے!"

میمون نے اس کے جواب میں صرف سر ہلایا۔ "غیب کا حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ پوشیدہ رازوں کی کنجیاں تو صرف اسی کے قبضے میں ہیں۔"

"اگر وہ کلید ہمیں حاصل ہو جائے..... وہ کلید۔" عمر اک دم مڑا۔ "اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ کیا بطلیموس کے عرض البلد اور طول البلد صحیح ہیں؟"

"ارے۔ اس میں کیا شک ہے..... کیا ہم نے گذشتہ تین نسلوں سے ان کو تسلیم نہیں کیا ہے۔"

تو پھر ٹھہرے ہوئے ستاروں کی جدول کی کلید ضرور اس کے پاس ہو گی۔ صرف وہی ان جدولوں کو استعمال کر سکتا تھا، لیکن اگر دوسرے لوگ..... جن کے پاس وہ کلید نہیں ہے..... انہیں استعمال کریں گے تو اپنے حساب میں ہمیشہ ناکام رہیں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم ناکام ہو گئے ہیں۔" اس نے کھلے ہوئے مخطوطے پر اپنا ہاتھ مارا۔ "کلید کی مدد سے ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ میمون..... صرف ہم۔"

"سچ اور جھوٹ میں اگر بال برابر کا بھی فرق ہے تو جھوٹ کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔"

عمر نے میمون کو غور سے دیکھا اور اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "میمون، بزرگ

استاد! مجھے معاف کرنا۔ میں ناحق تم پر ناراض ہوا۔ تم نے مجھے وہ کلید عطا کر دی ہے جس سے جھوٹ سچ میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں۔"

"یا اللہ۔ یہ بات کوئی نہیں جان سکتا۔"

"یہ بہت سی چھوٹی سی کلید ہے۔ تم نے اس جدول کی مدد سے نیشاپور کے عرض البلد کا تعین کیا؟"

لیکن..... "ٹھہرے ہوئے ستارے اسکندریہ کے مقابلے میں، جہاں بطلیموس نے مشاہدہ کیا تھا۔ نیشاپور میں مختلف زاویے سے نظر آتے ہیں۔"

"اور فرض کرو۔" عمر نے سوال کیا "اگر وہ اسکندریہ سے نظر ہی نہ آتے ہوں۔"

"یا اللہ! کیا بطلیموس کی رصدگاہ اسکندریہ میں نہ تھی؟"

"جی ہاں، اور یہیں ہم نے دھوکا کھایا ہے۔"

میمون نے تھکے ہوئے انداز سے عمر کو دیکھا..... بالکل خالی الذہن ہو کر۔

"پاگل ہو گیا ہے" وہ بڑبڑایا۔

"نہیں۔ بطلیموس نے یہ جدولیں اسکندریہ میں بیٹھ کر نہیں بنائیں۔ وہ کسی اور نے ترتیب دی ہیں۔ اس کے عہد سے بھی قبل۔ کسی اور مقام پر۔ اس نے بھی انہیں اسی طرح استعمال کیا جیسے ہم استعمال کر رہے ہیں..... اس نے انہیں اپنا سمجھ کر استعمال کیا، لیکن اس مقام کو وہ جانتا تھا جہاں یہ جدولیں مرتب ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً جانتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کے تمام تخمینے، تمام پیشین گوئیاں صحیح تھیں۔"

خواجہ میمون کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ یکا یک پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں اس پر حقیقت روشن ہو گئی، لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے عمر کسی مافوق الفطرت طاقت کا مالک ہے جس کے ذریعے اس نے اس راز کو بے نقاب کر دیا ہے جو نو صدیوں سے پوشیدہ تھا۔ "نظام الملک نے واقع سچ کہا تھا کہ عمر عجیب و غریب قوتوں کا حامل ہے؟"

"یقیناً ایسا ہی ہو گا" اس نے آہ بھر کر کہا۔ "تاہم ہمیں یہ کبھی نہ معلوم ہو سکے

گا کہ یہ جدولیں کس نے مرتب کیں اور کہاں مرتب کیں؟ شاید وہ کوئی کلدانی ہوگا۔ یا کوئی بابل کا قدیم باشندہ یا پھر وہ کوئی ہندو یا مغرب بعید کا یونانی ہوگا۔ کون جانتا ہے۔''

جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ مشاہدات کہاں کئے گئے تھے۔ یہ جدولیں صحیح کام کرنے کے سلسلے میں بے کار محض ہیں۔ بطلیموس کو معلوم تھا مگر عظیم مصری نے اس گم نام شاہد کی حیثیت کو پردۂ راز میں رکھا۔

''چند روز میں'' عمر نے اطمینان سے کہا۔ ''میں تمہیں وہ مقام بتا دوں گا جہاں یہ مشاہدات کئے گئے تھے، لیکن اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے۔''

مینار سے اتر کر اپنے حجرے کی طرف جاتے ہوئے میمون نے دل میں ایک موہوم امید ابھر رہی تھی۔ ایک شخص جس نے ایک معجزہ کر دکھایا ہے، ممکن ہے دوسرا معجزہ بھی پیش کر سکے، حالانکہ ریاضی کی دنیا میں معجزے رونما ہوتے ہوئے اس سے قبل اس نے کبھی نہ دیکھے تھے، اس نے اپنے حجرے کے دروازے پر اپنے مددگاروں کو بے چینی کے عالم میں یکجا پایا، وہ نماز صبح کے بعد سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بوڑھے منجم نے اپنا سر بلند کر کے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔ اس نے، ان پر رعب جمانے کے لیے کہا۔

''عزیز طالب علمو!'' ''خواجہ عمر نے اور میں نے غلطی پکڑ لی ہے۔ نو سو سال کے بعد میں نے جغرافیہ داں بطلیموس کے مرتبہ ستاروں کی جدول میں غلطی کا انکشاف کیا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہم اس غلطی کی اصلاح بھی کر لیں گے لیکن اس وقت تو میں بے حد تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا ہوں۔''

میمون اپنی عبا سمیٹتا ہوا، بڑے وقار کے ساتھ اپنے حجرے میں داخل ہو گیا اور تمام مددگار حیرت میں گم خاموش کھڑے رہے۔

''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' ایک نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''بوڑھا خبطی بھی شاید شیراز کی شراب سے مخمور ہو رہا ہے۔''

دھوپ گھڑی کے سائے کی کیفیت اور آبی گھڑی کی مدد سے سورج کے طلوع و غروب کی ساعت اور دقیقوں کا اندراج یہ تھا بیت النجوم کا مقررہ کام، اس میں آئندہ اور کوئی نیا کام شروع نہ ہوا۔ البتہ عمر مسلسل محنت کرتا رہا۔ معاونین کا کہنا تھا کہ اس پر کسی

جن کا سایہ ہے اس نے شاہی کتب خانے سے بطلیموس کے جغرافیے کا نسخہ منگوایا اور اس کے بعد قدیم یونانی منجموں کے ناموں کی فہرست بھی طلب کی۔

عمر خاموشی سے کام کرتا رہا۔ اعداد و شمار سے بھرے ہوئے صفحے کے صفحے وہ میمون کو جانچنے کے لیے دیتا رہا۔ میمون مجبوری کے عالم میں ایک ایسا کام کرتا رہا جس کی صحیح نوعیت کا اسے علم نہ تھا۔ اس کی کیفیت ایک ایسے عمل جراحی کا مشاہدہ کرنے والے کی سی تھی، جس کے کامیاب ہونے کی امید کم ہو۔ البتہ اسے یہ اندازہ ضرور تھا کہ عمر غلطی کا تناسب معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس تناسب کی مدد سے وہ اسکندریہ کے شمال یا جنوب میں اس رصدگاہ کا فاصلہ متعین کرنا چاہتا ہے جہاں جدول کے اندراج کئے گئے تھے۔ آخر میں اس کا ایک اندازہ ضرور ہو گیا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ پانچ درجہ عرض البلد کا فرق ہے۔

عمر نے بالآخر فیصلہ صادر کیا۔ نامعلوم منجم کی رصدگاہ، اسکندریہ سے پانچ درجہ عرض بلد شمال میں تھی۔

''جنوب میں کیوں نہیں؟''

''اس لئے کہ۔ اس نقطے کے جنوب کی جانب نقشے میں سوائے ریگستان، اور غیر معروف کوہستانی سلسلے کے اور کوئی مقام نہ تھا، لیکن عمر کو نقشے پر اعتماد نہ تھا۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ اسکندریہ کے طول بلد سے جدول کے بہت سے ستارے نظر نہیں آ سکتے۔''

''نیشاپور بھی اسی عرض بلد پر شمال میں واقع ہے'' میمون نے کہا۔ ''اور حلب اور بلخ اور بہت سے دوسرے مقامات۔''

انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ مرکز جس کی انہیں تلاش ہے ہندوستان میں تو ہو نہیں سکتا۔ اسے نیشاپور کے مغرب میں ہونا چاہیے۔ عمر کا خیال تھا وہ حلب کے مغرب میں ہے جس کی وجہ سے ان کی تلاش اور بھی دشوار ہو گئی۔ کیونکہ مغرب بعید کے قدیم شہروں کا انہیں بہت کم علم تھا۔

ایک شام جب وہ اپنے تجربے کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے، دروازے

پر ایک خوش آئندہ آواز نے انہیں مخاطب کیا۔

''عقل و دانش کے دوستونوں کو اللہ تندرستی دے؟ خدا تمہاری محنت ٹھکانے لگائے!''

عمر نے اس طرح مڑ کر دیکھا جیسے کسی نے اس کے نوک دار کیل چبھو دی ہو، تو توش نیلا عمامہ باندھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''بازار میں یہ کیسی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں'' تو توش نے کہا۔ کہ بیت النجوم میں کوئی عظیم دریافت ہوئی ہے؟''

عمر قلم چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''نہیں۔ شاہراہ اعظم پر میں نے ایک چیز دریافت کی تھی۔'' اس نے پرسکون انداز میں کہا۔ اور اب تم مجھے اس کی تفصیل سے آگاہ کرو گے۔''

''غلام حاضر ہے'' تو توش نے سلام کیا۔'' آپ کا قدیم دوست، بس آپ کے حکم کی دیر ہے۔''

''میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے وہ چاندی کا بازو بند جس پر رنگین نقش و نگار ہیں کہاں چھپا رکھا ہے، اور وہ پیغام جو اس کے ساتھ بھیجا گیا تھا؟''

جاسوس تو توش کو وہ بازو بند یاد آ گیا جو اس نے چشمے میں کنارے پر کھیلتی ہوئی لڑکیوں کے سامنے پھینکا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے آنکھیں جھپکاتا رہا۔ اور حیران تھا کہ کہ کون سے جادو کے زور سے سلطان کے نجومی کو یہ بات معلوم ہو گئی۔

''اوہو۔ لاکھوں کی تعداد میں نقشین بازو بند ملتے ہیں۔ خواجہ شاید مجھ سے مذاق فرما رہے ہیں۔''

''میں اس بازو بند کا ذکر کر رہا ہوں جو تجھے کبڑے مسخرے نے دیا تھا اور ساتھ ہی ایک پیغام بھی پہنچایا تھا اس کمرے میں، تو نے وہ پیغام مجھ سے چھپایا اور اب ایک دوشیزہ کی موت کی ذمہ داری میری روح پر ہے۔ ایک ایسا بار جو کبھی نہ اٹھ سکے گا۔'' عمر کے رخسار سفید پڑ گئے اور اس نے اپنی پیٹی کچکچا کر پکڑ لی۔ ''اب تو مجھے یہ بھی بتا، تو توش کہ دنیا میں بے شمار لڑکیاں ہیں۔ میں صرف ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا اور

اسے تو اچھی طرح جانتا تھا، پھر بھی تو نے مجھ سے صریح جھوٹ بولا۔''

عمر نے آہستہ آہستہ جاسوسوں کے فربہ اندام سربراہ کی طرف بڑھنا شروع کیا اور تو توش اس کی آنکھوں سے خوفزدہ ہو گیا جو اس کی روح میں پیوست ہو رہی تھی۔ عمر نے اس کے خیالات کو پڑھ لیا تھا اور اس کے خوف کا بھی اندازہ لگا لیا تھا۔

''خدا کے ننانوے اسمائے صفات کی قسم'' تو توش چلایا'' مجھے اس سلسلے میں کچھ علم نہیں ہے اور نہ میں نے کبھی تیری کسی منظور نظر لڑکی کو نظر بد سے دیکھا ہے۔ ارے۔ ارے رکو..... میمون..... مدد۔''

عمر نے اس کا ٹیٹوا دبا کر جھٹکا دیا۔ تو توش کے گلے میں آواز اس طرح پھنس کر رہ گئی جیسے شکنجے میں پھنسے ہوئے چوہے کی۔ اس کے نرم گوشت میں انگلیاں اس طرح پیوست ہو گئیں جیسے فولاد۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر ابل آئیں۔ اس نے میمون کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے سنا۔ اور پھر، خوف پر قابو پاتے ہوئے اس نے اپنی پیٹی سے ایک چاقو نکال کر اندھا دھند مار دیا۔ چاقو کا پھل عمر کا لباس اور گوشت کاٹتا ہوا ہڈی پر رکا۔ اس کے بعد اسے کلائی سے پکڑ کر فرش پر گرا دیا گیا۔

وہاں پڑا ہوا، وہ تڑپتا اور سسک سسک کر سانس لیتا رہا۔ ایک سرخ دھند میں سے اس نے دیکھا کہ آدھی درجن ملازم اور عالم عمر کو اپنے بازوؤں میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک شانے پر سے اس کی عبا پھٹی ہوئی تھی اور ایک سیاہ دھار اس کے سینے پر بہہ رہی تھی۔

''میرے اور تیرے درمیان خون کی ندی بہہ رہی ہے، کتے'' عمر نے پرسکون آواز سے کہا۔ ''لیکن یہ وہ خون نہیں ہے۔ وہ میرے دل سے اندر ہی اندر قطرہ قطرہ ٹپکتا رہتا ہے، اور اسے اس طرح بند نہیں کیا جا سکتا۔ دور ہو جا، ورنہ مارا جائے گا۔''

تو توش کو لوگ وہاں سے لے گئے۔ جب جعفرک نے ملازموں سے یہ واقعہ سنا تو باب طاقین پر اسی رات کو اقرونوس تاجر سے بیان کیا کہ عمر نے غصے سے مغلوب ہو کر جب جاسوسوں کے سربراہ پر حملہ کیا تو اس نے عمر کو زخمی کر دیا۔ اقرونوس نے اس واقعے کو بہت اہمیت دی اور جعفرک کے رخصت ہونے کے بعد بازار سے ایک غلام

قاصد طلب کیا۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دو لفظ لکھے اور بغیر بند کیے اسے دے کر کہا:
اسے لے کر سیدھے رے چلے جاؤ۔ وہاں پہنچ کر قافلہ سالار کے پاس جانا اور زور سے چلا کر اعلان کرنا کہ آقائے سبعیہ کے لیے ایک پیغام لایا ہوں اور جب وہ تیرے پاس آئے تو یہ پرچہ اسے دے دینا۔

''لیکن حضور!'' غلام نے اعتراض کیا۔ ''یہ مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ وہ حقیقتاً آقائے سبعیہ ہے؟ یہ بڑا عجیب سا نام ہے۔''

''جب وہ آئے گا تو تجھے بتا دے گا۔''

''واہ! یہ تو ایک طرح کا جادو ہوا۔''

غلام نے اجرت اور پیغام لے لیا لیکن اسے پیغام کے متعلق بڑا تجسس تھا۔ اس نے کاغذ کھول کر کئی مرتبہ ان دو لفظوں کو دیکھا، باوجودیکہ وہ سیدھے سادے لفظ دکھائی دیتے تھے لیکن مزید احتیاط کے لیے اس نے کسی ملا کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو اسے پڑھ کر یہ یقین دلا دے کہ ان الفاظ کے اثر سے اس پر کوئی مصیبت تو نازل نہ ہو جائے گی۔

''ساعت شدہ'' ملا نے با آواز بلند پڑھا۔ ''وقت آ گیا ہے یا آغاز کا وقت آ گیا ہے۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

شانے کی مرہم پٹی کے بعد عمر اپنے کمرے ہی میں مقیم رہا۔ اسفراری نے اتفاقاً جھانک کر دیکھا اور بیان کیا کہ وہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کچھ لکھ رہا ہے۔ ان میں سے کچھ کاغذ فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔

میمون نامکمل اعداد و شمار کی تکمیل کا کام کر رہا تھا لیکن وہ از خود کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ عمر کی امداد۔ نقشہ غلط تھا، اور یونانی منجموں کی فہرست اس کے لیے بے معنی تھی۔ کچھ بے نتیجہ تجربے کرنے کے بعد وہ رصد گاہ سے واپس آ گیا۔

اسفراری نے اسے بتایا کہ دفتر کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے حالانکہ کوئی معاون وہاں موجود نہیں ہے۔ بوڑھا منجم تیزی سے اس طرف گیا اور چھوٹی میز پر عمر کو جھکا ہوا بطلیموس کے مخطوطے کے مطالعے میں غرق پایا۔

''جس نقطے کی ہمیں تلاش ہے وہ ایشیائے کوچک کے مغرب میں واقع ہے'' اس نے کہا۔ ''مجھے اب اس کا یقین ہو گیا ہے۔''

میمون کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ''لیکن اس کے مغرب میں تو صرف سمندر ہے۔''

عمر نے سر ہلایا۔

افسوس ہماری جستجو بیکار ہے۔

''نہیں۔ اب وہ کامیابی کے قریب ہے، کیونکہ اس سرزمین پر پرانے زمانے میں بہت سے شہر آباد تھے۔ سمندر میں بھی چند جزیرے تھے۔'' عمر منجموں کی فہرست بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور ایک کے بعد دوسرا نام قلم زد کرتا جاتا تھا۔ ایک جگہ آ کر اس کا قلم رک گیا۔

''جزیرہ رہوڈس'' اس نے زیر لب کہا۔ ''رہوڈس کے ہپارکوس نے ایک ہزار ستاروں کی جائے وقوع متعین کی تھی۔

میمون کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ قریب تھا کہ وہ سائنس کا ایک ایسا راز معلوم کر لیں جو نو صدیوں سے پردۂ خفا میں مستور تھا۔

''اوہو'' اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''تو گویا بطلیموس نے ہپارکوس کے ایک ہزار اسی نام اپنی المجسطی میں لکھ لیے۔ کیا یہ ممکن ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں یہ ممکن ہے۔'' عمر نے بے پروائی سے کہا۔ ''اب ہمیں رہوڈس کو مرکز تسلیم کر کے ان جدولوں کی جانچ کرنی چاہیے۔ شہر رہوڈس اور ایک ہزار چونتیس سال قبل مسیح (۱۰۳۴ ق۔م)

''اچھا اب ہم دونوں الگ الگ اسے جانچتے ہیں۔'' میمون پر ایک خوف طاری تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس دریافت کی شہرت میں شرکت کا متمنی بھی تھا۔

عمر اور میمون مسلسل تین دن تک کام کرتے رہے۔ بہت کم سوئے۔ میمون نے اپنے سامنے رکھے اوراق سے شاید ہی نظر ہٹائی ہو۔ البتہ عمر خوش دلی سے اور تیزی سے کام کرتا رہا۔ ان تین دنوں میں انہوں نے کھانا بھی بہت کم کھایا۔ اور پھر عمر نے اپنا

صحت مند ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''بس کافی ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔''

''نہیں۔ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔'' میمون نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کیونکہ اس کے خیال میں ابھی تو کام کا آغاز ہوا تھا، لیکن جب دونوں نے اپنے اپنے اعداد و شمار کا موازنہ کیا تو میمون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میمون کے حلق سے بے اختیار مسرت آمیز چیخ ابھری ''قسم ہے کعبے کی! قسم ہے آب زم زم کی!..... یہ ایک حقیقت ہے حکیم بوعلی سینا بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور اسے بھی کبھی شک و شبہ نہ ہوا۔ خواجہ عمر!'' اس نے خیام کو اپنے آغوش میں لے کر خوب پیار کیا۔ اب ہمارے پاس بالکل صحیح جدول موجود ہے۔ خواجہ عمر! جس طرح بطلیموس نے رہوڈس کے ہپارکوس کی جدول استعمال کی تھی۔ ہم بھی اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔''

میمون کا جی چاہا کہ وہ فوراً صحن میں جا کر بیٹھے اور اس شان دار دریافت کی تفصیل اپنے شاگردوں کو بتا کر محظوظ ہو، بلکہ نیشاپور کی بڑی درگاہ میں جا کر اپنے ساتھیوں کے پاس بیٹھے اور مزے لے لے کر انہیں اپنی اس کامیابی کی روئیداد سنائے۔ لیکن عمر نے اس کی اجازت نہ دی۔

''نہیں خواجہ نہیں'' عمر نے میمون کو سمجھایا کہ پہلے ہی علمائے دین کہتے ہیں کہ وقت کی پیمائش شرعاً ممنوع ہے اور وہ خبیث روحیں اس کام میں ہماری مدد کرتی ہیں جو بیت النجوم کے مینار میں مقیم ہیں۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اپنے مقصد کے لیے ایک کافر یونانی کی جدولیں استعمال کر رہے ہیں تو تم خود سوچو وہ کیا کچھ نہ کہیں گے۔ ''اس وقت تک انتظار کرو کہ ہماری تحقیقات مکمل صورت میں سلطان کے حضور پیش ہوں۔''

''آپ سچ فرماتے ہیں خواجہ عمر۔ ایک مرتبہ ایک حنبلی نے ہمیں برا بھلا کہتے ہوئے ایک جلتی ہوئی مشعل مینار پر پھینکی تھی۔ اور آپ جب حلب میں تھے تو ایک روز جب ہم ''سورج گھڑی'' کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مسجد سے آنے والے ایک مجمع نے ہم پر پتھراؤ کیا تھا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں ابھی اس راز کو راز ہی رہنا چاہیے۔''

میمون سمجھ نہ پایا کہ عمر اس قدر جلد نئے کام کی طرف کیوں کر متوجہ ہو گیا۔ اسے اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ عمر کا دماغ جدولوں سے ہٹ کر دور ایک ایسے علاقے میں جا پہنچتا تھا، جہاں ایک لڑکی عالم نزع میں کراہتے ہوئے عمر کے بازوؤں میں دم توڑ رہی تھی۔

اس تصور کی حیثیت تپتی دھوپ میں اس سایہ دار جگہ کی سی تھی جو ایک بہتے دریا کے کنارے واقع ہو۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ یاسمین کا حسین مجسمہ مسکراتے ہوئے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ عمر کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا اور یہ محسوس ہوتا جیسے یاسمین اپنے سیاہ گھنے بالوں کو جھٹکا دے کر شانوں پر ڈال رہی ہے، لیکن عموماً دریا کا منظر اس کی نگاہوں میں تیرتا رہتا اور ایک درد کی سی کیفیت اس پر طاری رہتی۔ اسفزاری نے ایک دفعہ کہا کہ وہ اس انہماک سے کام کرتا ہے جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہو گا'' یا پھر وہ یک لخت کام چھوڑ کر خاموشی سے شراب پینے بیٹھ جاتا ہے۔''

''وہ عجیب و غریب قوت کا حامل ہے۔'' میمون نے بڑے اعتماد اور وثوق سے جواب دیا۔ ''یہ اس کی عادت ہے۔ اگر اس کی دماغی قوتوں نے اس کا ساتھ دیا تو مجھے یقین ہے وہ بطلیموس کی تمام محنت پر پانی پھیر دے گا۔''

تو تو ش کے واقعہ کے بعد جعفرک اپنا زیادہ وقت خیام کے پاس گزارتا۔ وہ اپنے دوست کے قدموں میں لیٹا چراغ کی لو سے پیدا ہونے والے سایوں کو دیوار پر تھرکتے دیکھتا رہتا اس دوران میں نہ تو وہ فقرے بازی کرتا نہ کوئی مسخرہ پن..... ''جب میرے آقا سلطان الپ ارسلان دوسری دنیا کو سدھارے تھے'' اس نے لیٹے لیٹے کہا ''تو جب تک میرے آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سمندر نہ بہہ گیا میرے دل کو سکون نہ مل سکا تھا۔'' ''مگر اے میرے دوست خیام،'' ساغر میں بھری ہوئی اتنی بہت سی شراب بھی تجھے رلانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔''

عمر نے ساغر پر نظر ڈالی جو اس کے ہاتھ میں چھلک رہا تھا۔ یہ ساغر چاندی کا بنا ہوا تھا اور اس پر لاجورد کے بیل بوٹے تھے۔ جب تمہیں نیند نہ آئے تو تم شراب پی کر مدہوش ہو سکتے ہو۔ یہ بات بہر کیف اس سے تو بہتر ہے کہ تم اس سوچ میں ڈوبے رہو

کہ تم کیا ہو؟.....اور تم، تم کیوں ہو۔؟"

"لیکن اس عمل سے دل کو سکون و اطمینان تو میسر نہیں آتا۔"

"اس سے خود فراموشی حاصل ہوتی ہے۔ جعفرک، تم جانتے ہو یہ جام اس وقت کیمیا کے کیسے کیسے سربستہ رازوں کا حامل ہے۔ اس کا ایک گھونٹ ہزاروں تفکرات سے آزاد کر دیتا ہے۔ اسے پی کر تم یہ محسوس کرو گے جیسے محمود کے سنہری تخت پر متمکن ہو، اور تمہارے کانوں میں ایسی رسیلی موسیقی رس گھولتی معلوم ہو گی جیسے براہ راست حضرت داؤد علیہ السلام کے لبوں سے آ رہی ہو..... اچھا اب تمہی بتاؤ جس شخص نے اس جام کو تخلیق کیا ہے کیا وہ اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟..... بولو!"

"نہیں..... خدا نہ کرے۔"

"تو پھر محبت ایک حسین وجود میں کس بات کا اضافہ کر دیتی ہے اور انتقام سے کیا چیز ضائع ہو جاتی ہے؟"

عمر نے فرش پر سے ایک مروڑے ہوئے کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر جعفرک کی طرف پھینکا۔ مسخرے نے اس کی سلوٹیں دور کر کے روشنی کے سامنے کیا تو اسے نظر آیا کہ اس کاغذ پر منجم کے صاف ستھرے خط میں ایک رباعی کی چار سطریں تحریر تھیں

ایں قافلہ عمر عجب می گزرد
دریاب دمی کہ باطرب می گزرد
ساقی غم فردای حریفاں چہ خوری
پیش آر پیالہ را کہ شب می گزرد

"افسوس!" جعفرک نے ایک آہ بھر کر کہا۔ یکا یک اس کا دانش افروز چہرہ چمک اٹھا۔ لکھو..... اور بہت سے شعر لکھو۔ یہ تمہارے آنسوؤں کا نعم البدل ہے۔"

مسلسل ایک سال کے کام کے بعد جب بیت النجوم کے منجموں نے اپنی اپنی تحقیقات کا موازنہ اور مقابلہ کیا تو خواجہ میمون اور اسفزاری بے حد خوش ہوئے کیونکہ طلوع و غروب آفتاب کے اندراجات جو خود انہوں نے کئے تھے، ستاروں کے اندراجات سے جو "آبی گھڑی" کی مدد سے کئے گئے تھے ساعت بہ ساعت مل گئے

تھے۔

ثابت ہوا کہ ایک سال ۳۶۵ دن اور پانچ یا چھ گھنٹوں کا ہوتا ہے، اور یہ صورت حال قمری تقویم سے جو مسلمانوں میں رائج ہے یقیناً بہتر ہے جس کی رو سے سال میں ۳۵۴ دن ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ قدیم مصری منجموں نے ایک ایسی جنتری بنائی تھی جو بارہ مہینوں پر مشتمل تھی۔ ہر مہینہ تیس دن کا ہوتا تھا اور سال کے آخر میں پانچ دن تقریبات کے لیے رکھے تھے..... اس طرح کل ۳۶۵ دن ہوتے تھے۔

"محض ایک چوتھائی دن ہمیں ۳۶۵ دنوں میں اور شامل کرنا ہو گا۔" اسفزاری نے تجویز پیش کی۔ "اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم ہر چوتھے سال کے دنوں میں ایک پورے دن کا اضافہ کر دیں۔؟"

یہ جنتری صرف چار سال یا چالیس سال کے استعمال کے لیے ترتیب نہیں دی جا رہی ہے۔ بلکہ اس کا نفاذ آنے والی صدیوں تک رہے گا۔ عمر خیام نے کہا۔ اور پھر طے ہوا کہ یہ مشاہدات آئندہ سال بھی کئے جائیں تا کہ گذشتہ سال کے مشاہدات سے ان کا موازنہ کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔ اس کامیابی کی خبریں نیشاپور کے ملاؤں کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں جو منجموں کے خلاف عوام کو بھڑکاتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں منجم کافروں کے بنائے ہوئے آلات استعمال کرتے تھے اور ان مردوں کی روحوں سے ہم کلام ہوتے تھے جو قبرستان کی کہنہ و بوسیدہ قبروں میں مقیم تھیں۔

ملاؤں نے کفر و الحاد کا شور مچایا لیکن میمون نے اس شور و غوغا کی طرف بہت کم توجہ کی اور عمر نے تو اسے بالکل نظر انداز ہی کر دیا، اور پھر بوڑھے منجم کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ خیام کوئی نیا مسئلہ حل کرنے میں منہمک ہے جس کی نوعیت کا اسے صحیح اندازہ تو نہ تھا لیکن اس بات کا اسے ضرور یقین تھا۔ یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ بطلیموس نے ہپارکوس کے علم سے استفادہ کیا تھا۔ عمر نے رہوڈس کے عالم کے مخطوطات کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک جدید انداز کی تحقیق میں مستغرق تھا۔

"اس کا تعلق چاند گرہن سے مشابہت رکھنے والی ایک چیز کی شکل سے تھا۔ یہاں تک تو بات بالکل صاف ہے۔" میمون نے اسفزاری کو بتایا۔ "اس کے علاوہ عمر

اشکال ہذلولی کی مدد سے بھی مسائل حل کرنے میں مصروف ہے جن میں لامحدود اعداد سے بحث کی جاتی ہے۔"

خدائے رحمٰن ورحیم اس کی رفاقت کرے" اسفزاری جو میمون کے مقابلے میں کم عمر اور جرات مند تھا، ہنسنے لگا۔ "عام اعداد کا شمار ہی میرے دماغ کا کچومر نکالنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔"

"وہ صفر کا دائرہ استعمال کر کے حساب لگا رہا ہے۔"

"یعنی خلا.....؟"

"ہاں .....وہ دائرہ جس کے بعد کچھ نہیں..... یونانی صفر۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا بیان ہے کہ صفر کے بعد.....اس خلا کے بعد.....خیالی اعداد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔" (گیارہویں صدی کے مسلمان ریاضی دان قرون وسطیٰ کے یورپی ریاضی دانوں سے بہت پہلے صفر کا استعمال جانتے تھے لیکن ان میں سے بہت کم لوگوں کو یہ علم تھا کہ اعداد مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی۔)

اسفزاری نے کچھ دیر تک غور کرنے کے بعد بے خیالی میں سر کو جنبش دی۔ "یہ تو کسی یونانی کا خواب معلوم ہوتا ہے وہ ہمیشہ "تکمیل" کے خواب دیکھتے رہے اور آپس میں ایک دوسرے سے اس بات پر لڑتے جھگڑتے رہے کہ اس "تکمیل" کو کس طرح حاصل کیا جائے۔ اس کے علماء میں سے ایک نے جس کا نام "رقم"۔ یا اس سے ملتا جلتا کوئی نام تھا، ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا جس کے ذریعے زمین کو حرکت میں لایا جا سکتا تھا بشرطیکہ اسے زمین کے باہر کھڑے ہونے کے لیے کوئی جگہ مل جائے، اور جب وہ یہ خواب دیکھ رہا تھا تو میدان جنگ میں اسے ایک معمولی سپاہی نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد قدیم زمانے میں ان کے سلطان اعظم سکندر نے ایشیا کے بیشتر ممالک فتح کیے۔ جی ہاں، اس نے یہ طے کیا تھا کہ تمام روئے زمین کو اپنی سلطنت میں شامل کرے گا، لیکن کیا نتیجہ ہوا۔ بے چارہ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے جوانی میں چل بسا۔ اس وقت اس کی عمر ہمارے آقا عمر سے بس کچھ ہی زیادہ ہوگی، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے امراء نے آپس میں لڑ مر کے اس کی مملکت کے حصے بخرے کر لیے۔ اب تو مجاہدین

اسلام نے یونانیوں کا قلع قمع ہی کر ڈالا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ یونانیوں نے جو خواب تکمیل و ترقی کے دیکھے، انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔"

"آقائے عمر کہتا ہے کہ خیالی اعداد کا وجود ثابت ہے۔ جب وہ ایک خلاء (عدم) سے وجود میں لاتا ہے تو صفر کے اس طرف سے ایک مثبت عدد خارج کر دیتا ہے۔"

"خدا کرے ملاؤں کو اس کی خبر نہ ہو!"

اسفزاری اپنے نوجوان مددگاروں کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ دوران گفتگو میں اس نے کہا۔ حجتہ الحق نے نشے کی ترنگ میں اشکال ہذلولی کو ستاروں پر منطبق کر کے خیالی اعداد کی صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔"

"اور سنو! ایک شب وہ مینار سے اتر کر نیچے قبرستان میں جا بیٹھا۔ اس کے ہمراہ وہ مالی بھی تھا جو باغ میں لالے کے تختوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔"

سال ختم ہو گیا۔ تحقیقات و مشاہدات کے آخری اندراجات کی تکمیل کی گئی، اور عمر اور میمون اپنی تقویم کو مکمل کرنے کے لیے آخری دن کے مناسب جزو کا حساب لگانے کے لیے جم کر بیٹھ گئے۔

ایک چوتھائی دن میں چند لمحوں کا فرق ہوتا تھا۔ میمون کے خیال میں ۷/۲۹، لیکن عمر کے حساب سے ۸/۳۳ کا۔

لہٰذا عمر نے فیصلہ کیا کہ "اس طرح ہم 33 سال میں آٹھ دن زیادہ شمار کریں گے۔" (سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ عمر خیام کا خیال درست تھا۔ جس کی رو سے سال میں ۵۴-۱۹ سیکنڈ زائد نکلتے تھے۔ آج کل جو سال رائج ہے اس میں ۲۶ سیکنڈ زیادہ ہوتے ہیں)

دونوں نے مل کر سالہا سال پر مشتمل جدولیں مرتب کیں جنہیں نظام الملک کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ وہ بے چینی سے ان کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ میمون اور اسفزاری درباری خلعت پہن کر قلعہ نیشاپور میں نظام الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقویم کا نسخہ پیش کیا۔

اور نظام الملک نے اسے سنہری نقش و نگار سے آراستہ کرانے کے بعد سرخ ریشم کے کپڑے کی جلد بنوائی جس پر اژدھے کی تصویر زردوز کی گئی تھی۔ اس مطاما اور منقش خوبصورت جلد کو اس نے بہ نفس نفیس ملک شاہ کے حضور میں پیش کیا۔

"سلطان الشرق و الغرب!" نظام الملک نے بڑے ادب سے عرض کیا" خداوند نعمت کے حکم سے حضور کے غلاموں نے نئے سرے سے وقت کا شمار کیا ہے۔ انہوں نے وقت کے پچھلے تمام تخمینوں کو غلط پایا۔ اعلیٰ حضرت کی خواہش کے مطابق یہ گوشوارے حاضر ہیں جن سے آئندہ آنے والے وقت کا صحیح شمار کیا جائے گا۔ میں حضور کے مبارک ہاتھوں میں وہ دستاویز دے رہا ہوں جو اس وقت تک استعمال ہو گی جب تک اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان اس خاک دان زیست میں سانس لیتا رہے گا۔"

ملک شاہ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اسے لیا۔ زردوزی کیا ہوا اژدہا اس کا اپنا نشان تھا۔ اس کا اپنا ستارہ تھا، آسمان میں، اور دانش مند عمر خیام اسے دیکھ کر اس کے حق میں پیشین گوئی کر سکتا تھا، تا کہ اس کا ستارۂ اقبال روشن رہے۔

"خوب، سلطان نے اظہار خوشنودی کرتے ہوئے کہا۔ ان تمام اہل علم کو خلعت اور اشرفیوں کی تھلیاں انعام میں دو جنہوں نے بیت النجوم میں بیٹھ کر انتھک محنت کی ہے، لیکن ہمارے منجم کو چھوٹا کوہستانی محل "قصر کوچک" عطا کیا جائے۔"

نظام الملک نے جھک کر کورنش بجالاتے ہوئے اس انداز سے زیر لب کہا کہ سلطان کے کانوں تک پہنچ سکے۔ "اب صرف حضور کے حکم کی دیر ہے کہ موسم بہار کی اس شام کو جب شب و روز نقطہ اعتدال پر ہوتے ہیں قمری جنتری کی جگہ حضور کی تمام قلمرو میں یہ نئی جنتری جاری کر دی جائے۔ اس شام ایک نئے دور کا پہلا سال شروع ہو گا۔ یہ دور جو خداوند نعمت کے نام سے موسوم ہو گا۔ اسم ہمایونی کی مناسبت سے ہم اسے جلالی سال کہیں گے۔"

اگلے موسم بہار میں مقررہ دن کی شام کو جب روشنی اور سایہ نقطہ اعتدال پر تھے ملک شاہ اپنے تمام درباریوں کو جلو میں لئے ہوئے قلعے کے مینار کی چوٹی پر جلوہ افروز ہوا۔

سورج آہستہ آہستہ وسیع میدان کے اس پار افق کو سرک رہا تھا۔ نیشاپور کے عوام نے اپنے مکانوں کی چھتوں پر قالین بچھا رکھے تھے اور قندیلیں لٹکا رکھی تھیں۔ ہر طرف رونق تھی کیونکہ اس رات جشن منایا جا رہا تھا۔ چھتاروں کی آواز اور عورتوں کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے ہر طرف سڑکوں پر نقیب اعلان کر رہے تھے کہ غروب آفتاب کے ساتھ نئے دور کی ساعت آنے والی ہے۔

سنہری زردوزی سے جگمگاتے ہوئے ایک خلعت میں ملبوس عمر خیام، نوجوان سلطان کے شانہ بہ شانہ کھڑا تھا جو زمین کے آخری کناروں پر آفتاب کو غروب ہوتے دیکھنے میں منہمک تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ البتہ سورج کے اوپر بادلوں کی ایک تہ ضرور نظر آ رہی تھی، جو ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی کے عکس سے اور زیادہ گہری اور زیادہ سرخ ہو گئی تھی۔

"دیکھو" ایک باریش ملا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اللہ نے موت کے پرچم آسمان پر کس طرح لہرا رکھے ہیں۔"

ہر شخص نے مڑ کر ملا کی طرف دیکھا، لیکن امیر الامیراء نے بڑے زور سے چلا کر کہا۔ "ملاحظہ فرمایئے! سلطان عالم، عظمت پناہ و نصرت دستگاہ! ملاحظہ فرمایئے، حضور کے زرین دور کی پہلی ساعت شروع ہوتی ہے۔"

سورج کا آخری کنارا بھی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ صرف خالی خولی خون آلود آسمان اور اس کے نیچے تاریک زمین باقی رہ گئے۔ سڑکوں سے لاتعداد ملی جلی آوازوں کا شور اور قلعے کے مینار اور صحن سے شادیانوں کی صدائیں آنے لگیں۔ عمر نے فصیل کے قریب جا کر نیچے دیکھا۔ ہر چیز سے بے پروا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دھندلی دھندلی نظر آنے والی آبی گھڑی اپنا کام خاموشی سے انجام دے رہی تھی، جو قطرہ ٹپکتا تھا، نئے وقت کا اعلان کر رہا تھا، لیکن کیا وقت کی رفتار میں کبھی فرق آیا ہے؟ جمشید اور کیخسرو کے زمانے میں بھی یہی سورج سطح زمین کو اپنی روشنی بخش رہا تھا۔

"کیا آنے والی صبح" ملک شاہ نے عمر کے کان میں کہا۔ "ہرن کے شکار کے لیے مبارک ہو گئی؟"

عمر نے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''میں حساب لگا کر بتا سکتا ہوں اگر سلطان معظم رخصت ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔''

اجازت ملنے پر عمر محل سے باہر نکل آیا۔ پھر گئے جب جعفرک اسے تلاش کرتا ہوا آیا تو وہ اپنے مطالعہ وعمل کے کمرے میں قندیل روشن کئے تنہا بیٹھا تھا، باہر نیشاپور کا ہر فرد جشن منا رہا تھا۔ عمر ابھی تک درباری خلعت میں ملبوس تھا۔

آقائے عمر، ''سلطان عالم شکار کو روانہ ہونے کے لیے نیک ساعت معلوم کرنے کے منتظر ہیں۔'' جعفرک نے کمرے میں آکر کہا۔

''تو جا کر بتا دے میں نے زائچہ دیکھ لیا ہے..... ہاں جا کر کہہ دے کہ سلطان عالم جس وقت چاہیں اور جہاں چاہیں بلا خوف وخطر شکار فرما سکتے ہیں۔''

''لیکن ملا کہتے ہیں کہ موت کے پھریرے آسمان پر لہرا رہے ہیں۔''

''ملا تو نئی تقویم سے ناراض ہیں اس لئے فال بد نکال رہے ہیں، لیکن ملک شاہ آج بھی آفات سے ایسا ہی محفوظ ہے جیسا کل تھا۔''

''آقا۔ آپ کو یقین ہے؟''

''بے شک!'' عمر نے بڑے وثوق سے کہا۔

جعفرک کو اب بھی تامل تھا۔ ''اچھا میں جاتا ہوں، لیکن کیا آپ یہاں اسی طرح تنہا بیٹھے رہیں گے۔ محل قہقہوں اور نغموں سے گونج رہا ہے۔ وہاں ہر شخص خوشی سے سرشار ہے۔''

ہاں، میں یہاں خاص مقصد کے لئے بیٹھا ہوں۔ جعفرک تو بھی وہ کچھ دیکھے گا جو تجھ جیسے انسانوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

جعفرک نے تشکیک اور اعتبار کے ملے جلے جذبات کے ساتھ زیر لب کچھ کہا۔ خاموشی اور تنہائی میں اسے کبھی خوشی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اپنے بھاری خلعت سے بے نیاز، عمر اک دم کھڑا ہو گیا اور مینار کے زینے کی سمت چل پڑا۔ وہ اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر تانبے کے بنے ہوئے گلوب کے قریب پہنچ گئے۔

''ادھر دیکھ جعفرک! تجھے کچھ نظر آتا ہے؟''

''ستارے۔ صاف شفاف آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے۔''

وہ اپنا سر ایک طرف جھکا کر غور کرنے لگا۔ یہ تو صحیح ہے کہ وہ ستاروں کو حرکت کرتے تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن بیت النجوم کے قیام کے دوران میں اسے اس بات کا ضرور علم ہو گیا تھا کہ ستارے بھی چاند سورج کی طرح طلوع ہوتے اور ڈوبتے ہیں۔ وہ جوزا کے چمکدار سرے کو دیکھ کر یہ بتا سکتا تھا کہ رات آدھی ڈھل چکی ہے۔ ''وہ اکثر کہتا۔ یقیناً ستارے حرکت کرتے ہیں۔ وہ ہر روز آہستہ آہستہ زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ میں نے اس سے قبل بھی بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے۔''

''اور یہ ہماری زمین۔ یہ کیا چیز ہے؟''

''گیند کی طرح گول ہے۔ میرے آقا بالکل اس تانبے کے بنے ہوئے کرے کی طرح۔ یہ ہر چیز کا مرکز ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے اور بس صرف یہ زمین ہی ساکت اور اپنی جگہ قائم ہے۔ خواجہ میمون نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔''

کچھ دیر عمر انتظار کرتا رہا۔ نیچے۔ دریا کے کنارے رات کو اڑنے والے پرندے اپنے بازو پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ایک الو خاموشی سے اڑتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ان کے چہروں پر سرسرانے لگے۔

''نہیں۔ میرے عزیز! بے وقوف! یہ زمین جس پر ہم کھڑے ہیں حرکت کرتی ہے۔ یہ گیند سی گول زمین ایک دن اور ایک رات میں اس طرف سے اس طرف چکر لگا لیتی ہے۔ اوپر نظر اٹھا کر ان ستاروں کو دیکھ، یہ کیسے نظر آتے ہیں۔''

''جعفرک نے خوف زدہ ہو کر اپنی گردن جھکالی اور کانپنے لگا۔'' آقا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''کسی نادیدہ طاقت نے آپ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے یہ مینار گھومتا محسوس ہو رہا ہے۔'' اس کے جسم کی کپکپاہٹ اور زیادہ ہو گئی اور اس نے فصیل کی دیوار کی بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''میرے آقا! اپنے الفاظ واپس لے لیجئے..... نہیں تو..... نہیں تو ہم گر پڑیں گے۔ مجھے یہ مینار حرکت کرتا ہوا محسوس ہو رہا ہے

اور ہم ضرور گر پڑیں گے۔"

"نہیں ہم ہرگز نہیں گر سکتے عمر نے ڈانٹنے کے انداز میں جعفرک سے کہا صرف زمین گھومتی ہے اور ہم ہر طرح محفوظ ہیں۔ ہم بھی دوسری دنیاؤں کے ساتھ ساتھ خلا میں پرواز کر رہے ہیں۔ جو ممکن ہے سورج کی طرح طاقتور، دور افتادہ اور قائم بالذات ہوں۔ کیا تجھے یہ نظر آتا ہے۔ کیا تو یہ بات محسوس نہیں کر سکتا۔ "جعفرک؟"

"خدا مجھے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔"

جعفرک اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگا۔ اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ جس آقا پر وہ جان چھڑکتا ہے پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے اب جانا چاہیے۔ مجھے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر شکار پر روانہ ہونے کے لیے نیک فال سے مطلع کرنا ہے۔"

اور وہ زینے کے اندھیرے کنویں میں اتر گیا۔ خوف نے اس کی آنکھوں پر تاریک نقاب ڈال رکھی تھی۔

سولہواں باب:

بردہ فروشوں کا نیلام گھر

ملک شاہ کی ملک شام میں تازہ فتوحات کے بعد وہاں سے غلاموں اور لونڈیوں کا ایک کارواں نیشاپور میں آیا تھا۔ بردہ فروشوں کے بازار میں نیلام گھر کھچا کھچ بھرا تھا۔ نئی کنیزوں کے خواہش مند امراء پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔

نقیب نے پیتل کی ایک تھالی بجا کر اعلان کیا۔ اب نیلام شروع ہونے والا ہے۔ خریدار توجہ کریں۔

مجمع اتنا کثیر تھا کہ دلال کو پتھر کے بڑے ستون کے قریب، چبوترہ خالی کرانے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ وہ وہاں کنیزوں اور غلاموں کی نمائش کرنا چاہتا تھا۔

"ذی مرتبہ امرا ملاحظہ فرمائیں۔" اس نے با آواز بلند کہا۔ "یہ ایک یونانی لڑکا ہے جس کی عمر بمشکل چودہ سال ہے۔ تندرست و توانا۔ اس کے منہ میں پورے بتیس دانت موجود ہیں۔ اس کے جسم پر نہ کوئی داغ ہے نہ اسے کوئی بیماری ہے۔ بانسری خوب بجاتا ہے۔ اور ہاں! اسلامی طریق پر اس کے ختنہ بھی ہو چکے ہیں۔ کون اس کے لیے تیس دینار خرچ کرنا پسند کرے گا؟" اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ "پچیس دینار، اچھا بیس دینار، جلدی کیجیے۔ یہ قیمت تو ایک کردی گھوڑے سے بھی کم ہے۔"

کر آہستہ آہستہ اس کے جسم کو نمائش کے لیے چاروں طرف گھمایا تا کہ اس کا بے داغ گورا بدن ہر شخص دیکھ سکے۔ اس سے کچھ روز قبل نوجوان غلاموں کی کثیر تعداد میں آمد کی وجہ سے قیمتیں بہت گر گئی تھیں۔ مگر غلاموں کی نئی کھیپ آنے سے پہلے ان قیدیوں کا فروخت ہونا بھی ضروری تھا۔

یونانی لڑکے کی پسلیاں اوپر سے صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ نیم فاقہ زدہ نظر آتا تھا اور بھوک سے بیتاب اور نڈھال ہو رہا تھا۔

ایک وجیہہ ایرانی نے چلا کر کہا۔ ''بلاشبہ ایک گھوڑا اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ نہ تو یہ ہماری زبان سمجھتا ہے اور عمر کے اعتبار سے بھی یہ خواجہ سرائی نہیں کر سکتا۔ میں گیارہ دینار دے سکتا ہوں۔''

''صرف گیارہ! خدا کی قسم یہ کافر..... نہیں! اس نوجوان مسلمان کی رگوں میں شریف خون گردش کر رہا ہے۔ آپ ہی سوچئے۔ کیا اس کی قیمت ایک گائے سے بھی گئی گزری ہے؟ صرف گیارہ دینار؟''

''یہ یونانی تو نیزہ اور ڈھال اٹھانے کے بھی قابل نہیں۔'' ایک اور تاجر نے بلند آواز سے کہا۔ ''بارہ۔''

''بارہ..... درہم۔'' ''یہ نیلام ہو رہا ہے یا خیرات بٹ رہی ہے؟'' دلال نے طنزیہ انداز میں کہا۔ وہ پہلا سودا اتنے سستے داموں بیچنے کو تیار نہ تھا۔

''خیرات نہیں تو اور کیا ہے۔'' وجیہہ ایرانی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''ایسے ایسے لونڈے تو سوق بغداد میں دس درہم سے بھی کم میں فروخت ہو رہے ہیں۔ اچھا تو میری بولی ہے۔ بارہ اور چار۔'' ایک سوداگر نے اس لڑکے کو تیرہ دینار اور تین درہم میں خرید لیا۔ ایک حبشی عورت نے اپنے پاس بیٹھی لڑکی کے کان میں کہا کہ ہم لوگ تو اور بھی سستے داموں فروخت ہوں گے۔ حبشن نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''ایک مرتبہ ایک سردار نے مجھے تین سو سنہری سکوں کے عوض خریدنا چاہا تھا۔''

''ارے اب تو نہ معلوم تو کتنے بچے جن چکی ہے۔'' لڑکی نے زیر لب جواب دیا۔ ''یہ بڑی پرانی بات معلوم ہوتی ہے۔''

''ترک ان لوگوں سے بدرجہ بہتر ہیں۔'' حبشن نے بات آگے بڑھائی۔ ''یہ لوگ تو تاجر ہیں۔ کنجوس، تیرے لیے تو عائشہ کوئی سو دینار بھی دینے کو تیار نہ ہوگا۔''

عائشہ نے اپنا سر گھٹنوں میں دبا لیا اور سوچنے لگی۔ اس کے دانت بہت خوبصورت تھے اور جسم بھی خاصا سڈول تھا۔ بلکہ ایرانی ذوق کے مقابلے میں قدرے نازک۔ وہ نسلاً عرب تھی۔ بنو صفا کے قبیلے سے۔ اور اس کا رنگ ایرانی عورتوں کے مقابلے میں ذرا میلا تھا لیکن ایسا بھی نہیں جیسا کہ حبشن کا۔ اگر اسے انفرادی طور پر فروخت کیا جاتا تو یقیناً کسی نوجوان امیر کی نگاہ انتخاب اس پر پڑ سکتی تھی۔

عائشہ اپنی تقدیر پر شاکر ہونے کو تیار نہ تھی۔ دل ہی دل میں اس تصور ہی سے کھول رہی تھی کہ کہیں اسے کسی ایسے دکان دار کے ہاتھ فروخت نہ کر دیا جائے جو بیک وقت اس سے روٹیاں بھی پکوائے اور.....!

اس نے خدا سے دعا کی کہ کاش! ایسا کبھی نہ ہو۔ وہ خوف اور غصہ کی ملی جلی کیفیت میں تھی۔

''کوئی بھی خریدے تم اتنے ہی داموں میں بکو گی جتنی تمہاری قیمت ہے۔ رقوم کے درخت میں پھل کبھی نہیں آتا۔'' حبشن نے یہ کہتے ہوئے اپنے بالوں کی لٹ جو اس کی پیشانی پر لٹک رہی تھی اوپر کی اور آئینے کے ایک ٹکڑے میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ ''اری ذرا سن تو سہی! ان دو چیچک رو یمنیوں کو اس یہودی نے بیس دینار میں خریدا ہے۔ ہائے ہائے کیا برا وقت آ گیا ہے..... کیا زمانہ آ گیا ہے!''

صحرا میں آزاد رہنے والی عائشہ کی روح اس کے اندر چیخ اٹھی۔ وہ ایک دفعہ پہلے بغداد میں فروخت ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی نقاب کے گوشے سے خریداروں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ دل ہی دل میں انہیں اور اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ پھر اچانک سنبھل گئی۔ ایک سوار مجمع کے قریب آ کر رکا۔ ہر شخص نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ یقیناً وہ کوئی اہم شخص تھا۔ اس کی پگڑی پہ ایک بڑا سا زمرد جگمگا رہا تھا۔ ایک محافظ نے دوسرے محافظ کو بتایا۔ یہ عمر خیام ہے۔ شاہی منجم۔ دربار سے واپسی پر ادھر آ نکلا ہے اسے کنیزوں اور غلاموں میں دلچسپی نہیں۔

عائشہ سمجھ گئی یہ نووارد ضرور کوئی صاحب اقتدار عہدے دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے چہرے پر تھوڑی سی کرختگی ہے اور جٹی بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں شاہین کی سی نظر آتی ہیں لیکن اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ عائشہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور دفعتاً اپنے گھٹنوں پر کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھ جا!'' محافظ نے عائشہ کو ڈانٹا۔ ''ابھی تیری باری نہیں آئی۔''

لیکن عائشہ خوف زدہ ہرنی کی طرح زقند بھر کر اٹھی اور مجمع کو چیرتی پھاڑتی سوار کے پاس پہنچ گئی اور اس کی رکاب مضبوطی سے پکڑ لی ''غریبوں کے والی!'' اس نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ ''مدد کیجئے۔ میں ایک عالی مرتبہ شیخ گھرانے کی فرد ہوں..... میرے والد بنو صفا کے سردار تھے۔'' ''اور اب! اے امیروں کے امیر! یہ لوگ مجھے ان چھوکروں اور بے ہنگم لوگوں کے ساتھ بیچ بازار میں فروخت کر رہے ہیں۔''

عمر نے اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا جن سے التجا ٹپکی پڑتی تھی۔ اس نے سڈول اور جوانی سے بھرپور شانوں کا گداز محسوس کیا۔ اور خوبصورت گردن کے قوس پر بھی نظر ڈالی۔ عائشہ نے اس وقت شرما کر نقاب گرا لیا۔ اس کے ہونٹوں میں خفیف سی لرزش تھی۔ جیسے وہ کوئی زیر لب درخواست کر رہی ہو۔ دل ہی دل میں وہ دعا مانگ رہی تھی کہ کاش عمر عربی سمجھتا ہو۔

عائشہ نے جو کچھ کہا تھا عمر اسے اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ لیکن اس کی نگاہیں عائشہ کی آنکھوں پر مرکوز تھیں جنہیں نے دس سال کے بعد یاسمین کی یاد تازہ کر دی تھی۔

دلال مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور عائشہ کے شانے کو غصے سے پکڑتے ہوئے چلایا ''بس اب اپنے نخرے ختم کر..... چل اپنی جگہ..... مادۂ پلنگ!'' اور عمر کو بڑے احترام سے سلام کیا۔ ''امید ہے آپ اس کی باتوں کا برا نہ مانیں گے۔ خواجہ۔ اس لڑکی کا مزاج ہی آسیب زدوں کا سا ہے۔''

• عائشہ بدستور عمر کی رکاب تھامے کھڑی تھی۔ اس کے رخسار عمر کے گھٹنے کو مس کر رہے تھے۔

''اس کی قیمت کیا ہے؟'' عمر نے سوال کیا۔ ''خیر! کوئی بات نہیں..... میں ۳

سنہری سکے پیش کرتا ہوں۔''

دلال نے بھانپ لیا کہ اسے مزید منافع مل سکتا ہے۔ اس نے مڑ کر مجمع پر نظر ڈالی جو چبوترے سے اتر کر ان کے چاروں طرف جمع ہو گیا تھا۔ دلال نے بلند آواز میں کہا۔ ''مومنو! ایسی لاثانی دوشیزہ کا مول بھی کہیں سو دینار ہو سکتا ہے سینہ اور قد سرو کی طرح حسین ہے۔ مزاج ہرن کے بچے کی طرح چلبلا اور جو بلبل کی طرح چہچہاتی ہے۔ اس کا گانا دماغ سے پریشانیاں محو کر دیتا ہے۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا جو بولی آگے بڑھانے کے لیے مجمع میں شامل ہو گیا تھا۔ ''کوئی ہے جو اس سے زیادہ دام لگائے؟''

''ایک سو اور دس'' مصنوعی خریدار نے چلا کر کہا۔

''دو سو'' عمر نے آواز لگائی۔ ''اب میں اسے اپنے ہمراہ لے جا رہا ہوں۔ نیلامی! میرے گھر آ کر اپنی رقم لے جانا۔''

''الحمد للہ!'' نیلامی نے زور سے کہا۔ اسے اس عرب لڑکی کے بدلے ستر دینار سے ایک کوڑی زیادہ وصول ہونے کی امید نہ تھی۔ ''مومنو! دیکھتے ہو! ہمارے معزز آقا کا ہاتھ کس قدر کھلا ہوا ہے۔ کیسا شاندار ذوق ہے اس کا۔ کیا شاہانہ فیاضی ہے! بہر حال اب اس گانے والی کنیز عائشہ کو خواجہ عمر نے خرید لیا ہے۔.....'' اس نے سوچا کہ اس وقت مجمع کی توجہ عمر کی طرف ہے اور ایسے میں مزید فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے..... دو سو معزز آقا کی پیشکش ''بیس دینار کی حقیر رقم میں جو میری کمیشن ہے اور مزید پانچ دینار بازار کی مسجد کے لیے چندہ۔ سبحان اللہ! کیا سخاوت ہے۔ اس حسین مطربہ کی سواری کے لیے ایک میانہ مہیا کیا جائے گا؟ اس کی نگہبانی کے لیے ایک حبشی خواجہ سرا کی خدمات حاصل کی جائیں گی؟ اور اس کی قیمت کتنی قلیل ہے۔!!''

عمر نے اپنے ملازم کو جو اس کے پیچھے ایک گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ اترنے کا اشارہ کیا۔ اور عائشہ خالی زین پر جلدی سے سوار ہو گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اسے خوف تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ بات ختم ہوتے ہوتے اس کا آقا اپنی رائے بدل دے۔ اس نے تعظیماً عمر کے سامنے اپنا سر جھکا دیا تا کہ وہ اس کے چہرے پر پوری طرح نقاب

ڈال دے۔ وہ اب اس کی ملکیت بن چکی تھی۔

جیسے ہی گھوڑوں نے آگے قدم بڑھایا۔ عائشہ نے گردن موڑ کر حبشی لونڈی پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی۔

''لڑکی!'' عمر نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیا واقعی تو بنو صفا کے شیخ کی بیٹی ہے؟''

لڑکی نے سفید جھوٹ بولا تھا دل کا چور اس کے ہونٹوں پر آ کر رک گیا۔ اس نے عمر کے چہرے پر اس انداز سے نظر ڈالی جس طرح ایک کتا یہ سمجھنے کے لیے اپنے مالک کے منہ کی طرف دیکھتا ہے کہ الفاظ کے پس منظر میں کونسا جذبہ کارفرما ہے۔ ''نہیں عالی جاہ! میں شیخ کی بیٹی نہیں ہوں۔'' اس نے بلند آواز سے اپنی غلط بیانی کی تردید کی۔ وہ جھوٹ تھا۔ لیکن گانا مجھے واقعی آتا ہے۔''

عائشہ پہلے تو گھبرائی کہ نیا آقا اس کے جھوٹ پر بگڑ نہ جائے۔ لیکن جب عمر مسکرایا۔ تو وہ حیران ہو کر یہ سوچنے لگی کہ یہ کس مزاج کا آقا ہے جو ایک حسین دوشیزہ کے منہ سے سچی بات کہلوانا چاہتا ہے۔

ستارھواں باب:

قصر کوچک کا پائیں باغ

عائشہ حیران اور متعجب تھی۔ اور اس کی حیرت درست تھی کیونکہ سلطان کے ستارہ شناس پر نہ تو اس کے حسن و شباب نے کوئی اثر کیا اور نہ وہ اس سے شب باش ہوا لیکن اس نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دے لی کہ نیا آقا ایک مہینہ انتظار کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس زمانے کی رسم تھی۔ صحرائی جنگ و جدل کے زمانے میں جنگجو، قیدی عورتوں سے یا تو جنگ کا جوش ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی لطف اندوز ہو لیتے تھے یا پھر رسم و رواج کے مطابق ایک ماہ انتظار کرتے تھے۔ عائشہ کو ایک محافظ دستے کے ہمراہ نئے آقا کے گرمائی محل روانہ کیا گیا جو دامن کوہ میں نیشاپور کے مشرق میں دو کوس کی مسافت پر تھا۔

وہاں پہنچ کر جو پہلی بات اسے معلوم ہوئی وہ خلاف امید بڑی حیران کن تھی۔ محل جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا تھا۔ بہت ہی مختصر تھا۔ وہ خوب صورت نیلے رنگ کے ٹائلوں سے بنایا گیا تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک کوہستانی باغ تھا جس کے ایک طرف اورے رنگ کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ عائشہ کو رہنے کے لیے جو کمرہ ملا تھا اس کے دروازے چھت کی طرف کھلتے تھے۔ اور ایک گھنٹے کے اندر اسے یہ معلوم کر کے تسکین ہو گئی کہ اس کے قماش کی کوئی دوسری عورت وہاں موجود نہیں ہے۔

''نہیں! ہمارے آقا کی کوئی بیوی نہیں ہے۔'' بوڑھی زلیخا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے کہ ایک دفعہ اس نے شادی کی تھی لیکن دلہن گھر پہنچنے سے پہلے ہی

طاعون سے مرگئی تھی۔"

مطبخ کی منتظمہ ہونے کی حیثیت سے بوڑھی زلیخا کو دنیا جہان کی خبریں معلوم رہتی تھیں۔

"کبھی کبھی" اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔"وہ ناچنے والی لڑکیوں کو چند ساعتوں کے لیے یہاں لاتا ہے لیکن بہت جلد ان سے اکتا جاتا ہے اور تحفے تحائف دے کر انہیں رخصت کر دیتا ہے۔"

کیا وہ اسے بھی تحفے دے کر یا ویسے ہی رخصت کر دے گا۔ عائشہ نے سوچا لیکن پھر اسے خیال آیا اس نے اسے خریدا ہے اور اس طرح اس پر کچھ ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ لیکن عائشہ کو ایسی نوجوان کنیزوں کا حشر بھی اچھی طرح معلوم تھا جو اپنے آقاؤں کی دل بستگی کا سامان مہیا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ بہر حال قصر کوچک میں قیام اسے بہت ہی خوش گوار محسوس ہو رہا تھا۔

ایک جوئے آب پائیں باغ میں سرو کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے گزرتی ہوئی ایک حوض میں گرتی تھی۔ حوض کے چاروں طرف قالین بچھے تھے۔ ہر طرف سفید گلاب کی بیلیں چڑھی تھیں حتی کہ مٹی کی بنی ہوئی فصیل ان سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں ایک چھوٹا سا کھلا ہوا خیمہ ایستادہ تھا۔ عائشہ اس کے موٹے موٹے گدیلوں پر لیٹی مزے لے لے کر مصری کی ڈلیاں چوستی رہتی۔ فوارے کی بہار دیکھتی۔ ناخنوں پر مہندی لگاتی رہتی۔ عائشہ کے لیے قصر کوچک کی زندگی حسین خواب کی طرح تھی۔

"اس جگہ کے علاوہ۔" زلیخا نے بڑے فخر سے بتایا۔"اور بھی بہت سی جگہیں ہیں۔ ہمارے آقا کا ایک محل نیشاپور میں ہے۔ دوسرا قصر سلطانی کے قریب مرو میں ہے۔ اس کا ایک اور محل بھی ہے جسے بیت النجوم کہتے ہیں۔ وہاں لمبی لمبی داڑھیوں والے عالم کام کرتے ہیں۔ ہمارے آقا کے حکم سے وہ وہاں بیٹھ کر کتابیں تصنیف کرتے ہیں؟"

"واہ! کتابیں تصنیف کرتے ہیں؟"

"ہاں۔ کتابیں۔ ہمارے آقا کے یہاں کتابیں اس طرح عام ہیں جیسے کھجوریں۔ خود اس نے سلطان کے لیے الجبرے کی ایک کتاب تیار کی تھی۔"

"ارے۔ کیا کہہ رہی ہو؟"

"ایک الجبرا کیا اس کا تعلق جادو کے اعداد و شمار سے ہے۔ ہمارا آقا اس قدر دانش مند ہے کہ اسے وہ بہت کچھ معلوم ہے جو گزر گیا۔ اور وہ بھی جو آئندہ ہونے والا ہے..... خدا کے فضل سے۔ اسی وجہ سے تو سلطان بغیر اس کے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتا۔ اس کا اقتدار بھی اتنا ہی بلند ہے جتنا نظام الملک کا۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ شاہی دعوتوں میں وہ فوج کے اعلیٰ عہدے داروں سے بھی پہلے بیٹھتا ہے حالانکہ ہمارے سلطان کو فوج سے زیادہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں۔ علاوہ شکار کے۔"

عائشہ کو اب تک یہ بات سمجھ میں آچکی تھی کہ جنگ، حملے، شکار، طاقت ور لوگوں کے مشاغل کا اہم جزو تھے۔ جو عورتوں کو یا تو تفریح کا ذریعہ تصور کرتے تھے یا پھر ان سے نسل کشی کا کام لیتے تھے۔ انسان جتنا طاقت ور اور با اقتدار ہوتا تھا اسی تناسب سے اس کے یہاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں غلام اور لونڈیاں ہوتی ہیں۔

"ہمارا آقا بڑی شان دار دعوتیں کرتا ہے!" زلیخا نے عائشہ کو بتایا۔ پہلے ہی دن سے اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ عائشہ گھریلو معاملات میں دخل نہ دے گی وہ اس کے ساتھ بہت گھل مل کر باتیں کرتی تھی۔ ایک چیونٹی کے بل میں تو شبنم کا ایک قطرہ بھی طوفان کے برابر ہوتا ہے۔"میں کیا بتاؤں وہ باغ میں بیٹھ کر صراحیاں کی صراحیاں خالی کر دیتے ہیں۔ بھنے ہوئے تیتر، ہرن کے کباب، منوں چاول اور زعفران۔ شاہی گلزروں کی قابیں کی قابیں، پہاڑوں کی بلندیوں سے آئی برف میں لگے ہوئے تربوزوں کے ڈھیر کے ڈھیر، بس وہ بیٹھے کھاتے رہتے ہیں۔ اور مسلسل باتیں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ستارے ماند پڑنے لگتے ہیں۔"

"کیوں نہ ہو! تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی تو بے حد لذیذ ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو اس طرح مہکتی ہے جیسے نجد کے کسی باغ کی خوشبو۔ لیکن آخر وہ کیا باتیں کرتے ہیں۔ دل بہلانے کے لیے ان کے پاس حسین لونڈیاں بھی نہیں ہوتیں۔"

"کبھی وہ نجوم اور ریاضی کے مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ کبھی مذہب اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں اور نہ جانے الم غلم کیا کیا بک بک جھک جھک کرتے ہیں۔ میری بلا جانے! وہ ایسے موٹے موٹے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان کو سمجھنے کی کوشش میں میرا تو سر چکرانے لگتا ہے۔"

ایسی بھاری بھرکم باتیں سن کر تو واقعی انسان کا سر چکرانے لگتا ہے۔ زلیخا کی گفتگو ہی خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زلیخا معموں میں باتیں کر رہی ہے۔

عائشہ ان ایرانیوں سے اپنا مقابلہ کرنے لگی۔ چُندھے دربان سے لے کر اس کبڑے تک جو سفید خچر پر سوار ہو کر آتا جاتا تھا۔ سارے کے سارے اپنے آقا کی فیاضی پر گزر بسر کرتے تھے۔ وہ سونے سے زیادہ باتیں کرتے تھے۔ اور کام کرنے سے زیادہ سوتے تھے۔ ان کے سر پر کوئی نگراں نہ تھا جو انہیں اپنے فرائض سرانجام دینے پر مجبور کرتا۔

قصر کو چک میں بیس باغبان مقرر تھے جن میں بڑے مالی سے لے کر خاکروب تک شامل تھے۔ سوائے اپنے ذاتی معاملات اور باغ کے متعلق تھوڑی بہت باتیں کرنے کے، شاید ہی کبھی وہ کام کو ہاتھ لگاتے ہوں۔ وہ اپنی خواب گاہ کی چھت سے ان سب کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ "ارے بھائی علی! پچھلی برسات بنفشہ کی کیاریوں میں پانی کے ریلے کے ساتھ سنگ ریزے بہہ کر آ گئے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ کیاریاں صاف کر کے ان کی گدائی کر دوں....." علی جواب دیتا "بھائی حسین! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس کام کے لیے وہ زمانہ نہایت مناسب ہوتا ہے جب آفتاب خط استوا کو قطع کرتا ہے۔ پھر یہ کام احمد کا ہے اور اللہ اسے شفا دے۔ بے چارہ کب سے بیمار پڑا ہے....."

"آقا نے کبھی اچانک آ کر ان اجڑی ہوئی کیاریوں کو دیکھ لیا تو بہت خفا ہوں گے اور پھر اس کی خفگی جائز ہو گی....." "اس میں کیا شک ہے۔ انشاء اللہ میں اس کام کو اب بہت جلد کروں گا۔ سنگ ریزے نکال کر، مرجھائی ہوئی پتیوں کو صاف کر کے۔ کل ضرور کیاریوں کی گدائی کر دوں گا۔"

لیکن کل پھر علی انتظار کرے گا کہ احمد کالڑکا آ کر اس کا بیلچہ درست کر دے جو پچھلے سال خزاں کے موسم میں ٹوٹ گیا تھا۔

"اور حسین! بھئی سنتے ہو! یہ بہت ہی ضروری کام ہے کہ روشوں میں جو گڑھے پڑ گئے ہیں انہیں فوراً بھر دیا جائے۔ مبادا چلتے پھرتے ہمارے آقا کا پاؤں کسی گڑھے میں جا پڑے، تو بس سمجھ لو قیامت ہی برپا ہو جائے گی....." "بھئی علی۔ آجکل میں تو گلاب کی کیاریاں کھودنے میں لگا ہوا ہوں۔ دو کام تو ایک ساتھ نہیں کر سکتا؟"

لیکن یہ سب کچھ خوئے بد تھی۔ وہ گلاب کی کیاریوں کی گدائی وغیرہ تو کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ البتہ گاؤں کی پن چکی والے کی لونڈیا کے لیے عمدہ عمدہ سرخ پھولوں کا ایک ہار بنانے میں مصروف تھا۔ لیکن دل سے وہ یہی چاہتا تھا کہ گلاب کے تختوں کی گدائی، نرائی کرے، ان کی شاخوں کو کاٹ چھانٹ کر انہیں جاذب نظر بنائے..... حسین نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ کل سے ضرور یہ کام شروع کر دے گا۔

یہ کام چور اگر کسی دن صبح کے وقت تھوڑا بہت کم کر لیتے تھے تو بس پھر کیا تھا۔ دن ڈھلے تک سرو کے درختوں کے سائے میں پڑے خراٹے لیتے رہتے۔ سارے اوزار بے ترتیبی سے دھوپ میں پڑے تپتے رہتے۔ اس دوران میں اگر کسی وقت ان کی آنکھ کھل جاتی تو دھوپ کی تیزی کا خیال کر کے پھر اونگھنے لگتے اور بالآخر بقیہ کام دوسرے دن کے لیے ملتوی ہو جاتا۔

اس کے باوجود باغ ہمیشہ ہرا بھرا رہتا۔ ساری فضا گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مہکتی رہتی۔ گلاب کی ہری بھری شاخوں کے شامیانے کے نیچے ہمیشہ ٹھنڈی چھاؤں موجود رہتی۔ عائشہ اکثر وہاں آ کر لیٹ جاتی تھی۔ اونگھتی رہتی اور عمر کے آنے کا انتظار کرتی رہتی۔

اور آخر ایک دن عمر سچ مچ آ ہی گیا۔ سارے قصر میں ایک ہل چل مچ گئی۔ دربان نے اپنے آقائے نامدار کو جیسے ہی دور سے آتے دیکھا جلدی جلدی بہترین پوشاک پہن کر استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ سارے باغبان..... حتیٰ کہ احمد بھی، جو بیماری کا بہانہ کیے ہر وقت پڑا اینڈتا رہتا..... اپنے اپنے اوزار سنبھال کر ادھر ادھر

دوڑنے لگے۔ اور عمر کو آتا دیکھ کر اس طرح دست بستہ کھڑے ہو گئے جیسے اس کی آمد سے ان کی مصروفیت میں ذرا دیر کے لیے خلل واقع ہو گیا تھا..... ادھر زلیخا نے باورچی خانے میں دھڑا دھڑ، اٹھا پٹخ کر کے ایک طوفان بدتمیزی برپا کر دیا۔ باورچی خانہ بھوتوں کا مسکن لگ رہا تھا۔

..... عائشہ زنان خانے تک محدود ہو گئی۔ اس کا باغ میں آنا جانا موقوف ہو گیا۔ درجن بھر مہمان عمر کے ہمراہ آئے تھے اور قصر کوچک کا والی کئی ہفتے تک دن رات اپنے معزز مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف رہا۔ کچھ مہمان اگر رخصت ہو جاتے تو ان کی جگہ دوسرے آ جاتے تھے۔ مہمانوں کے آنے جانے کا سلسلہ ہفتوں جاری رہا۔ عائشہ یا تو اپنے کمروں میں وقت گزارتی یا کبھی کبھی گہرا نقاب ڈال کر چھت پر جا بیٹھتی۔ وہ اندیشوں میں گھری رہتی۔ اسے لگتا کہ عمر اسے بھول چکا تھا۔

دیوان خانے میں مہمانوں کی موجودگی میں عائشہ کو عمر سے بات کرنے تک کا موقع نہ مل سکا۔ اور پھر وہ تو ایک نو خرید کنیز تھی..... زلیخا کے ذریعے عمر کو کسی قسم کا پیغام بھیجنے کی جسارت کیسے کر سکتی تھی۔ کبھی وہ سوچتی کہ شاید عمر نے اسے چھت پر بیٹھے دیکھا لیا ہو گا۔ وہ اپنا پیسہ ضائع ہونے پر پچھتا رہا ہو گا اور اسے کسی کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ کر رہا ہو گا۔ عائشہ پہروں اکیلی بیٹھی اسی قسم کی باتیں سوچتی رہتی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہر روز غسل کرتی، بڑی احتیاط سے بال بناتی اور سولہ سنگار کر کے بے چینی سے عمر کے اندر آنے کا انتظار کرتی رہتی۔ اسے عمر سے ڈر بھی لگتا تھا لیکن وہ کسی اور کے ہاتھ فروخت ہونا بھی تو نہ چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر ایک مرتبہ بھی عمر اسے قریب سے بے نقاب دیکھ لے تو پھر اس سے بے التفاتی نہ برت سکے گا۔

مغرب کے بعد جب شمعوں کی روشنی میں مرد کھانا کھاتے تو وہ اپنی خواب گاہ کے پردے کے پیچھے آرام سے لیٹ جاتی اور ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک حرف سنتی رہتی۔ ہر مہمان کی گفتگو سے اس کے کردار کا اندازہ لگاتی رہتی..... اس کے کان گلدار کی طرح تیز تھے.....!

مہمانوں میں بھورے بالوں والا ایک ارمنی تاجر بھی شامل تھا جس کا نام

اقرونوس تھا۔ اس کے متعلق وہ صحیح نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ وہ عمر سے اکثر تنہائی میں گفتگو کرتا۔ وہ فیروزے کی کانوں، ہاتھی دانت سے لدے ہوئے کاروانوں اور ہزاروں دینار کے منافع کی باتیں کرتا۔ عائشہ اس قسم کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اقرونوس اس کے آقا کا تجارتی شریک ہے اور یہ بھی کہ عمر کے پاس بے اندازہ دولت ہے۔ اس قسم کی باتیں سن کر اسے اب وہ رقم بالکل حقیر معلوم ہونے لگی جس کے عوض عمر نے اسے خریدا تھا۔ اس کا دل اب کچھ کچھ مطمئن ہو چکا تھا.....!

مہمانوں میں ایک شاعر بھی تھا۔ چکنے بالوں والا۔ لوگ اسے معزی کہتے تھے۔ عائشہ کو اس سے نہ معلوم کیوں چڑ سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ عمر کی سب سے زیادہ تعریفیں کرتا رہتا تھا..... سلطان کا منجم ریاضی میں ید طولیٰ رکھتا ہے..... علم نجوم میں لاثانی ہے۔ اور معزی کے قول کے مطابق اسے یعنی عمر کو موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا..... کبھی وہ کہتا کہ اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے کہ سارے ملک کے مدرسوں میں مسلمان کے لاتعداد بچے اس کی کتابیں پڑھ رہے ہیں..... لیکن عائشہ کے خیال میں یہ سب کچھ خوشامد اور چاپلوسی پر مبنی تھا۔

ایک مرتبہ سب نے معزی کو اشعار سنانے پر مجبور کیا تو اس نے بڑے تکلفات کے بعد ایک قصیدے کے چند شعر سنائے

عائشہ ان اشعار سے بہت لطف اندوز ہوئی۔ جب معزی نے والئ قصر کوچک سے اصرار کیا کہ وہ ان شعار کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرے تو خیام نے صرف اتنا کہا کہ

''اب مجھے معلوم ہوا کہ تجھے سلطان نے درباری شاعر ہونے کا شرف کیوں بخشا ہے۔''

اس رات معزی نے بے تحاشا شراب پی۔ اور ایک صوفی سے اس بات پر بہت دیر تک بحث کرتا رہا کہ اسے قصیدے میں ''عارض'' کے بجائے ''چہرہ'' کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ صوفی اپنی گفتگو میں ''ہستی'' اور ''نیستی'' اور ''آفاقی عشق'' کی طرح عجیب عجیب الفاظ استعمال کرتا رہا عائشہ کے پلے خاک نہ پڑا لیکن جب معزی

نے با آواز بلند اعلان کیا کہ وہ اپنے یہاں کی ایک دعوت کے چند پوشیدہ واقعات بیان کرنا چاہتا ہے تو عائشہ نے ہمہ تن گوش ہو کر اس کے آواز پر کان لگا دیئے۔

''اسے ایک لطیفہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اے میرے ہم پیالہ دوستو! بڑا ہی شگفتہ لطیفہ! میں اپنے مکان کے پائیں باغ میں ..... جو اس چاندنی سے جگمگاتے ہوئے باغ کے سائے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا..... چوگان کے میدان سے کچھ امراء کو مدعو کر کے لایا۔ جب ہم شکم سیر ہو کر کھا چکے اور شراب کا بھی ایک سرسری دور ہو چکا..... ایسی روح افزا شراب کا نہیں جو ہم ابھی پی چکے ہیں..... تو میں نے ناچنے والی جوان لڑکیوں کو بلانے کے لیے تالی بجائی۔ لیکن وہ دراصل لڑکیاں نہیں تھیں۔ میں نے پہلے ہی سے چند پری چہرہ لڑکے مامور کر رکھے تھے جنہیں ناچنے والی لڑکیوں کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے چہروں پر نقاب بھی ڈال دیئے تھے۔ بہر حال وہ آ گئے، تھوڑی دیر ناچے اور بھاگ گئے۔ میں نے اپنے مہمانوں کو اکسایا کہ وہ انہیں خود جا کر ڈھونڈیں اور پکڑ کر پھر محفل میں لے آئیں۔ سارے مہمان اسے مذاق سمجھ کر دوڑ پڑے اور باغ کے اندھیرے کنجوں میں غائب ہو گئے۔''

معزی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ عائشہ نے پردے سے جھانک کر نظر ڈالی۔ عمر کے چہرے سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی، کسی قسم کا تاثر نہ تھا۔

عائشہ کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ قصر کو چک کے حرم میں داخل ہوئی تھی تو ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ زلیخا نے اسے بڑے اعتماد کے ساتھ اس امر کا یقین دلایا تھا کہ اس قصر کے مالک کے پاس شہر سے گانے بجانے والی جوان عورتیں وقتاً وقتاً آتی رہتی ہیں مگر وہ بہت جلد اکتا کر انہیں رخصت کر دیتا ہے۔ عائشہ کا ذہن معاً لڑکوں کی طرف گیا تھا۔ لیکن اسے وہاں کوئی بے ریش لڑکا بھی دکھائی نہ دیا تھا..... بہر حال وہ معزی کو شدت سے ناپسند کرتی تھی۔ دل ہی دل میں وہ اس کے لیے ایسے ایسے مضحکہ خیز القابات مرتب کرتی رہی کہ اگر سلطان کا عالی مرتبت منجم ایک دفعہ سن لیتا تو عش عش کر اٹھتا۔

عمر کے مہمانوں میں ایک ہندو بھی تھا۔ تھا جو پتھر کی طرف خاموش سب کی

باتیں سنتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ایک ہم نشین کے کان میں چپکے سے کہنے لگا کہ عمر کا یہ علمی تبحر اس کے پچھلے جنم کی یادگار سے جو اس کے تحت الشعور میں رچا ہوا ہے اسے اپنے علم کے اس پوشیدہ سرچشمے کا قطعی علم نہیں۔

عائشہ اس بات کو نہ سمجھ سکی۔ لیکن غیر شعوری طور پر وہ اتنا ضرور سمجھتی تھی کہ یہ ہندو روحانی طور پر اس نڈر آنکھوں والے نوجوان کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتا تھا جو اکثر اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی عبا پہنے قصر میں آتا جاتا تھا۔ لوگ اسے غزالی کہتے تھے..... صوفی غزالی۔

عمر اور غزالی عموماً باغ میں ٹہلتے ہوئے گفتگو کرتے تھے۔ اول تو عائشہ ان کی باتیں سن ہی نہ پاتی تھی اور اگر ایک آدھ فقرہ کبھی کان میں پڑ بھی جاتا تو اس کا مطلب پلے نہ پڑتا تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں ''مرئی'' اور ''غیر مرئی'' وغیرہ قسم کی اصطلاحیں استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر:

عمر: اگر ہم آسمانوں کو ان کی اصلی ہیئت میں دیکھ سکتے تو بالکل ایک نیا منظر، نئی وسعتیں ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں گی۔ واللہ! اگر ایسا ہو جاتا تو ہم اس اپنی بوڑھی دنیا کو چھوڑ کر نئے آفاق کی ندرتوں سے سکون قلب و نظر حاصل کرتے۔

غزالی: ''ہم آفاق کے چہرے سے اس وقت تک نقاب نہیں اٹھا سکتے جب تک عشق الٰہی میں ڈوب کر کاملیت اور معرفت کے درجے پر فائز نہ ہو جائیں.....'' ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ عمر نے باتیں کرتے کرتے شراب کا ایک چھلکتا ہوا جام اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور غزالی نے فوراً اسے ٹوکا کہ ''حرام ہے۔''

عمر نے اطمینان سے شراب پی کر مسکراتے ہوئے خالی پیالہ نیچے رکھ دیا اور کہا۔ ''کم سے کم شراب کی بے حرمتی تو نہ کرو یہ صرف اس لیے تلخ ہے کہ میری زندگی ہے اور زندگی تلخیوں اور ناکامیوں کا دوسرا نام ہے۔''

''شراب زندگی ہے!'' عائشہ نے حیرت سے سنا اور انتظار کرنے لگی کہ دیکھو اب صوفی کیا کہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد صوفی اس مسئلے پر بحث کرنے لگا کہ باوجود یکہ دنیا میں لاتعداد مذاہب ہیں۔ لیکن سب ہی خدا کو مانتے ہیں جو وحدہ لاشریک ہے۔''

''خود اسلام میں کتنے فرقے ہیں۔ کچھ فرقے عقائد کے اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں ان کے برعکس صوفیاء کا طبقہ ہے جو رجعت پسندی کے مخالف ہیں۔ مثلاً علوی ہیں جو حضرت علیؓ کو نہ معلوم کیا کیا سمجھتے ہیں۔ اسلام میں ایک ایسا بھی فرقہ ہے جسے مہدی موعود کے ظہور کا شدت سے انتظار ہے۔ مسلمان ہونے کے باوجود ان تمام فرقوں کے طریقے الگ الگ ہیں۔ ہاتھی کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ..... ہندوستان میں ایک ہاتھی والے نے اپنے ہاتھی کی نمائش بین وہاں آئے تو اندھیرے کی وجہ سے انہیں ہاتھی نظر نہ آتا تھا۔ ایک شخص نے اس کی سونڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ یہ جانور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لچکدار شہتیر۔ ایک اور شخص نے جب ہاتھی کو ٹٹول کے دیکھا تو اس کا ہاتھ ہاتھی کے کان پر جا پڑا تو اس نے رائے دی کہ یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے تاڑ کا ٹیڑھا پنکھا۔ ایک تیسرا شخص جو ہاتھی کی ٹانگوں پر ہاتھ پھیر کو دیکھ چکا تھا کہنے لگا تم سب جھوٹ بولتے ہو۔ نہ یہ شہتیر کی طرح ہے نہ پنکھے کی طرح یہ تو دراصل ستون کی مانند ہے۔ اگر کوئی شخص اس مقام کو شمع جلا کر روشن کر دیتا تو ہر شخص ایک ہی اور بالکل صحیح رائے قائم کرتا۔''

ہمارا بھی یہی حال ہے لیکن اس وسیع دنیا کو روشن کرنے کے لیے شمع کہاں سے ملے گی؟'' عمر نے سوال کیا۔

''اہل طریقت۔ صوفیوں کے روشن خوابوں سے۔'' غزالی نے با آواز بلند جواب دیا۔ ''کیونکہ صرف انہی کی حقیقت نگر آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ تاریکی کے اس پردے کے پیچھے کیا اسرار پوشیدہ ہیں۔''

''لیکن ان کی پہچان کیا ہے؟'' عمر نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں نے انہیں بہت تلاش کیا لیکن ..... لیکن وہ کہاں ہیں؟ غالباً وہ سب آفاق کی ظلمتوں کے اس پار اپنے اپنے مقام پر جمے بیٹھے ہیں۔ شاید وہ تھوڑی دیر کو جاگے۔ پرانی داستانیں سنائیں اور تاریک پردوں کے پیچھے جا کر پھر گہری نیند سو گئے۔''

عمر کے دل و دماغ پر غزالی کی گفتگو سے ایک عجیب قسم کا ردعمل ہوا۔

عائشہ بہت خوش ہوئی کیونکہ نوجوان صوفی کے واپس جانے کے بعد عمر معزی

اور مہمانوں سے ایک دم اکتا سا گیا۔ ایک روز جب وہ سب بڑی شدومد سے بحث مباحثے میں مشغول تھے تو عمر جعفرک کے سفید گدھے کو گھسیٹتا ہوا ان کے پاس لایا۔ یہ منظر دیکھ کر سارے مہمان یک لخت خاموش ہو گئے۔ عمر نے نہایت سنجیدگی سے انہیں سمجھایا کہ ان سب کو اس گدھے کی مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے..... ''یہ گدھا پچھلے جنم میں ایک دارالعلوم کا معلم رہ چکا ہے۔''

اس واقعے کے بعد سارے مہمان رخصت ہو چکے تھے اور عمر تاروں بھرے آسمان کے نیچے پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ عائشہ ہمت کر کے آخر اس کے پاس پہنچ ہی گئی۔ اس نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر عمر کا ہاتھ پکڑا اور اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔

''خدا میرے آقا کو سلامت رکھے!''

''اور تجھ پر بھی سلامتی ہو۔''

''میرے سرتاج! میں نے ابھی ابھی دیکھا تھا کہ ایک شخص دبے پاؤں آپ کا پیچھا اس طرح کر رہا تھا جیسے کوئی جاسوس ہو۔ وہ پھر چپکے سے گلاب کی ان جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ میں نے اس کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔''

''احمد باغبان تو نہیں تھا؟''

''ہاں! احمد ہی تھا۔ اس کے درے لگانے چاہیں۔''

وہ دوشیزہ جو ریگستانی قبیلوں میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ جاسوس کو سب سے بڑا دشمن خیال کرتی تھی اور اس کے بیخ کنی کی اس طرح قائل تھی جس طرح سانپ کی۔

عمر ایک لمحہ خاموش رہا۔ ''نہیں! جن لوگوں نے اسے یہاں مامور کیا ہے اس کو ان کے پاس جا کر گدھے والا قصہ بیان کرنے دو۔ اگر میں اسے مار پیٹ کر باہر نکال دوں تو پھر وہی لوگ احمد سے بھی زیادہ خطرناک شخص میری نگرانی کے لیے مقرر کر دیں گے۔''

عمر کا یہ جواب سن کر عائشہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا اس کا مطلب ہے آقا کو گویا احمد کی جاسوسی کا پہلے ہی سے علم تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے دیکھتے

ہی سمجھ لیا تھا کہ وہ بنو صفا کے سردار کی لڑکی نہیں۔ اس کے سحر کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس نے اس وقت جب کہ وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل سر جھکائے کھڑی تھی، بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے خیالات پڑھ لیے ہوں گے۔

ادھر عمر اپنے ہی خیالات میں گم خود کلامی کر رہا تھا۔ ''لوگ جنت کا ذکر کرتے ہیں۔ جنت کی حقیقت یک لحہ سکون سے زیادہ نہیں۔''

عائشہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''یہ باغ کس قدر خاموش اور پرسکون ہے۔ لیکن یہاں بھی جاسوس چکر لگاتے رہتے ہیں۔ باتونی لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ گشت کرنے والے اجازت کے بغیر اندر آ جاتے ہیں..... عائشہ! میرے نوکر چاکر تجھے کسی قسم کی تکلیف تو نہیں پہنچاتے؟''

''بالکل نہیں آقا! کیا..... میرے سرتاج پسند کریں گے کہ میں بانسری پر نغمہ سنانے کی جسارت کروں''

''اب بہت رات گزر چکی ہے..... تھوڑی دیر کے بعد افق پر سپیدۂ سحری نمودار ہو جائے گا۔ جاؤ، اب جا کر سو رہو۔ عائشہ۔''

عائشہ خاموشی سے۔ مگر دل میں غصے سے کھولتی ہوئی۔ اپنی خواب گاہ میں واپس آ گئی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو آقا بھلا کاہے کو اس کی طرف متوجہ ہونے لگا؟ اس نے اس کا سر اس طرح تھپتھپایا تھا جیسے وہ اس کے اصطبل کی ایک گھوڑی ہے۔ اور اسے سو جانے کی اس طرح ہدایت کی تھی جیسے وہ کوئی ننھی بچی ہو۔

عمر حوض کے کنارے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ غزالی کی عمر بھی اتنی ہی ہو گی جتنی کہ خود اس کی عمر تھی جب وہ رحیم کے ہمراہ محاذ جنگ پر گیا تھا اور..... اور یاسمین نے اسے ایک گلاب کا پھول یادگار کے طور پر دیا تھا۔ غزالی کس قدر مطمئن تھا۔ خود اعتمادی سے بھرپور جو جوانی کا لازمہ ہے۔ کیسا عجیب زمانہ ہوتا ہے یہ! کاش دور شباب کبھی رخصت نہ ہوتا۔ اس نے محسوس کیا جیسے جوانی اس سے منہ موڑ چکی ہو۔ یہ کیسے ہوا اور کب ہوا؟ اسے معلوم بھی نہ ہو سکا۔ بہر حال اس کی کتاب زندگی کا یہ زریں باب یکا یک ختم ہو گیا اور ایک نیا باب شروع ہو گیا..... بے کیف، بدمزہ.....!

غزالی کے لیے زندگی ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی عمر کے لیے ایک فسانہ بن گئی ی۔ مبہم، نامکمل، تشنہ، ایک خشک مزاج زاہد کے لیے زندگی شباب کی پوری رعنائیوں کو لو میں لیے، اس کی نگاہ التفات کا انتظار کر رہی تھی لیکن ایک منجم کے لیے زندگی کی لاوتوں سے لطف اندوز ہونے کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں حائل تھیں۔

''وہ ایک اعلیٰ درجے کا معلم ثابت ہو گا۔'' عمر نے سوچا۔ ''اور مجھے افسوس۔ بھی پڑھانے کا موقع نہ مل سکا۔''

اگلے روز عمر کو اچانک کچھ خیال آیا اور اس نے تالی بجائی۔ عمارت سے نکل کر یک ملازم بھاگا ہوا آیا اور ادب سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''میرے منقش نگینوں ار پرانے سکوں کا صندوقچہ لے کر آؤ۔'' عمر نے ملازم کو ہدایت دی۔ ''نیلے گنبد میں چینی کمبلوں کے انبار کے پاس رکھا ہے'' اس نے گردن اٹھا کر پہلی دفعہ اس شخص کے چہرے نظر ڈالی..... ''احمد''۔

احمد صندوقچہ رکھ کر ایک طرف ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عمر نے اپنے کمر بند سے چابی نکالی اور قفل کھولا۔ اس صندوقچے کو بند رکھنا ضروری تھا۔ کیونکہ مقفل صندوقچے کو پرانے کا تو کوئی بھی خیال نہ کرے گا البتہ اگر اسے کھلا چھوڑ دیا جاتا تو اس کے اندر رکھے ہوئے سنہری سکے دیکھ کر زلیخا یا کسی اور خادمہ کے منہ میں پانی بھر آنا ایک فطری امر تھا۔ اس کی انگلیاں سنہرے سکوں کے لمس کے لیے بے قرار ہو جاتیں۔ اور اگر آقا ان میں سے کسی پر چوری کے شبہے کا اظہار بھی کر دیتا تو وہ روتے روتے اپنی جان ہلکان کر ڈالتیں۔

''اور کوئی حکم! آقا؟''

''نہیں! اب تو جا سکتا ہے۔'' خیام نے احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔

عمر صندوقچے میں سے نایاب سکوں کو نکال نکال کر دیکھتا رہا۔ ان میں ایک ہازنطینی سکہ تھا جس پر ایک صلیب کے نیچے ایک شہنشاہ اور اس کے ملکہ کے چہرے بنے ہوئے تھے۔ عمر کو یونانی زبان کی تھوڑی سی شد بد تھی ان میں سے ایک تو جسٹینین کا چہرہ تھا۔ یہ سکہ اس کے جلوس کے چھٹے سال ڈھالا گیا تھا۔ عورت کا چہرہ وہ شناخت نہ کر سکا۔

اس عورت کا نام اس سکے پر کندہ نہ تھا۔ پھر وہ مٹی کی ایک مہر اٹھا کر دیکھنے لگا جس پر ایک اڑتی ہوئی چڑیا کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ وہ مہر اسے پامیرا کے کھنڈروں میں پڑی ملی تھی مشہور شہر پامیرا۔ جہاں ملکہ زنوبیا نے رومیوں کو شکست دی تھی۔ اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا..... ان نشانیوں سے انسانی عزائم کی کیسی کیسی داستانیں وابستہ تھیں۔

جسٹینین نے رومی سلطنت کے بہت بڑے بڑے حصے کو فتح کر لیا تھا لیکن ایشیا پر ایک بے نتیجہ یلغار کے دوران میں وہ مارا گیا۔ زنوبیا..... عمر کو یاد آیا کہ یہ ملکہ ایک وسیع مملکت کی حکمراں تھی لیکن آخر کار رومی افواج کے ہاتھوں تباہ ہوئی جو اس حسین و جمیل ملکہ کو اپنی فتح کے نشان کے طور پر گرفتار کر کے لے گئی تھیں۔

تمام نام آور قیصر مدتیں گزریں زمین کا پیوند ہو چکے۔ سکوں پر ابھرے ہوئے ان کے چہروں کو اس قدر انہماک سے دیکھنا عمر کو عجیب سا لگا۔ چند روز ہی کی بات تو ہے کہ نظام الملک نے اعلان کیا تھا کہ موجودہ قیصر قسطنطنیہ نے ملک شاہ کے لیے تحائف بھیجے ہیں..... زمانہ گردش کرتا رہا۔ انسانی تقدیریں بدلتی رہیں۔ حتیٰ کہ سارا مغرب اسلام کی پیش قدمی کی تاب نہ لا کر اس کے قدموں میں گر پڑا..... غزالی نے کہا تھا کہ وہ یعنی عمر آرام طلب ہو گیا ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ گذشتہ سات سال سے وہ تین آدمیوں کے برابر کام کرتا رہا تھا۔ اور اس پر بھی نظام الملک کی فرمائشیں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ پرانے سکوں کا یہ صندوقچہ۔ کاش احمد کے بجائے کوئی اور لایا ہوتا۔ احمد کا چہرہ جذبات سے قطعاً عاری تھا جسے دیکھ کر اسے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ نظام الملک اور خود اس کے دشمن کس طرح پوشیدہ طور پر اس کی نگرانی کراتے تھے۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک سے پیچھا چھڑا بھی لے تو دوسرا بدستور مسلط رہے گا۔ اور پھر وہ کسی بات کو چھپاتا بھی تو نہ تھا۔ نہ اس کا کوئی راز تھا..... چلو یہ بھی صحیح، مگر کاش وہ لوگ اسے گلاب کے اس مہکتے ہوئے رنگین باغ میں تو چند لمحے سکون سے گزارنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا کرتے!

ایک ملازم نے نمودار ہو کر زیر لب کچھ کہا۔

نہیں میں کوئی خط نہیں لکھوں گا۔ نہ کسی کا پیغام سنوں گا۔ رات کو کھانا بھی نہیں

کھاؤں گا۔ چلا جا یہاں سے اور اسحٰق دیکھ اگر کوئی بھی باغ میں داخل ہوا تو میں بری طرح پیش آؤں گا۔ لے پکڑ یہ صندوقچہ اور دور ہو یہاں سے۔

"لیکن....."

"لیکن کیا؟ اس چار دیواری میں گیدڑ بھی داخل ہوا تو تیری ٹانگیں توڑ ڈالوں گا۔"

دربان نے سکوں کا صندوقچہ لے لیا اور خاموش کھڑا بے چینی سے اپنے پیروں کو حرکت دیتا رہا۔ "لیکن آقا۔ یہ ایک....."

"یا اللہ!" عمر نے اتنے زور سے چیخ کر کہا کہ ملازم ڈر کر فوراً بھاگ گیا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ درختوں کے سائے شام کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور گزر گیا۔ حوض میں ٹھہرا ہوا پانی ہلکورے لینے لگا..... غزالی پہاڑی پگڈنڈیوں پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا شہر کی طرف جا رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یہ قابل احترام نوجوان صوفی جب اس طرح تنہا ہوتا تھا، تو اس کا دل ایک نامعلوم خوشی سے لبریز ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن عمر سوچ رہا تھا کہ بیشتر اوقات اس کے چاروں طرف لوگ جمع رہتے تھے مگر داخلی طور پر وہ اپنے آپ کو صوفی سے کہیں زیادہ تنہا محسوس کرتا تھا۔ غزالی تو بہر حال اپنے مریدوں اور شاگردوں کے سامنے اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کرتا رہتا تھا لیکن عمر کے دل کا حال سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس کسی کے سامنے نہ نکال سکتا تھا۔

بربط کے تاروں کی دھیمی دھیمی جھنجھناہٹ سے شام کے دھندلکے گونج اٹھے۔ ساتھ ہی ایک عورت کے گانے کی میٹھی میٹھی آواز کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوئی۔ وہ ایک بیانیہ گیت گا رہی تھی۔ میدان جنگ سے واپس آتے ہوئے سپاہی ریگستانی شاہراہ کے کنارے ایک کنوئیں پر ٹھہر گئے تھے۔ مال غنیمت سے لدے ہوئے اونٹ ان کے پیچھے قطار در قطار کھڑے تھے۔ جنگجو مردوں کے ہمراہ جو قیدی تھے وہ رہ رہ کر نالہ و فریاد کر رہے تھے..... یہ ایک عربی گیت تھا۔ عمر نے اندازہ لگایا کہ گانے والی کہیں قریب ہی بیٹھی ہے، دھیرے دھیرے بربط کے تاروں سے کھیل رہی ہے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" عمر نے سوالیہ انداز میں زور سے کہا۔

گہرے دھندلکے سے نکل کر عائشہ سامنے آ گئی۔ مست ہرنی کی طرح چلتی ہوئی۔ بے نقاب عمر کے پہلو میں دوزانو ہو کر وہ پھر ربط پر جھک گئی۔ "بنو صفا کا ایک گیت" اس نے بربط کے تاروں کو جھنجھناتے ہوئے کہا۔ "ابھی اور باقی ہے..... بہت طویل ہے یہ گیت! کیا میرے سرتاج سننا پسند کریں گے؟"

"میں یہ پوچھتا ہوں تم یہاں کیوں آئیں۔ عائشہ؟ میں نے حکم دیا تھا۔"

"لیکن آقا! جب آپ اسحاق کو حکم دے رہے تھے۔ میں پہلے ہی سے باغ میں موجود تھی۔"

"اچھا! بس اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔"

عائشہ نے بڑے ادب کے ساتھ بربط ایک طرف رکھ دیا اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ بالکل خاموش، اپنے ہونٹوں کو سختی سے بند کر کے۔ لیکن جسمانی طور پر اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ پہلے تو اس نے گردن کو جھٹکا دے کر اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے سیاہ گھنے بال جن میں سے مشک کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ پیچھے کی طرف ڈالنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کے بعد وہ سر اٹھا کر آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کو اس طرح غور سے دیکھنے لگی جیسے وہ ان کے متعلق بہت کچھ جانتی ہے۔ اور پھر ایک دم اس نے اپنے کھلی ہوئی متناسب کلائیوں میں سے نقرئی چوڑیاں ایک ایک کر کے اتارنی شروع کر دیں۔ اس اثناء میں کبھی کبھی عمر کو کنکھیوں سے بھی دیکھتی جاتی تھی۔

عمر اپنے خیالات کا سلسلہ قائم نہ رکھ سکا۔ اور عائشہ کی بھری بھری کلائیوں کو غور سے دیکھنے لگا جو اپنی گود ہی میں رکھی ہوئی چوڑیوں کو ایک دوسرے پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چوڑیوں کی ڈھیری اونچی ہوتی رہی۔ ایک چھناکے کے ساتھ ساری چوڑیاں فرش پر گر پڑیں۔ عائشہ نے ڈر کر اپنا سانس اس طرح روک لیا جیسے معصوم بچے خود اپنی شرارت پر تعجب سے سانس روک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔ جھک کر چوڑیاں سمیٹتے ہوئے عائشہ کا شانہ عمر کے پہلو سے مس ہو گیا۔ باریک ریشمی آستین کے نیچے گداز شانے کی حرارت کو عمر نے محسوس کیا..... اندھیرا خاصا گہرا ہو چکا تھا۔ گرد و

پیش کی کوئی چیز صاف دکھائی نہ دیتی تھی۔

عائشہ پھر اپنے مہکتے ہوئے مشکی بالوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیسے ہی اس نے بال سمیٹنے کے لیے بازو اوپر اٹھائے، اس کے بدن کی بھینی بھینی خوشبو عمر کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ بدستور خاموش تھی لیکن رفتہ رفتہ ماحول پر اس طرح چھا گئی تھی کہ عمر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی رات کا ایک جزو بن کر اس نے عمر کا رابطہ باہر کی ہر چیز سے منقطع کر دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے عمر خاصے اہم مسائل پر غور کر رہا تھا لیکن اب..... ایک شوخ و شنگ دوشیزہ کے جسم کی معمولی سے معمولی حرکت اس کی پوری توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

عمر نے بے ارادہ اپنا ہاتھ بڑھا کر عائشہ کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ اس کے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اپنے بازو نیچے کیے بغیر عائشہ نے مڑ کر عمر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ عمر جیسے ہی اس کا بوسہ لینے کو جھکا وہ ایک ہرنی کی طرح تڑپ کر نکل گئی۔

"عائشہ!" عمر نے دھیمی آواز میں پکارا۔

لیکن وہ خاموش لڑکی اس طرح بدل چکی تھی جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ اب وہ پہلی سی فرمانبردار کنیز نہ تھی جو اپنے آقا کی ناراضی سے خائف تھی۔ وہ اس حسین رات کا ایک شاہکار تھی۔ رات کی رانی، سرکش، غیر یقینی، ایک حسین چھلاوا..... ایک خوبصورت دھوکا۔ جب وہ اس کے تعاقب میں بھاگا تو وہ لپک کر چنار کے گھنے سیاہ درختوں میں گھس گئی جہاں ستاروں کی روشنی بھی اندھیروں ہی میں گھل جاتی تھی۔

اس تگ و دو میں ایک مرتبہ اتفاقاً اس کا شانہ عمر کے بازو سے چھو گیا۔ عمر نے اسے پکڑنا چاہا، لیکن وہ پھر اس کی گرفت میں آتے آتے بچ کر نکل گئی۔ ننگے پاؤں وہ ہر طرف کلیلیں کرتی پھرتی رہی۔ عمر برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور جتنا وہ اس کے تعاقب میں دوڑتا جا رہا تھا، اس کے خون کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

جب وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا تو رک کر اس کی آواز پر کان لگائے۔ اس کے کانوں میں اسے صرف اپنے ہی دل کے دھڑکنے کی صدا آ رہی تھی۔ وہ

خاموش کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ اسے اپنے قریب ہی چپکے چپکے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ اس کی طرف پھر جھپٹا مگر ایک درخت سے ٹکرا کر رک گیا۔ عائشہ نے ہنس کر پھر اس پر چوٹ کی۔ اس دفعہ وہ دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا اور عائشہ اٹھ کر بھاگنے ہی والی تھی کہ عمر نے آخر اسے پکڑ ہی لیا۔

ایک لمحے کے لیے وہ پھڑ پھڑائی۔ آخر وہ مرد تھا۔ تندرست، توانا۔ اس نے اپنے لب اس کے لبوں سے ملا دیئے اور دوسرے ہی لمحے وہ اس کے بازوؤں میں آسودہ ہوگئی۔ عمر اس کے دل کی تیز دھڑکنوں کو محسوس کر رہا تھا۔ اور صحرائی عرب دوشیزہ اپنے قبائلی انداز میں، مچل مچل کر، اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی.....!

عائشہ کو رات کے جادو نے ایک عجیب چیز بنا دیا تھا۔ وہ عمر کے بازوؤں میں کسمساتی اور پھڑ پھڑاتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اک دم تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکلی اور حوض کی طرف بھاگ گئی۔

جب عائشہ نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا باندھا تو تاروں کی مدھم روشنی میں اس کے سڈول جسم کے تمام اتار چڑھاؤ عمر کے نگاہوں کے سامنے تھے۔ گرم پانی میں داخل ہو کر اس نے عمر پر پانی اچھالنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی عائشہ نے حوض میں قدم رکھا، وہ حوض جو نہ معلوم کب سے ساکت اور جامد پڑا تھا یک بیک زندہ ہوگیا۔ جاگ اٹھا۔ وہ رات، پانی، دھوپ سے تپے ہوئے گلاب کی خوشبو..... وہاں کی ہر چیز عائشہ کی ذات کا ایک جزو بن گئی تھی.....!

''کتنا اچھا موسم ہے'' اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

حوض سے نکل کر عائشہ یکا یک چوکنی ہوگئی۔ اس نے ڈر کر ایک ہلکی سی چیخ ماری اور آواز پر کان لگا دیئے۔

''کچھ لوگ ادھر آ رہے ہیں۔'' ایک لمحے کے بعد اس نے زیر لب کہا..... عمر کچھ نہ سن سکا۔ ''ادھر، ادھر..... وہ دیکھو! وہ لوگ ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے ہیں۔''

ادھر دیکھتے ہوئے جس طرف عائشہ نے اشارہ کیا درختوں کے جھنڈ میں عمر نے مشعلوں کی روشنی دیکھی اور تلواروں کی چمک بھی۔ مشعل برداروں کے پیروں تلے

سوکھی ہوئی جھاڑیوں کے چٹخ کر ٹوٹنے کی آوازیں بھی اسے صاف سنائی دینے لگیں۔

''آپ کے پاس تو مدافعت کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے۔ خوف زدہ لڑکی نے چلا کر کہا۔ ''چلو بھاگ کر اندر چلیں اور محافظوں کو جگائیں۔''

عمر بہر حال مطمئن تھا کہ رات کے وقت اس پر حملہ کرنے کے لیے اس طرح کوئی نہیں آسکتا تھا۔ وہ وہیں کھڑا، آنے والوں کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ لوگ کھلی جگہ میں آگئے تو عمر نے اسحاق دربان کو پہچانا جس کے ہمراہ چار مسلح آدمی اور بھی تھے۔ عائشہ کی پریشانی بدستور قائم رہی اور وہ چہرے پر نقاب ڈال کر گلاب کی جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئی۔

اسحاق بڑھ کر حوض کے قریب آیا اور عمر کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا ایک نعرہ بلند کیا۔

''یا آقا! جب ہمیں درختوں میں چلنے پھرنے کی آوازیں آئیں تو ہم نے سمجھا کہ شاید چور گھس آئے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد پانی میں کوئی چیز پھینکنے کی آواز آئی تو میں پریشان ہوگیا اور میں نے ان لوگوں سے کہا کہ ہمیں چل کر صورت حال معلوم کرنی چاہیے۔ خدانخواستہ کسی نے ہمارے آقا کو.....!''

عمر کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہوگیا۔ ''تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے اس باغ میں بھی تنہائی نصیب نہیں ہوسکتی۔ سارا غلام ٹولا فوراً مہال کی مکھیوں کی طرح یورش کر کے مجھے گھیر لے گا؟''

عمر نے قریب کھڑے ہوئے شخص کے ہاتھ سے سروہی چھین لی اور اس کے کند کنارے سے خوف زدہ اسحاق کے شانے پر پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے۔ کندھے سے خون بہنے لگا۔ اسحاق زور زور سے کراہتا رہا اور اپنے قصور کی پاداش میں پٹتا رہا۔ وہ اپنے آقا کی خلوت میں دخل انداز ہوا تھا۔ وہ یقیناً سزا کا مستحق تھا۔ وہ ایک طرح سے مطمئن بھی تھا کہ چلو جو سزا ملنا تھی فوراً ہی مل گئی اور اس کے بعد آقا اس کی نازیبا حرکت کو معاف بھی کر دے گا ورنہ یقیناً وہ کھال کھچوا کر بھس بھروا دیتا۔ باقی آدمیوں نے بھی اپنی تلواریں میان میں کر لیں اور دل ہی دل میں دعا مانگتے رہے کہ خدا

کرے آقا اسحاق کو زدوکوب کرنے میں لگ کر انہیں بھول جائے۔ لیکن اس مار پیٹ کے باوجود اسحاق اور اس کے ہمراہی اس امر پر متفق تھے کہ بہر کیف انہوں نے تفتیش حال کے لیے وہاں جا کر صبح قدم اٹھایا تھا۔

عمر نے اسحاق مارنا بند کر دیا اور سر وہی پھینک دی اسے نہ معلوم کیا سوچ کر ہنسی آ گئی۔ ''چلو اب دفان ہو! بیوقوف کہیں کے..... لیکن یاد رکھو کہ اب سے یہ باغ حرم کا ایک حصہ ہے..... یہاں کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں۔''

''آقا کا حکم سر آنکھوں پر'' اسحاق نے سر جھکا کر اپنے ہونٹوں سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔

''لیکن آقا! باغبانوں کے لیے کیا حکم ہے؟..... حسین، علی اور احمد.....''

''ان سے کہہ دو کہ وہ اپنے اپنے حجرے میں بیٹھ کر مکھیاں ماریں۔ ان کے بغیر بھی باغ ہرا بھرا رہے گا۔''

ملازم چلے گئے تو عائشہ بھی گلاب کے کنج سے باہر نکل آئی۔ وہ ہنس رہی تھی.....

کئی ہفتے تک عمر نے نہ اپنی ڈاک دیکھی نہ کوئی خط پڑھا۔ اور خط وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا وہ درحقیقت دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ بجز عائشہ کے۔ وہ آزادی کے ساتھ بے پردہ پائیں باغ میں چل پھر سکتی تھی۔ اور ہر شام وہ تفریح کے لیے نئے نئے طریقے استعمال کرتی تھی۔

عائشہ عمر کی شریک حیات تو بن گئی لیکن اس کے خیالات کی شریک نہ بن سکی تھی اسی عجیب حقیقت نے ان دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ خیام اپنے خیالات و تصورات سے پیچھا چھڑانے کا متمنی تھا۔ اور عائشہ نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا۔ بعض باتوں میں وہ عمر سے زیادہ سمجھ داری کا مظاہرہ کرتی تھی..... اور جب خاموش رہتی تو ہزار عقلمندوں سے زیادہ عقلمند معلوم ہوتی تھی۔

قصر کوچک کے تمام لوگوں کو یہ بات بہت جلد معلوم ہو گئی کہ عرب دوشیزہ ان کے آقا کی توجہ کا واحد مرکز بن گئی ہے۔

عائشہ مطبخ میں جا کر اپنے ہاتھ سے خیام کے لیے کھانے تیار کرتی۔ زلیخا نے ایک مرتبہ احتجاج کیا تو عائشہ اس پر برس پڑی

''کیا تیرے لیے اتنا کافی نہیں ہے'' کہ ''تیرے سارے چھوکرے اور ذلیل بھائی بھتیجے اپنے دامنوں میں چھپا کر توشہ خانے سے گوشت اناج اور نہ جانے کیا کچھ لے جاتے ہیں؟ اور تیری لونڈیا کا وہ چیچک رو عاشق بھی۔ وہی چھوکری جو دن بھر سڑک پر دھما چوکڑی مچاتی رہتی ہے۔..... تو اپنے کام سے کام رکھ۔ جو تیری مرضی آئے کر۔ لیکن خبردار آقا کے کھانے پینے کے معاملات میں کبھی دخل نہ دینا۔''

اس کے بعد زلیخا زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی کہ صحرا نژاد خانہ بدوشوں کی آڑ لے کر عائشہ کی بدمزاجی کے متعلق بڑبڑاتی رہے۔

عمر کو عائشہ کی تنہا پسندی اور عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی ادا اچھی لگتی تھی۔ وہ صرف عمر کی موجودگی میں زندگی و شباب کا جیتا جاگتا مرقع بن جاتی تھی۔ ورنہ اسے دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ اس کے گردن کے اتار چڑھاؤ سے لے کر اس کے حسین جسم کے ایک ایک خط تک سے واقف ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں کیا تھا۔ عمر کو کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ جب کبھی وہ اس کے آغوش میں لیٹی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتی تو اکثر عمر کو یہ وہم ہونے لگتا کہ شاید وہ کوئی ایسی بات سننے کی کوشش کر رہی ہے جو اسے سنائی نہیں دیتی۔

بعض اوقات وہ چونکا دینے والی باتیں بھی کرتی تھی..... ایک دن اس نے سنجیدگی کے ساتھ عمر سے پوچھا: کیا میری نگرانی کے لیے کوئی خواجہ سرا مقرر کر دیا گیا ہے۔

''نہیں تو'' عمر نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب! لیکن ایک خواجہ سرا اس وقت بھی ڈیوڑھی میں بیٹھا ہوا ہے۔''

عائشہ کو خواجہ سرا کے تقرر پر تعجب بھی نہ ہوا تھا کیونکہ یہ بات شرفا کے رواج کے عین مطابق تھی۔ لیکن اسے اس بات سے کوفت ہوتی تھی کہ ہر وقت اس کے پیچھے ایک دم چھلا لگا رہے۔

عمر تحقیق کرنے کی غرض سے اٹھ کر ڈیوڑھی تک گیا اور اس نے دیکھا کہ واقعی ایک شخص دروازے پر بیٹھا ہے۔

''تو کون ہے؟''

''خدا غریب پرور کو سلامت رکھے۔ مجھے زنبل آغا کہتے ہیں۔ اسحاق نے مجھے آپ کی خدمت پر مامور کیا ہے۔''

پاٹ دار آواز اور بے رونق آنکھوں سے عمر نے سمجھ لیا کہ عائشہ نے بیک نظر جو اندازہ لگایا تھا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔

''میرے ساتھ آؤ'' اس نے کہا۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے اسحاق کو آواز دی جس کے سر پر ہنوز پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

''میں نے تجھ سے کب کہا تھا کہ خانم کی خواب گاہ کی دربانی کے لیے کسی خواجہ سرا کا انتظام کیا جائے؟''

اسحاق نے نہایت احترام سے عمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھتے ہوئے کہ میرے آقا کی توجہ آجکل کس طرف موکوز ہے۔ میں خود ہی ضرورت کی نزاکت کا احساس کر کے اس شخص کو یہاں لے آیا تھا۔''

''اچھا! تو پھر اب اس کو رخصت کر دو۔''

''بسر و چشم..... لیکن آقا پائیں باغ خاصا وسیع ہے اور مکان کے دروازے سے سارا منظر دکھائی نہیں دیتا۔''

''نہیں اسے بہر حال رخصت کر دو۔''

عمر کو غصہ آ رہا تھا کہ اس کے پائیں باغ میں زنبل آغا جیسی مخلوق پہرا دے رہی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ عائشہ نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں خواجہ سرا حرم کی نگہبانی نہیں کرتے تھے اور پھر وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ کوئی شخص ہر وقت عائشہ کی نقل و حرکت پر خواہ مخواہ نگاہ رکھے۔

اسحاق نے سبکی محسوس کی اور زنبل آغا کے سامنے اپنی بڑائی جتانے کے لیے اس نے موضوع گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔ ''تقریباً بیس دن ہوئے کہ اعلیٰ حضرت نظام الملک کا خط آیا رکھا ہے۔ میں نے آپ کو مطلع بھی کیا تھا کہ وہ بہت ضروری خط ہے۔ ایک ہرکارہ بہت جلدی میں وہ خط لایا تھا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ نظام الملک سلطنت کے اہم امور کے متعلق ہی آپ کے خط لکھنے کی تکلیف گوارا فرماتے ہیں..... حکم ہو تو ابھی حاضر خدمت کروں؟''

عمر واقعی اس خط کو بھول چکا تھا۔ جب اس نے کھول کر اسے پڑھنا شروع کیا تو دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتا جاتا تھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن رحیم۔'' ''یہ خط ملتے ہی ایک گھنٹے کے اندر ملک شاہ کو لکھ بھیجو کہ از روئے نجوم آپ کا اس وقت نیشا پور واپس آنا نامناسب ہے۔ میں قطعی طور پر یہ چاہتا ہوں کہ وہ سمرقند کے شمال میں جنگ جاری رکھے۔ مجھے اس کے پڑاؤ سے اطلاع پہنچی ہے کہ وہ خراسان واپس آنے کا ارادہ کر رہا ہے اور فوج کی آدھی جمعیت کو سرما ختم ہونے تک برخواست کرنے کے متعلق بھی سوچ رہا ہے۔''

عمر نے پھر ایک بار خط پڑھا اور پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا۔ اس قسم کا پیغام لکھ کر بھیجنا بے حد خطرناک تھا..... نظام الملک کو اس بات کا خود ہی اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ اور پھر عمر اس سے قبل نظام الملک کی فرمائش پر کتنی ہی غلط پیشین گوئیاں کر بھی چکا تھا مگر پھر بھی ملک شاہ مطلق العنان بادشاہ تھا۔ سلطان مسلسل پچھلے کئی سال سے جنگ کے میدانوں ہی میں زندگی گزار رہا تھا۔ اگر وہ سرما کا ایک موسم آرام سے گزارنے کا خواہش مند تھا تو اس کی مخالفت کیوں کی جائے؟

عمر غزالی سے دنیا کی بے ثباتی پر طویل بحثیں کر چکا تھا۔ عائشہ نے اسے نئی لذتوں سے آشنا کر دیا تھا چنانچہ اس کے سوچنے کا انداز بدل چکا تھا۔ اس نے اسحاق کو حکم دیا کہ کاغذ، قلم، دوات اور مہر لگانے کے لیے لاکھ حاضر کیے جائیں۔ اس نے نظام الملک کے خط کے جواب میں صرف ایک لفظ لکھا ''نہیں'' اور نیچے اپنے دستخط کر دیئے ..... ''خیام'' اور خط بند کر کے اپنی انگوٹھی سے اس پر مہر لگا دی۔ ''ایک تیز رفتار سوار کے ہاتھ اسے فوراً نظام الملک کے پاس نیشا پور روانہ کر دیا جائے۔''

"لیکن اس وقت تک" "وزیر رے پہنچ چکا ہوگا۔ وہ ایک مذہبی شورش دبانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔" زنبل آغا نے ادب سے کہا۔

رے، نیشاپور کے مغرب میں خاصی دور واقع تھا۔ اگر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کیا جائے تو کم از کم ہفتے کی مسافت پر تھا۔

"معلوم کرو کہ وہ کہاں ہے اور اس خط کو فوراً بھیج دو۔"

"سر آنکھوں پر" اسحاق نے خط کو اپنے کھردرے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" میں تجھے بتا دیتا ہوں کہ اس میں صرف ایک لفظ لکھا ہے یعنی "نہیں" اور اس کے نیچے میرا تخلص لکھا ہے "خیام" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "احمد کو نہ بھیجنا۔"

جب وہ رہائشی کمروں کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں ایک الاؤ کے پاس ٹھہر گیا۔ جہاں تینوں باغبان، احمد، علی اور حسین آگ روشن کیے تاپ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ سب ادب سے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

"خدا کرے آپ کا ہر دن، عید کے دن کی طرح خوش آئند ہو، آقا۔" حسین نے گردن جھکا کر کہا۔

نظام الملک کے خط کے پرزے ابھی عمر کے ہاتھ میں تھے۔ عمر نے وہ پرزے آگ میں ڈال دیئے اور ان کے جل کر راکھ ہونے تک وہیں کھڑا رہا۔ تینوں مالی جلتے ہوئے کاغذ کو دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ عمر چلا گیا تو وہ بیٹھ گئے۔ اب ان کے پاس گفتگو کا ایک نیا موضوع تھا۔

حسین نے کہا۔ یقیناً یہ کوئی اہم خط تھا۔ تم نے دیکھا کتنی خوبصورتی سے لکھا ہوا تھا۔

علی نے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ تم لوگوں نے مہر دیکھی کیسی خون کے کبوتر کی طرح سرخ تھی۔ ایسی مہریں نظام الملک کے فرامین پر لگی ہوتی ہیں۔ ایک ایک قطرہ پگھل کر آگ میں شعلہ بنا۔

وہ لوگ لاکھ کے سرخ قطروں کو غور سے دیکھتے رہے جو آخر راکھ میں جذب ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد اٹھا اور گھومتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں زنبل آغا اپنے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

عائشہ کے دن رات خوشگوار تھے۔ ایک روز جب عمر نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کوئی چیز تو منگوانا نہیں چاہتی تو اس نے تھوڑی دیر سوچ کر بتایا کہ اگر ممکن ہو تو اس کے لیے کچھ ریشمی کپڑا۔ تھوڑا سا روپہلی دھاگا کشیدہ کاری کے لیے منگوا دیا جائے اور مشک کی ایک بوتل، کچھ عنبر اور روغن خشخاش بھی۔ اور بس۔ ایک روز عمر نے جب اسے چمکتا ہوا سنہرا موباف لا کر دیا تو وہ مارے خوشی کے کھلکھلا کر خوب ہنسی۔ اور اس روز وہ گھنٹوں اس موباف سے اپنی چوٹی گوندھ کر ایک نقرئی آئینے میں مختلف زاویوں سے اپنی صورت دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ قالین پر عمر کے پہلو میں چاروں شانے چت لیٹ جاتی اور گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی بے خبر سو جاتی۔ قصر کے ایرانی ملازموں سے اسے عموماً کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ تقریباً سبھی خوش مزاج، کاہل اور نیک تھے۔

"کل" اس نے ایک دن عمر سے مزاحاً کہا۔ "وہ ہر بات آنے والے کل پر ٹال دیتے ہیں۔ گزرے ہوئے کل کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں اور آنے والے کل پر سارے کام اٹھا رکھتے ہیں۔"

"لیکن اس کے باوجود وہ خوش و خرم رہتے ہیں۔"

عائشہ نے ان کی زندگی کے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا واقعی ان کے جذبات عجیب تھے۔ ذرا سی دیر میں ہنسنے لگتے۔ ذرا سی دیر میں رونے لگتے۔

عمر نے کھلکھلا کر کہا..... اور عائشہ تیرا اپنے متعلق کیا خیال ہے؟ تو آج ہے۔ آج جو ہر وقت موجود رہتا ہے۔ "تیرا تعلق صرف آج سے ہے۔ جو ہر وقت موجود ہے۔"

"لیکن میں صرف آپ کی موجودگی میں آج ہوتی ہوں۔ آپ کے بغیر گزرا ہوا کل۔" اس نے عمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ایسے موقعوں پر عمر کو یاسمین یاد آ جاتی تھی۔ عائشہ کی آنکھیں اور گردن تیزی سے گھمانے کا انداز بالکل یاسمین

کی طرح تھا۔ عمر نے سوچا کہ وقت کی لاتعداد گردشیں بھی یاسمین کی یاد اس کے دل سے نہ بھلا سکیں۔ آخر ایسا کیوں تھا؟ وہ کس قدر جلد اس سے جدا ہو گئی تھی۔ اور اس کی موت کا غم۔ جس کا اظہار اس نے جعفرک کے سامنے بھی کبھی نہ کیا۔ آگ کے شعلوں کی طرح ہمیشہ اس کو جلاتا رہا۔ مدتیں گزر گئیں۔ اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ بیداری کی حالت میں اس خواب کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

عائشہ کے پہلو میں اسے وہ تسکین نہ مل سکی جو یاسمین کی آغوش میں فراوانی سے تھی۔ عائشہ کے ساتھ اس کی زندگی بڑی پرسکون تھی۔ اس کی محبت پردہ باغ کے ان گلاب کے پھولوں کی مانند تھی جو بادِ صبا کے لطیف جھونکوں کے لمس سے کھل جاتے ہیں اور زمان و مکان کی قید سے آزاد، نامحرموں کی نگاہوں سے پوشیدہ، اپنی نازک رنگین پتیاں زمین بکھیرتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں یاسمین کی یاد اس پرسکون باغ میں اور عائشہ کے پہلو میں بھی اس کو اپنے حصار میں لے لیتی۔

ایک روز عائشہ دھوپ میں بیٹھی حسب عادت اپنے سنہرے موباف سے کھیل رہی تھی۔ عمر نے دور سے اسے دیکھا تو چلا کر کہا ''میری نادان پری! دھوپ میں بیٹھ کر کیوں جان ہلکان کرتی ہے۔ تو سونا نہیں ہے کہ مرنے کے بعد جب تجھے زمین میں دفن کر دیا جائے گا تو لوگ دفینہ سمجھ کر پھر تجھے کھود کر نکال لیں گے۔''

عائشہ نے یہ سنا تو خوب ہنسی۔ پھر اس نے اپنے گندمی رنگ کے سڈول بازوؤں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیشک میں سونے کی بنی ہوئی تو نہیں ہوں۔'' عمر کے الفاظ کے معانی سے قطع نظر وہ بڑی دیر تک غور کرتی رہی۔ ''مردے'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بہر صورت مردے ہی ہوتے ہیں۔'' ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

''ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ وہ کبھی نہیں بدلتے۔'' اس نے اپنی بات کو پھر دہرایا۔

عمر نے سوچا ایک صحرا نژاد لڑکی نے بڑی سادگی سے ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے کہ مردوں کو پھر زندہ ہو کر اس زمین پر چلتے پھرتے کس نے دیکھا ہے۔ وہ خاک ہی سے اٹھے تھے اور خاک ہی میں دبا دیئے گئے.....

لیکن اس کے باوجود یاسمین کی یاد اس دل میں ہمیشہ سے زندہ ہے، ہمیشہ اسی طرح زندہ رہے گی۔ جب وہ کام کرتے کرتے تھک کر لیٹ جاتا تو اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ کاش وہ جب سر اٹھا کر دیکھے تو سامنے سے یاسمین بیت النجوم میں داخل ہوتی ہوئی نظر آجائے۔ اس کی نقاب ہوا سے اڑ رہی ہو۔ اور..... اور..... پھر وہ اس تصور کو ذہن سے جھٹک کر کچھ اور سوچنے لگتا۔

دو ہفتے کے بعد پسینے میں شرابور گھوڑے پر سوار ایک قاصد قصر کو چک کے دروازے میں تیزی سے داخل ہوا۔ وہ نظام الملک کا ایک حکم نامہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ وزیر اعظم نے عمر کو جلد از جلد رے پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

اگلے روز علی الصباح عمر نے عائشہ کو خدا حافظ کہا تو عائشہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ گھنٹوں پہلے سے عمر کے ساتھ جانے کے لیے ضد کر رہی تھی لیکن عمر کا اصرار تھا کہ نہ جانے صورت حال کیا ہو۔ تمہارا ابھی میرے ساتھ جانا مناسب نہیں۔ ''خدا حافظ'' عائشہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا..... ''آقا، اجنبیوں میں بغیر ہتھیار لیے کبھی نہ جانا۔''

اسحاق نے صدر دروازے پر آگے بڑھ کر رخصتی سلام کیا۔ عمر کو شبہ ہوا جیسے اس نے سفید عمامہ اور سرخ خلعت والے زنبل آغا کو باغ کے گوشے میں غائب ہوتے دیکھا ہے۔ اس نے فوراً اپنے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔

''اسحاق یہ کیا ہے؟ وہ سیاہ فام ہیجڑا ابھی تک قصر کے چکر کیوں لگا رہا ہے؟''

اسحاق نے ادب سے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ ''رات عشاء کے بعد میں نے سنا تھا کہ علی الصباح غریب پرور رے کے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کب واپسی ہو۔ کیا حرم کی نگہبانی سے میں غافل ہو جاتا؟''

''لیکن کیوں؟''

''آقا تمام عورتیں نگہبانی کی محتاج ہوتی ہیں۔ یقیناً کوئی شخص خواب میں بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی نوجوان عورت اتنے بڑے باغ میں تنہا گھومتی پھرے اور زنبل آغا کچھ زیادہ دور بھی نہ جانے پایا تھا۔ میں نے اسے بلا لیا۔''

عمر نے اپنی پشت پر کھڑے ہوئے مسلح دستے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم میں سے ایک شخص فوراً جا کر ہیجڑے کو تلاش کرے۔ اصطبل سے ایک گھوڑا لے اور اسے نیشا پور لے جا کر بازار میں دھکا دے آئے اور اس کا خیال رکھے کہ وہ کمینہ پھر اس دروازے میں قدم نہ رکھنے پائے۔''

وہ نہیں چاہتا تھا کہ عائشہ کو خود اس کے گھر میں کسی کی نگرانی میں دے۔ اور پھر یہ زنبل آغا اسے مشکوک محسوس ہوتا تھا۔ وہ تین دن مسلسل مغرب کی سمت سفر کرتا رہا۔ رات ہو جاتی تو سونے کے لیے بڑی شاہراہ کے کنارے کسی سرائے میں قیام کرتا اور پھر صبح سویرے روانہ ہو جاتا۔ وہ نیشا پور کے باہر ہی سے گزر گیا۔ مبادا لوگ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے سڑکوں پر جمع ہو جائیں اور خوامخواہ وقت ضائع ہو۔ اور یہ ایک قدرتی امر تھا کیونکہ ملک شاہ اپنا بیشتر وقت سرحدوں پر فوج کشی میں گزارتا تھا۔ رہا بوڑھا نظام الملک سو اسے کاغذات کے انبار صاف کرنے ہی سے کب فرصت ہوتی تھی۔ لے دے کر صرف سلطان کا منجم ہی رہ گیا تھا۔ جب کبھی وہ نیشا پور کے بازاروں سے گزرتا تھا۔ لوگ اسے اپنے سلطان کے اقتدار دولت و اقبال کا مظہر سمجھ کر دیکھنے کے لیے جوق در جوق سڑکوں پر جمع ہو جاتے تھے۔

تیسری رات آرام کرنے کے لیے جب عمر اور اس کے ہمراہی ایک جگہ ٹھہرے تو ایک اجنبی سوار نے آ کر عمر کو ادب سے سلام کیا۔ اس کی کلائی پر ایک خوبصورت باز بیٹھا ہوا تھا۔

''خواجہ! خدا آپ کا سفر خوش گوار کرے۔ ملاحظہ فرمایئے یہ کیا چیز ہے مجھے تو کسی قسم کا ٹونا ٹوٹکا معلوم ہوتا ہے۔'' اجنبی نے اپنی پیٹی میں ہاتھ ڈال کر چاندی کی ایک نلکی نکالی۔ زیادہ سے زیادہ زبان قلم کے برابر ہو گی۔ ''شام کے وقت میں نے اپنے باز کو کھلے میدان میں پہنچ کر ہوا میں اچھالا۔ میں چاہتا تھا کہ باز بگلے پر جھپٹے جو دریا کی سمت پرواز کر رہا تھا۔ لیکن جب باز ہوا میں بلند ہوا تو بجائے بگلے کا پیچھا کرنے کے اس نے مغرب کی طرف اڑتے ہوئے کبوتر کو جا دبوچا۔''

'ملاحظہ فرمایئے میں نے اسے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچایا..... یہ پیغام بر کبوتر

معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پنجے میں یہ نلکی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک کاغذ بھی رکھا ہوا ملا ہے۔ آپ اسے پڑھ سکتے ہیں!''

کاغذ کا پرزہ زیادہ سے زیادہ انگوٹھے کے نشاں کے برابر تھا اور اس پر صرف ایک سطر باریک قلم سے لکھی ہوئی تھی۔

''عمر خیام رے کی طرف سفر کر رہا ہے۔''

دستخط کی بجائے اس پر ایک ہندسہ درج تھا۔

''اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے'' عمر نے باز کے شکاری کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ کبوتر مغرب کی سمت پرواز کر رہا تھا، کیوں؟''

''بیشک جیسے کسی نے ڈوبتے ہوئے سورج پر تیر چھوڑا ہو۔ جب میں نے یہاں پہنچ کر خواجہ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو اپنے ہمراہیوں سے کہا۔ بیشک اللہ کی مرضی کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔''

عمر اپنی انگلیوں میں نازک نلکی کو گھما کر سوچنے لگا کہ یہ پیغام کس نے بھیجا ہو گا اور کس کے لیے بھیجا ہے۔ صرف کبوتر ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور کہاں جانے والا تھا۔ لیکن کبوتر تو بے زبان ہے۔ نلکی میں سے مشک کی بھینی بھینی مہک آ رہی تھی۔ صرف قصر کو چک کے لوگوں کو ہی اس کا علم تھا کہ وہ رے روانہ ہو رہا تھا اور وہ نیشا پور میں داخل ہی نہ ہوا تھا۔ بہت ممکن ہے نظام الملک کے کسی جاسوس نے اس کبوتر کے ذریعے یہ اطلاع روانہ کی ہو۔ پھر دستخط کی جگہ بھیجنے والے نے ایک ''عدد'' لکھ دیا تھا۔ یا تو وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس تحریر کو نام کے مدد سے پہچان لے یا پھر درج شدہ عدد اس بھیجنے والے کی نشاندہی کرتا ہو گا۔ عمر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ لیکن اس نے غیر ارادی طور پر نلکی میں کاغذ کا پرزہ واپس رکھ کر اسے اپنے بٹوے میں حفاظت سے رکھ لیا۔ اجنبی شخص کے باز کے ذریعے اس پیغام کا عمر تک پہنچنا اتفاق تھا۔ لیکن یہ اتفاق مستقبل میں کسی خوشگوار یا ناخوشگوار واقعہ کا شاخسانہ بن سکتا تھا۔

اٹھارواں باب:

رے کے کتب خانے کی عمارت

رے کے قدیم شہر میں نظام الملک اور عمر خیام قالین پر آمنے سامنے خاموش بیٹھے تھے۔ اتنے برسوں میں پہلی بار نظام الملک نے عمر خیام کو اپنی رائے کا مخالف پایا تھا۔ اور اس واقعے سے وہ کچھ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔

''لیکن آخر کیوں؟'' اس نے اپنے مطمع نظر کو زیادہ واضح کرتے ہوئے کہا۔

تم میری رائے سے اختلاف کر کے ترقی کے راستے میں روڑا اٹکانا چاہتے ہو؟''

نظام الملک متجسس نگاہوں سے خیام کو دیکھنے لگا۔ وہ روز افزوں سلجوقی مملکت کا دو پشتوں سے انتظام کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس وقت سلطنت کی حدیں اگر ایک طرف دیوار چین سے قسطنطنیہ کی اس فصیل تک پھیلی ہوئی تھیں جہاں ایک پتلی سی آبنائے یورپ کو ایشیا سے جدا کرتی ہے تو دوسری طرف شمال میں برفانی علاقے سے عرب کے صحراؤں تک وسیع تھیں۔ نظام الملک نے اپنی حیرت پر قابو پانے کے لیے بے خیالی سے مہر دار انگوٹھی کو اپنی انگلی میں گھماتے ہوئے کہا۔ ''سلطان ایک آفاق گیر خاندان کا سربراہ ہے۔ اس کا ہر عمل اس کے بلند مرتبے کے شایان ہونا چاہیے۔ اس کی جنگی مہارت اور قابلیت ہی کا صدقہ ہے کہ آج غیر مہذب اقوام اور غیر مسلم افراد اسلامی حکومت کے زیر اقتدار ہیں۔ اس کی فتوحات نے ملک میں اس کا وقار بلند کر دیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک شاہ بہر حال ایک جاں باز ترک کا پوتا ہے۔

اگر وہ اپنے چار لاکھ سواروں کے ہمراہ خراسان کے پرامن شہروں کی طرف واپس آ جاتا ہے تو عوام سوائے اس کے اور کیا محسوس کریں گے کہ ایک جنگجو بادشاہ نے اپنے لاؤ لشکر سمیت پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے سپاہی جو میدان جنگ کے عادی ہو چکے آئے دن قرب و جوار میں طرح طرح کے ہنگامے برپا کریں گے۔''

نظام الملک نے کہا۔ ''خواجہ عمر یہ فوج معجون مرکب ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو اس میں شمالی علاقوں کے ترک ہیں۔ غلام ہیں۔ وہ غلام جو ترکوں کی اولاد ہیں اور انہیں جنگ و جدل کی تربیت دی گئی ہے۔ ایک بڑی تعداد گرجستانیوں کی ہے۔ کچھ ترکمان اور باقی عرب قبائل ہیں۔ فوج میں خراسانیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایرانی اور بغداد کے عرب ان سے بھی کم تعداد میں ہیں۔ اس قسم کے سرکش لوگوں کو جن سے خانہ جنگی کا اندیشہ ہے خراسان میں پڑاؤ ڈالنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہرگز نہیں۔ جب مشرق میں جنگ ختم ہو جائے تو ہمیں چاہیے کہ مغرب کا رخ کر کے اللہ کے حکم سے، دو دولت مند ملک..... قسطنطنیہ اور مصر..... فتح کر لیں۔''

خیام چونک اٹھا۔ جہاد۔ ایک مذہبی جنگ۔ معتزلی خلیفہ کے ملک کی فتح۔ جو قیاصرہ کا آخری قلعہ ہے۔ کیا اس نے بچشم خود یروشلم کو اسی طرح فتح ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

عمر نے سوچا گویا ہر نئی جنگ کے قیمت اس دولت اور ان انسانی جانوں سے ادا کی جانی چاہیے جو ایک دوسری جنگ سے حاصل کی جائیں۔ ''فوج کی مدد سے'' عمر نے کہا۔ آپ نے ایک عظیم مملکت قائم کی ہے جس کی حفاظت کے لیے اس سے بھی بڑی فوج کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اس جدید فوج کو تنخواہ دینے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ نئی فتوحات کی جائیں۔ آخر یہ سلسلہ کہاں ختم ہو گا؟''

نظام الملک نے گھبرا کر عمر خیام کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک یہ سمجھ رہا تھا کہ نجوم کے مسائل، اور رامش و رنگ کے سوا عمر کچھ اور سوچتا ہی نہیں۔ جب تک عمر اور ملک شاہ ہم خیال ہیں اس کے۔ یعنی نظام الملک کے..... تمام منصوبے بغیر کسی دشواری کے عملی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ملک شاہ خراسان واپس آ کر اپنے جنگی گھوڑے کی پشت سے اترے گا، حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔

یہ آخری بات نظام الملک کو پسند نہ تھی۔ اسے اس بات کا کامل یقین تھا کہ جس طرح ملک شاہ کی فتوحات ازل سے مقدر ہیں اسی طرح انتظام مملکت بھی اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کی قسمت میں لکھ دیا ہے۔

''یہ خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا'' اس نے با آواز بلند کہا کہ ''ہمارے سلطان کو یہ فتوحات عطا کی جائیں اور یہ بھی کہ ان ممالک پر ہمارا حکم چلے۔''

عمر نے قالین کے نقش و نگار کو غور سے دیکھتے ہوئے نظام الملک کی گفتگو کو آگے بڑھایا۔ ''اور یہ بھی مقدر ہو چکا تھا کہ ستاروں کی چال کی آڑ لے کر میں سلطان سے جھوٹی پیشین گوئیاں کروں؟''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ستاروں سے انسان کی قسمت کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے؟''

''نہیں''

نظام الملک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں بھی اسے غلط سمجھتا ہوں۔ ''لہٰذا اگر ستاروں سے قسمت کا حال بتانا غلط ہے تو پھر تمہیں ملک شاہ کو یہ لکھنے میں کیا تامل ہے کہ اگر وہ جنگ جاری رکھے تو نجوم کے حساب سے فتح مندی اس کے قدم چومے گی؟'' اسے اچانک ایک اور جاتی یاد آ گئی جس کی وجہ سے وہ کئی دن تک ذہنی الجھن میں مبتلا رہا تھا۔ ''ایک شخص جو اپنے آپ کو حسن بن صباح کہتا ہے۔ قصر کو چک سے تمہارا خط ملنے سے چار دن پہلے میرے پاس اسی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ بھی مستقبل کا حال بتا سکتا ہے اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ شاہی منجم کی جانب سے چند روز میں مجھے ایک پیغام ملے گا جو صرف ایک لفظ ''نہیں'' پر مشتمل ہو گا۔ یہ حسن کون شخص ہے جو تمہارے راز جانتا ہے۔''

''یہ ایک نئے عقیدے کا مبلغ ہے۔ بیت المقدس میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔''

عمر نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''لیکن وہ پیغام روانہ کرنے سے پہلے میں نے تو اس کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے! تمہارا قاصد جو وہ پیغام لایا تھا قصر کو چک سے روانہ ہو کر آٹھ روز میں میرے پاس پہنچا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی آمد سے چار روز قبل حسن کو یہ بات معلوم ہو گئی۔

''کوئی سوار۔'' عمر نے سوچنے کے انداز میں کہا۔ ''حتیٰ کہ سلطان کا قاصد بھی جو ہر پڑاؤ پر گھوڑا تبدیل کرتا ہے یہ مسافت چار روز میں طے نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن تھا کہ رے میں کوئی شخص، یہاں پہنچنے سے پہلے اس پیغام کی سن گن بھی پا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہوا میں اڑ کر کوئی یہ خبر پہنچا دے۔ اسے اپنی جیب میں رکھی ہوئی چاندنی کی ٹکی یاد آ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کبوتر ہی کے ذریعے سے نظام الملک کے نام اس کے خط کا مفہوم قصر کو چک سے چار روز میں رے پہنچا دیا گیا تھا۔

تو پھر اس کے اپنے گھر والوں میں سے کوئی اس کی مخبری کرتا ہے۔ اور اس نے کبوتر کے ذریعے دو مرتبہ رے اطلاع بھیجی ہے۔ کیا وہ عائشہ ہو سکتی ہے یا پھر اسحاق دربان؟ لیکن دونوں یہ کہتے ہیں کہ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔

''ایک کبوتر یہ فاصلہ تین دن میں طے کر سکتا ہے۔'' اس نے بلند آواز سے کہا۔

''خدا ہی تمام تعریف کے لائق ہے'' نظام الملک نے عمر کی اس بات کا غلط مفہوم لیا اور جھک کر اس کے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم ضرور راہ راست پر آ جاؤ گے۔ فوراً سلطان کے نام ایک پیغام لکھو! ہم اسے نامہ بر کبوتر کے ذریعے سمرقند روانہ کریں گے۔''

''اس میں کوئی خطرے کی بات تو نہیں'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ مجھے یہ لکھنے کی اجازت دیں گے کہ نظام الملک کا یہ فیصلہ ہے کہ جنگ جاری رہے۔''

''معاذ اللہ! کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔''

''تو پھر نہ میں یہ لکھوں گا نہ وہ۔ نہ جھوٹ لکھوں گا نہ سچ۔ میں کچھ بھی نہیں لکھوں گا۔''

نظام الملک کی آنکھیں مارے غصے کے ابل پڑیں اور گھٹنے پر رکھے ہوئے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔ ''میرے روبرو یہ بات کہنے کی تمہیں کس طرح جرات ہوئی؟''

''مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا'' عمر نے سنجیدگی سے سر ہلا کر کہا۔ ''اور اب میں اپنے الفاظ واپس نہیں لوں گا۔''

نظام الملک پھٹ پڑا۔ ''تو ایک مفلوک الحال طالب علم تھا۔ میں نے تیری سر پرستی کر کے تجھے ایوان حکومت کے تیسرے رکن کے بلند درجے پر فائز کیا۔ رصدگاہ بنانے پر مولوی تجھے سنگ سار کرنے پر تلے ہوئے تھے میں نے تجھے پناہ دی۔ میں نے جید علماء کو تیرا علمی مددگار مقرر کیا۔ اس وقت تیرے تصرف میں کتنے محلات ہیں۔ جنس اور نقد کی صورت میں تیرے پاس کس قدر دولت ہے؟ لوگ کہتے ہیں تو ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے سامنے تو نے ملک شاہ سے کتنی دفعہ جھوٹ بولا ہے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو مجھے سچ سچ بتا کہ آخر میرے منصوبوں کو خاک میں ملانے پر تو کیوں تلا ہوا ہے؟''

''سچی بات؟ تو سچی بات سنئے ملک شاہ کو محاذ جنگ پر مصروف رکھنے میں آپ غلطی پر ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ آپ سے کوسوں دور فوج کے ایک کمان دار کی حیثیت سے برسر پیکار ہے اور آپ خود اس وسیع مملکت پر حکمرانی کرتے رہیں۔''

نظام الملک کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ اس نے رومال سے پسینہ پونچھا۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ ''کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ جتنی مدت میں نے اسلام کی خدمت کی ہے۔ بے لوث خدمت، محض وہی تمہاری عمر سے دوگنی ہے؟''

''یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں۔'' عمر یہ کہتے کہتے رک گیا کہ پچھتر سال کی عمر میں نظام الملک کو جو حیثیت حاصل ہے وہ پینتیس سال کی عمر میں کہاں حاصل تھی۔

''اچھا! اب میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔'' نظام الملک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں خزانچی کے نام دس ہزار طلائی دینار تمہیں ادا کرنے کا حکم لکھے دیتا ہوں۔ منظور ہے؟''

''قطعی نہیں۔ اگر آپ مجھے سلطان محمود کا طلائی تخت بھی دینا چاہیں تو مجھے منظور نہیں ہے۔''

''پندرہ ہزار طلائی دینار۔''

''نظام الملک! آپ نے بے شک میری سرپرستی کی ہے۔ لیکن میں نے کسی وقت بھی خود کو آپ کے ہاتھ فروخت نہیں کیا۔ اور نہ اب میں آپ کے ہاتھ فروخت ہونے کو تیار ہوں۔''

''تو پھر میں تجھے رخصت کرتا ہوں۔ جا! اقرونوس کے پاس چلا جا۔ کافروں کے گروہ میں شامل ہو جا۔ جا۔ عمر خیام، جہاں تیرا جی چاہے جا۔ لیکن سرپرستی کے لیے میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔ کیونکہ جو میرا نمک کھاتے ہیں وہ میری طرح اسلام کی خدمت کرتے ہیں۔''

نظام الملک نے اپنا منحنی بازو اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ عمر اٹھا اور پیٹھ موڑ کر چل دیا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو اس کے کانوں میں نظام الملک کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ نظام الملک نے عمر کو آواز نہیں دی تھی بلکہ وہ مصلے پر قبلہ رو بیٹھا، بلند آواز سے درود و استغفار پڑھ رہا تھا۔

''خدا تجھے سلامت رکھے۔'' عمر نے دل ہی دل میں کہا۔

کتب خانے کی عمارت کے بالمقابل ایک زیر تعمیر مسجد کا بلند چبوترہ تھا جس میں لگے ہوئے نیلے رنگ کے ٹائل دور سے چمک رہے تھے۔ اس قسم کی بے شمار مسجدیں اور خانقاہیں ریگستانی سرزمین کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ مسافر خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ عظیم الشان منڈیاں ان کے علاوہ تھیں۔ یہ سب مل کر اسلامی حکومت کی عظمت اور شوکت کی شہادت دے رہے تھے۔ اور ان سب کو بوڑھے نظام الملک نے تعمیر کرایا تھا۔ اسلام کا بول بالا تھا۔ آدھی سے زیادہ جانی پہچانی دنیا میں لوگ بالکل اسی طریقے سے اور اسی زبان میں عبادت کرتے تھے جس طریقے سے اور جس زبان میں نظام الملک عبادت کرتا تھا۔ اب عمر نے محسوس کیا کہ اس پر ایک اور دروازہ بند ہو گیا ہے جو پھر کبھی نہ کھل سکے گا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر چوک طے کر رہا تھا۔ یکایک اس کے قریب ایک شخص چیخا۔ پلک جھپکتے ایک کثیر انبوہ جمع ہو گیا اور دھوپ میں تلواروں کی چمک نے چکا چوند پیدا کر دی۔ ''ملحد! لامذہب! مارو..... قتل کر دو۔'' ایک

ساتھ بہت سی آوازیں گونجیں۔

عمر نے ایک شخص کو دیکھا جو سفید عبا پہنے تھا اور اس کی کمر میں ایک سرخ پٹکا سپاہیوں کے انداز میں بندھا ہوا تھا۔ اس کی گردن سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اور وہ ایک ایسے جانور کی طرف گہرے گہرے سانس لے رہا تھا جو جال میں پھنس کر نکل نہ سکتا ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور اس کے نتھنوں میں انگلیاں ڈال کر ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی گردن اوپر کو اٹھا دی۔ پاس ہی کھڑے ہوئے ایک دوسرے شخص نے اپنی تلوار کی ایک ہی ضرب سے اس کا سر تن سے جدا کر کے تلوار کی نوک پر علم کر دیا۔ تاکہ ہر شخص اسے دیکھ سکے۔

ایک اور سفید پوش نے تیزی سے دوڑ کر چوک کے اس پار جانے کی کوشش کی۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرنے ہی والا تھا کہ چاروں طرف سے اس پر تلواروں، نیزوں اور برچھیوں کی بارش ہوگئی۔ اس کا سفید لباس آناً فاناً سرخ ہو گیا۔

''ملحدوں کے لیے موت ہے'' ایک باریش ملا نے اپنے بازو ہوا میں بلند کر کے اس مجمع کے غیض وغضب کی آگ کو اور بھڑکانے کی کوشش کی جو حیرت انگیز طور پر جمع ہو کر اس قتل وخون میں شریک ہو گیا تھا۔ ملا کی آواز سن کر وہاں کھڑے ہوئے ایک لڑکے نے جس کی عمر بمشکل دس سال ہوگی رونا شروع کر دیا۔ جیسے ہی ملا کی نظر لڑکے پر پڑی اس نے پھر یا آواز بلند مجمع کی مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''برادران اسلام۔ ذرا سبعیہ کے اس چھوکرے کو بھی لینا۔''

لڑکا خوف کے مارے روتا چلاتا ہوا بھاگا۔ عمر کو دیکھتے ہی وہ اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کی عبا کا دامن پکڑ لیا۔ ''اے خواجہ! اے شہزادے! مجھے ان کے ظلم سے بچاؤ۔''

ایک نوجوان نے، جس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا، بڑھ کر سسکیاں بھرتے ہوئے لڑکے کی گردن پکڑ لی لیکن عمر نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہنگامہ ہے۔ کیا تم لوگ رے میں بچوں کا شکار کرتے ہو؟ الگ کھڑے رہو۔''

اتنے میں ملا غصے میں لال پیلا ہو کر عمر کے قریب آ گیا۔

''خواجہ عمر بن ابراہیم'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''ان سبعی کافروں کے قتل سے نظام الملک کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انصاف کی تلوار اس الحاد کا خاتمہ کرنے کو کافی ہے۔''

ملا کی اس گفتگو سے حملہ آور نوجوان کو اور بھی شہ مل گئی اور اس نے بڑھ کر اپنے نیچے سے کافر بچے پر بھرپور وار کر دیا۔ یہ چپقلش جاری ہی تھی کہ دو مضبوط ہاتھوں نے پیچھے سے عمر کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے کر گھسیٹتے ہوئے کان میں کہا۔ ''میرے ساتھ چلے آؤ ورنہ خود تجھے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ جلدی چلو۔'' یہ اقرونوس کی آواز تھی۔

چیختے چلاتے ہوئے لڑکے پر اس وقت تک ان گنت وار ہو چکے تھے۔ اور اس کی چیخوں کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

اقرونوس نے اپنا بازو عمر کے بازو میں ڈال لیا اور آگے بڑھتا رہا۔ ''مجھ سے باتیں کرو..... جیسے ہم اصفہانی کھجوروں کی قیمت پر جھگڑ رہے ہیں..... نہیں۔ نہیں۔ نظام الملک کی عدالت میں اس مقدمے کو لے جانے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا..... ذرا آہستہ چلو۔''

چلتے چلتے عمر نے مڑ کر چوک میں برپا ہنگامہ کو ایک مرتبہ پھر دیکھا۔ اس بھگدڑ میں بھی اس کی نظر ایک موٹے تازے سوار پر پڑ گئی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود عمر نے پہچان لیا کہ یہ نیلے عمامے والا گھڑ سوار سوائے توتوش کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ توتوش۔ نظام الملک کے جاسوسوں کا سربراہ۔

سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا تھا۔ عمر نے جب نظر اٹھا کر دیکھا تو اپنے آپ کو ایک سایہ دار گلی میں کھڑے پایا۔ جہاں ایک کھلی ہوئی دکان میں ایک کوزہ گر نے گیلی مٹی چاک پر چڑھا رکھی تھی اور چاک کو اپنے پاؤں کی جنبش دے کر تیزی سے گھما رہا تھا۔ ہمیشہ سے نہ جانے کب سے کوزہ گر اس طرح گیلی مٹی کو چاک پر گھما کر اپنی انگلیوں کے لمس سے کوزے بناتے چلے آئے ہیں۔ یہی ان کی زندگی ہے اور زندگی کا مقصد بھی۔ لیکن گرد وغبار کے اس دھندلکے میں عمر چمکتے ہوئے فولاد کو انسان کے خاکی جسم میں پیوست ہوتے دیکھ رہا تھا جس سے خون نکل کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

"ذرا سکون کے ساتھ" اقرونوس نے عمر کے کان میں کہا۔ "میرے ساتھ آہستہ آہستہ چلو۔ خفیہ پولیس کا سربراہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے..... گیارہ میں سے آٹھ قنطارے ہم نے فروخت کر دیئے۔ باقی تین خراب ہو گئے تھے۔ فروخت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔"

ایک گھوڑا اپنے تلے قدم رکھتا ہوا ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی لگام کی جھنکار سنائی دے جاتی تھی۔ لوگ دکانیں چھوڑ چھوڑ کر چوک کی سمت بھاگ رہے تھے۔

"ناپاک کتا۔" عمر نے بلند آواز میں کہا۔

اقرونوس نے بڑی ملائمت سے کہا۔ "وہ کتا نظام الملک کا پالتو ہے کیا نظام الملک سے تمہارے تعلقات ہنوز خوش گوار ہیں۔"

"اگر ہم میں جھگڑا بھی ہو گیا ہے تو کیا ہوا؟ میں وزیر کا دشمن نہیں ہوں اور اس سے ڈرنے کی بھی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے مجمع سے ڈر لگتا ہے۔ تم نے کبھی ایسا مجمع دیکھا ہے جس کی قیادت ملا کر رہے ہوں۔ جہاں سے خون کی بو آتی ہو؟ ذرا اون سے بنی ہوئی ان خرجیوں کو دیکھنا۔ ایسے ہی تھیلوں کی تو ہمیں تلاش تھی۔" لٹکی ہوئی بے شمار زینوں کے نیچے سے جھک کر اندر داخل ہوتے ہوئے اقرونوس عمر کو اون فروش کی دکان کے اندر لے آیا جو اس افراتفری کو آڑ سے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔

"ہفت" اقرونوس نے ایک تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں سات کی تلاش ہے۔"

دکاندار خاموشی سے اٹھا اور انہیں دکان کے پچھلے حصے میں لے گیا اور تیزی سے ایک پردہ سرکا دیا اس کے پیچھے ایک دروازہ چھپا تھا۔ "سات چیزوں کے مالک" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ حضرات شراب سے شوق کیجئے اور تازہ دم ہو جایئے! مہمانوں کو وہاں بٹھا کر اس نے پھر پردہ درست کیا اور باہر نکل آیا۔

"میری کمر کا پٹکا مضبوطی سے پکڑ لو۔" اقرونوس نے آہستہ سے کہا۔ "اس کے بعد ایک زینہ نیچے اترنا ہے۔ اس میں بیس سیڑھیاں ہیں۔"

اقرونوس نے اندھیرے میں نیچے اترنا شروع کیا۔ چند لمحوں کے بعد سیڑھیوں کے ایک موڑ پر روشنی کی جھلک نمودار ہوئی۔ ایک طاق میں شمع روشن تھی۔ اقرونوس نے اس انداز سے وہ شمع اٹھا لی جیسے وہ اس سے پہلے کئی دفعہ اس راستے سے گزر چکا ہو۔ سامان سے اٹے ہوئے اس تہہ خانے میں عمر کی رہنمائی کرتا ہوا اقرونوس اون کی ایک بہت بڑی گانٹھ کے قریب جا کر رک گیا جو ایک دیوار کے سہارے رکھی تھی۔ "اسے کھسکانے میں میری مدد کرو۔ بس۔ ذرا ادھر کو۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس پولیس کے سربراہ کے برابر طاقتور نہیں ہے۔ سنتے ہو۔"

عمر الجھ گیا "لیکن تم چوہے کے بل میں کیوں گھسے چلے جا رہے ہو؟ تم میری حفاظت میں ہو۔"

اقرونوس نے بے چینی کے ساتھ تہہ خانے کے دوسرے سرے پر زینے کو تجسس کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور اس وزنی گانٹھ کے پیچھے گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ "خواجہ عمر! شاید میں تمہارے مکان کے اندر بھی زیادہ محفوظ نہ رہ سکوں گا۔ کیا وہ لڑکا تمہاری حفاظت میں نہ تھا؟ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے کہ میں ایک مذہبی بلوے سے فرار ہو کر آیا ہوں۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تو توش میرا سراغ لگانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا تاکہ مجھ پر کوئی نہ کوئی الزام لگا کر مجھے موت کے گھاٹ اتار دے۔ اس کے بعد وہ اور اس کے حواری میرے گودام میں پہنچ کر اسے لوٹ لیں گے..... صرف میرا ہی نہیں تمہارا بھی یہی حشر ہو گا۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اچھا اب یہ رسی کھینچ کر اون کی اس گانٹھ کو پھر دیوار سے ملا دو۔"

اب وہ دونوں ایک تنگ راستے پر کھڑے تھے جس کا دہانہ اون کی گانٹھ سے چھپا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اقرونوس نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی اور اس کے بعد عمر کو ساتھ لے کر وہ تنگ راستہ طے کرنے لگا جو بلند ہوتا ہوا ایک بند دروازے پر ختم ہو گیا۔ شمع دروازے کے قریب پڑی میز پر رکھتے ہوئے اقرونوس نے وہ دروازہ آسانی سے کھول لیا۔ عمر ایک ٹھنڈے کمرے میں داخل ہوا جس میں شراب کی بو، بسی ہوئی تھی۔ دیواروں کے سہارے شراب کے بے شمار چھوٹے بڑے پیپے چنے ہوئے تھے۔ ایک کھلی

جگہ میں چھ افراد ایک لالٹین بیچ میں رکھے قالین پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اقرونوس پر تو انہوں نے محض ایک سرسری نظر ڈالی لیکن اس وقت عمر خیام ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ارمنی تاجر نے بڑے تپاک سے جھک کر سلام کیا اور ادب سے پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک شخص نے جو بظاہر کسی علمی ادارے کا معلم معلوم ہوتا تھا آگے بڑھ کر عمر کا خیر مقدم کیا۔

''خوش آمدید! اے فلکیات کے استاد! آیئے! مردود انسانوں کی اس مجلس کو عزت بخشیے!''

''آج کے دن ہم میں سے ہر شخص کے سر کی ایک قیمت مقرر ہے۔'' ایک دوسرے شخص نے معلم کے آخری فقرے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

عمر نے تجسس آمیز نگاہوں سے ان کا جائزہ لیا۔ ایک خالص مصری لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایک نے ڈھیلی ڈھالی عبا پہن رکھی تھی اور درویشوں کی طرح عصا اور کشکول لیے ہوئے تھا۔ باقی دوسرے مال دار تاجر معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ایک اعتبار سے وہ یکساں نظر آتے تھے..... ان سب کی آنکھوں میں ذہانت اور طباعی کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ اور ان کے بشروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کے سب باعمل انسان ہیں۔

''خواجہ، آپ اجازت دیں تو میں اپنے باکمال ساتھیوں کا آپ سے تعارف کراؤں جن کے سروں پر آج کل ننگی تلواروں کا سایہ ہے۔ میں خود ایک معلم ہوں۔ وہ سامنے دھاری دار عبا پہنے ہوئے جو صاحب بیٹھے ہیں ایک سیاح ہیں۔ ساری دنیا کا سفر کر چکے ہیں۔ جب قصے سنانے آتے ہیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ اس درویش کو تو آپ دیکھتے ہی ہیں۔ اور وہ فربہ انداز شخص۔ تخم کنجد اور دوسری بدنام مگر مزے دار جڑی بوٹیوں کا تاجر ہے..... اور باقی دو حضرات اصفہان کے خوش وقتوں میں سے ہیں۔ بساط پر پانسے کے معاملے میں کبھی ان کا اعتبار نہ کیجئے گا۔ حضرات، اب میں گذارش کرتا ہوں چونکہ اس وقت ہماری تعداد سات ہو چکی ہے اس لیے ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔ زہے نصیب! اگر استاد فلکیات بھی ہمیں اپنی ہم سفری کا اعزاز عطا

فرمائیں۔''

''آپ نے اپنی مہمان نوازی سے جو میری عزت افزائی کی ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عمر نے سبعیتہ کے متعلق سنا تھا کہ وہ خراسان میں ایک نئے عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے متعلق طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ سبعیتہ وہ سر پھرے ہیں جو کسی ساتویں ہادی کی آمد کے منتظر ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ ملحد ہیں اور ایک نئے مذہب کا پرچار کرتے ہیں۔ سبعیتہ کے متعلق ایک یہ بات بھی مشہور تھی کہ وہ جادوگروں کا ایک طبقہ ہے جو کسی رحمانی یا شیطانی قوت کے حامل ہیں۔ عمر کو بہر حال یہ سوچ کر بڑا تعجب ہوا کہ آخر یہ کس قسم کے لوگ ہیں کہ قریب ہی چوک میں ان کے ہم عقیدہ لوگوں کا خون بہایا جا رہا ہے اور یہ آرام سے یہاں بیٹھے گپ شپ کر رہے ہیں۔ پھر اس نے خود ہی سوچا کہ اس طرح غم میں آنسو بہانے اور کپڑے پھاڑنے سے آخر حاصل بھی کیا ہو سکتا ہے۔

''کیا حسن بن صباح کا تعلق بھی آپ ہی کے گروہ سے ہے؟'' عمر نے سوال کیا۔ ''مجھے اس کی تلاش ہے۔''

سبھی حیرت سے عمر کو دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ معلم بھی چپ چاپ اسے تکنے لگا۔ آخر اقرونوس نے اس مہر خاموش کو توڑا۔

''حسن کو خود اپنے سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ خواجہ عمر۔ مہینوں سے وہ آپ کی شریف آوری کا انتظار کر رہے ہیں۔''

چھوں آدمیوں نے سکون کا سانس لیا۔ پروفیسر کی گویائی بھی واپس آ گئی۔

''حسن اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ چند روز پہلے وہ نظام الملک سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ لیکن آج کل وہ پہاڑیوں میں ہیں۔''

حسن سے عمر کی پہلی ملاقات بابل کے کھنڈروں میں ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے کہا تھا کہ وہ پہاڑوں کی بلندیوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ حسن اس کو ہستانی ملاقے ہی میں تو پیدا ہوا تھا جس کا سلسلہ رے کے اس پار پھیلا ہوا ہے۔ اور لوگ سبعیتہ

کے رہنما کو ''شیخ الجبل'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

عمر اس لیے اور بھی حسن سے ملنے کا خواہش مند تھا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ آخر قصر کوچک سے نامہ بر کبوتر کے ذریعے ایک بے نام پیغام کس نے بھیجا تھا۔ رے میں وہ زیادہ عرصے رہنا بھی نہ چاہتا تھا۔ جہاں وہ ہر وقت توتوش کی نظروں کا مرکز بنا رہے گا۔ یا ممکن ہے نظام الملک اسے پھر بلا بھیجے۔

عمر کی طرف گردن جھکاتے ہوئے اقرونوس نے آہستہ سے کہا۔ ''حسن آپ کی آمد کا متوقع ہے اور اس کے ساتھ ایک ایسا وجود بھی ہے جس کا حسن کبھی آپ کے لیے جنت نگاہ رہ چکا ہے۔''

ایسے بہت سے حسین ہیں۔ عمر نے سوچا، جن کی کشش نے چندے مجھے اپنی طرف متوجہ رکھا..... اور پھر اسے فوراً عائشہ یاد آ گئی۔

''اچھا۔ یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ بتایئے کہ آیا آپ مجھے حسن کے پاس لے چلیں گے؟''

اقرونوس نے پروفیسر کی طرف دیکھا جو خاموشی سے یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔

''ہمارا اسی طرف جانے کا ارادہ ہے'' اس شخص نے عمر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا اور اس کے لہجے کی ساری شگفتگی کافور ہو گئی۔ ''لیکن یہ مسافت آسان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ شاہی منجم خواجہ عمر نیشاپوری کے لیے بھی۔ آپ غور فرمالیجیے۔ ہم ''رفیق'' ہیں۔ ایک نئے مذہب کے پیرو۔ یہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ یہ جانتے ہوئے اور ہمیں یہاں موجود پاتے ہوئے۔ آپ ابھی یہاں سے سڑک پر پہنچ کر نظام الملک کے کسی جاسوس یا پھر کسی ملا کو یہ اطلاع پہنچا دیں کہ ابن خوشاق کے گودام میں سبعیتہ کے چند لیڈر چھپے بیٹھے ہیں تو یقیناً ہمارے شانے ہمارے سروں کے بار سے بہت جلد ہلکے ہو جائیں گے۔''

''ہاں ایسا ممکن ہے۔'' عمر نے اس بات اسے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ آپ متعصب اور شر پسند نہیں ہیں۔ اور پھر ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ آپ جب کوئی وعدہ کر لیتے ہیں تو اس پر قائم رہتے ہیں۔ لہٰذا ہم آپ سے ایک حتمی وعدہ لینا چاہتے ہیں کہ نہ تو آپ کسی کو یہ بتائیں گے کہ آپ نے یہاں کیا

دیکھا ہے اور نہ کسی پر یہ ظاہر کریں گے جو کچھ حسن تک پہنچنے کے دوران میں آپ دیکھیں گے۔''

عمر نے ایک لمحہ سوچا۔ ''پھر'' اس نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''بہت خوب'' درویش نے گردن ہلائی۔ ''اب آپ بھی سن لیجیے۔ ہم لوگ قرآن کی قسم نہیں کھاتے۔ ہم سب رفیق بے حد حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے دنیا کے اس کارخانے میں خدا کی تلاش کم کر دی ہے۔ ہم سارے رفیق بھی وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو کسی قسم کا دھوکا نہیں دیں گے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اپنے وعدے سے پھرا ہو۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''یہاں تک کہ بعض کو زندہ جلا دیا گیا مگر اصل راز ان کی زبان تک کبھی نہ آ سکا۔''

عمر کو بڑا تعجب ہوا جب اس نے کم سخن ارمنی قرونوس کو بلوری ساغروں میں مقطر شراب بھر کر ساتوں حاضرین کو پیش کرتے ہوئے دیکھا۔

''آیئے! تھوڑی دیر کے لیے ذرا پولیس سے مذاق رہے۔'' پروفیسر نے ذرا وضاحت سے کہا۔ ''ہم لوگ بلا نوشوں کا ایک حلقہ بنا لیتے ہیں۔ اور چھپ کر ممنوعہ شراب اس قدر پیتے ہیں کہ بدمست ہو جائیں۔ پولیس تو صرف چھوٹے چھوٹے جرائم اور ذرا سی رشوتوں پر اپنا سارا زور صرف کرتی ہے۔ اچھا۔ اب اپنا اپنا ساغر لبوں سے لگایئے۔ کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم یہاں سے کہاں جا رہے ہیں۔'' ''یا.....'' اس نے عمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں جا رہے ہیں۔''

ایک ایک کر کے سب گودام سے رخصت ہو گئے یہ طے ہو گیا تھا کہ دو دن کی مسافت کے بعد پہاڑوں میں فلاں مقام پر سب لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ اقرونوس اور عمر کو ساتھ لے جانا تھا۔ اقرونوس اس بات پر مصر تھا کہ عمر کو اپنی ہیئت ضرور تبدیل کر لینی چاہیے کیونکہ سلطان کا منجم بغیر کسی کی نظر پڑے رے سے باہر نہیں جا سکتا۔

ایک شراب خانے کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں عمر کو تقریباً دو گھنٹے تک ایک مسکراتی ہوئی عورت کی مشاطگی کا تختہ مشق بننا پڑا۔ جس نے پہلے اس کی داڑھی

کو ایک خاص انداز سے آراستہ کر کے مہندی کے ذریعے اس کا رنگ تبدیل کیا۔ پھر چہرے اور گردن پر اخروٹ کے تیل کی مالش کر کے جلد کو اتنا سیاہ کر دیا کہ داڑھی کی سیاہی اس کے سامنے ہلکی نظر آنے لگی۔

''سلمیٰ'' ارمنی تاجر نے سنجیدگی سے عمر کو بتایا۔ ''ان تمام لوگوں کے چہروں کی وضع قطع سے واقف ہے جو ان راستوں پر سفر کرتے ہیں۔ وہ ایک ہندو فقیر کا حلیہ تبدیل کر کے اسے ایک افریقی مرابط بنا سکتی ہے۔''

سلمیٰ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور بڑی شوخی سے اس نے بتایا کہ اس سے پہلے اتنے خوبصورت قسم کے آقا سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اس کا شوہر بھی اخلاقاً مسکرایا۔

جب شراب فروش کی بیوی اپنا فرض انجام دے چکی تو عمر نے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ وہ ملائم ریشم کا دبیز خلعت پہنے تھا۔ ٹانگوں میں دانے دار چمڑے کی برجس تھی۔ پیروں میں سواری کے جوتے جن کی نوکیں انگوٹھوں پر سے اوپر کو مڑی ہوئی تھیں۔ اس کے پٹکے میں چاندی کی چمکیلی تختیاں آویزاں تھیں۔ اور اس کے نئے عمامے میں آرائش کے لیے چوڑیاں لپٹی تھیں۔ اقرونوس نے عمر کو ہر طرف گھما کر تنقیدی نظر سے دیکھا اور ایک یا دو بازو بندوں کے اضافے کا مشورہ بھی دیا۔ جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ بہروپ مکمل ہے تو اقرونوس نے عمر کو بتایا کہ وہ بخارا کا اسپ فروش ہے اور کوہستانی علاقوں سے ٹٹو خریدنے جا رہا ہے۔ ''تو پھر اسے ترکی زبان میں قسم کھانی ہو گی'' سلمیٰ نے مشورہ دیا۔ ''اور اکثر اوقات تھوکنا بھی ہوتا۔ دونوں ہاتھوں سے کھانا ہو گا۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ناک صاف کرنا ہو گی..... میں آقا سے اپنی ان گذارشات کے لیے معذرت خواہ ہوں..... گھٹنوں میں خم ڈال کر چلنا چاہیے۔ ذرا گھسٹنے کے انداز میں۔ جس سے یہ اندازہ ہو کہ عمر کا بیشتر حصہ گھوڑے کی زین پر گزرا ہے۔ عام لوگوں کے سامنے گھوڑی کا دودھ بھی کبھی کبھی پینا ہو گا..... اور اس کے بعد آقا کی اپنی حرم بھی اگر پہچان لے تو میرا ذمہ.....''

انیسواں باب:

عقاب کا آشیانہ

عمر کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جانی پہچانی دنیا سے دور کسی انجانے مقام کی طرف محو سفر ہے۔ اور پھر اس وقت طلسماتی دنیا کا احساس شدید تر ہو گیا جب سفر کے تیسرے دن شام کو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔

''میں معافی کا خواستگار ہوں۔'' اقرونوس نے پٹی باندھتے ہوئے زیر لب کہا۔ ''کسی غیر شخص کے لیے اس راستے کی صحیح سمت کا علم، ممنوع ہے۔''

آنکھوں میں پٹی باندھے جانے سے پہلے عمر نے دیکھا تھا کہ وہ قزوین کی بالائی سمت کے پہاڑی سلسلے میں ہیں۔ وہ اس وقت خچروں پر سوار تھے۔ گھاٹی میں بے شمار پتھر بکھرے ہوئے تھے اور گھاٹی کی بلندیوں پر گھنا جنگل تھا۔

''تو کیا تو بھی سبعی ہے؟''

''ہاں میں بھی شیخ الجبل کا ادنیٰ غلام ہوں۔'' اقرونوس نے جھک کر رازداری کے ساتھ خیام کے کان میں کہا۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی موجود نہ تھا اور وہ تنہا سفر کر رہے تھے۔ اس کوہستانی علاقے میں کوئی شخص حسن بن صباح کا نام زبان نہیں لا سکتا۔ وہ حسن جسے تم جانتے ہو..... جس سے تم بابل کے کھنڈروں میں ملے تھے..... وہ جس سے قاہرہ اور بیت المقدس میں تمہاری ملاقات ہوئی تھی..... اب وہ نہیں رہا۔'' وہ بات ختم ہوئی وہ فسانہ بیت گیا۔'' اب وہ شیخ الجبل ہے۔ خراسان میں دس ہزار افراد اس کی آنکھ

کے اشارے پر جان قربان کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ اس کی طاقت و اقتدار دنیاوی سلاطین سے کہیں زیادہ ہے۔''

عمر کو بابل کے کھنڈروں میں لاش کے گرد منڈلاتا ہوا عقاب یاد آ گیا۔ پھر اسے نامہ بر کبوتر کا خیال آیا جس کو پرواز کے دوران مار گرایا تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

اقرونوس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا..... ''شیخ الجبل نظام الملک سے ملاقات کے بعد جس سرائے میں داخل ہوا تھا تو توش نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ یہ گذشتہ ہفتے کی بات ہے۔ تو توش نے پولیس کے دو دستے اسے تلاش کرنے کے لیے مامور کیے تھے۔ انہوں نے چپا چپا چھان مارا مگر وہ در مقصود ان کے ہاتھ میں آ سکا۔ کسی انسانی آنکھ نے شیخ الجبل کو اپنے بلند آشیانے کی طرف سفر کرتے نہیں دیکھا۔ لیکن وہ وہاں موجود ہے اور ہمارا انتظار کر رہا ہے۔''

''کہاں؟''

''الموت میں..... عقاب کے آشیانے میں۔ اسی نام سے وہ جگہ مشہور ہے۔ لیکن اس کا راستہ کسی کو معلوم نہیں؟''

''ظاہر ہے تمہیں تو معلوم ہی ہوگا۔''

''صرف ایک دفعہ'' اقرونوس نے بڑی سادگی سے اقرار کیا۔ ''میں نے الموت کا دروازہ دیکھا تھا۔''

''کیا ایک ہفتے پہلے شیخ الجبل نے تمہیں حکم دیا تھا کہ تم مجھے اپنے ہمراہ اس کے پاس لے جاؤ؟''

''نہیں۔ ایک سال ..... بلکہ دو سال پہلے۔'' اقرونوس نے جواب دیا۔ ''وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ نظام الملک اور عمر خیام کے درمیان اختلافات کی خلیج گہری ہو جائے گی۔ جب یہ صورت حال پیش آ جائے تو اسے تلاش کر کے میرے پاس جبل پر لانا جہاں اسے با آرام پناہ مل سکے گی۔''

''واہ وا..... پھر تو تمہارا شیخ الجبل جادوگر ہے۔''

''اس سے زیادہ ذہین کوئی اور شخص آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس

کے پاس کوئی پوشیدہ طاقت ہے۔'' اقرونوس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے۔ سنا ہے نظام الملک نے اپنی کتاب میں ایک باب لکھا ہے جس میں اس سے خبردار رہنے کی تنبیہہ کی ہے۔ اور وہ باب سر بمہر کر کے ہدایت کی ہے کہ اس کی موت کے بعد اسے نکال کر پڑھا جائے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کہاں تک درست ہے؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ نظام الملک کو حسن بن صباح کی طرف سے خوف لاحق ہے۔''

''اور تو.....؟''

''ہم'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''نیچے میدانوں میں تلواروں کی خوں آشامی۔ محصولات کی گراں باری۔ ملاؤں کا تشدد اپنے پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں۔ ان باتوں کی خواجہ عمر کے لیے کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ سلطان کا مقبول بارگاہ ہے لیکن ہم غیر مسلم تاجروں کے لیے ان کی حیثیت کڑی زنجیروں سے بھی زیادہ ..... ہم ارمنی کیا ہیں۔ غلاموں سے بھی بدتر ..... یہاں جبل کی بلندیوں پر امن ہے۔ آزادی ہے۔'' اس کی آواز میں ایک نامعلوم سا اشتیاق شامل ہو گیا۔ اور جیسے جیسے تجربہ کار اور جہاں دیدہ، تاجر پہاڑیوں اور پر پیچ گھاٹیوں سے گزرتا ہوا منزل مقصود سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا اس کے دل میں ایک امنگ، ایک خوشگوار احساس، ایک ولولہ جنم لے رہا تھا۔ وہ کبھی ترنگ میں آ کر اپنے خچر کے کوڑا مارتا اور کبھی آگے بڑھ کر خواجہ عمر کے خچر کے قریب ہو جاتا۔ دوسرے جانور اور افراد بھی خاموشی سے راستہ طے کرنے میں مصروف تھے۔ عمر نے خیر مقدم کی دھیمی دھیمی آوازیں سنیں۔ نسوانی قہقہوں کی آواز اس کے کان میں آئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ کسی کے پاس کوئی روشنی نہیں تھی۔

نظروں سے پوشیدہ پہرے داروں نے جب انہیں کچھ وقفے کے لیے روکا تو کہیں قریب ہی بہتے ہوئے دریا کی دھیمی دھیمی گنگناہٹ خیام کے کانوں میں آئی اور ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا سر کے اوپر سے گزرتا ہوا محسوس ہوا جس میں شاہ بلوط کے درختوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ خچر مستعدی سے پتھریلے راستے پر اوپر کی طرف چڑھنے

میں مصروف تھے۔ یکا یک کرخت آواز میں کسی نے للکارا:

''رک جاؤ! اے رات کی تاریکی میں آوارہ گردی کرنے والو!''

اور کسی شخص نے عمر کے قریب سے جواب دیا۔ ''نہیں! اے شخص۔ ہم سات رفیق ہیں۔''

''تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟''

''اس دن کی جو ابھی نمودار نہیں ہوا۔''

خچر پھر آگے بڑھنے لگے۔ سنگلاخ زمین پر ان کے سموں کی آواز تیز ہوگئی۔ عمر نے محسوس کیا کہ وہ تیزی سے کسی ایسے راستے پر مڑ گئے جو ڈھلان سے ہوتا ہوا اس کی چوٹی کی طرف جاتا ہے نیچے اچھی خاصی گہرائی میں دریا پتھروں سے ٹکراتا، شور مچاتا بہہ رہا ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے عمر کی ڈھیلی عبا کو اڑا رہے تھے۔ اس نے خچر کو اپنے گھٹنوں میں مضبوطی سے دبا لا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک لامحدود خلا میں ڈولتا ہوا جا رہا ہے۔ گئے ۔ ایک بڑے دروازے کے قلابے چٹخنے ، ایک موٹی سی زنجیر کھڑکنے کی آوازیں اس کے کان میں آئیں۔ اور کسی نے اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی دفعتاً کھول دی۔

ایک لالٹین کی تیز لو نے تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔

جب اس نے آنکھیں مل کر اپنے چاروں طرف نظر ڈالی تو خود کو ایک وسیع صحن میں کھڑے پایا۔ آسمان پر ان گنت ستارے جگمگ جگمگ کر کے فضا میں دودھیا روشنی بکھیر رہے تھے۔ اقرونوس اور اس کے دوسرے ہم سفر غائب تھے۔ ایک سیاہ فام لڑکا اس کے خچر کی لگام تھامے کھسیانے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ایک پستہ قد آدمی سرخ ریشم میں ملبوس سلام کے لیے جھکا ہوا تھا۔

''آپ کی تشریف آوری مبارک ہو۔ آقا! مجھے رکن الدین کہتے ہیں اور میرا تعلق قاہرہ کی عظیم رصد گاہ سے ہے۔ آپ کی گراں قدر تصانیف کے مطالعے سے میں نے اپنی جہالت کے اندھیروں کو علم کی روشنی سے منور کیا ہے۔ قدم رنجہ فرمایئے اور اپنی

آرام گاہ کو تشریف لے چلئے۔

عمر کا سارا جسم تکان سے چور ہو رہا تھا۔ رکن الدین کے پیچھے پیچھے وہ عمارت کے بغلی دروازے میں داخل ہو کر ایک پتھریلے صحن میں سے گزرا جو غالباً عرصے سے ویران پڑا تھا اور کچھ دور چل کر ایک کمرے میں پہنچ گیا جہاں بخارا کا بنا ہوا ایک بڑا قالین بچھا تھا قریب ہی ایک انگیٹھی روشن تھی۔ جس کے پاس ایک طشت میں شکر آمیز پھل اور روٹیاں رکھی تھیں۔ اور ساتھ ہی شراب سے بھرا ہوا ایک جام بھی۔

رکن الدین نے سیاہ فام لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کا غلام ہے۔ آپ نے بہت صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اب آپ سکون کی نیند سو جائیں! خدا کرے آپ دل پذیر خواب دیکھیں۔''

مصری فاضل کورنش بجا لا کر رخصت ہو گیا تو عمر نے کچھ پھل وغیرہ کھائے اور طشت لڑکے کے حوالے کر دیا۔ آرام سے بیٹھ کر اس نے شراب پی جو قدرے تیز چاشنی دار تھی۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اس نے کمرے کی واحد کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

نیچے خلا میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور اوپر ستاروں بھرے آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ادھر ادھر تیرتے پھر رہے تھے۔ کوئلے کا ایک وزنی ٹکڑا جو انگیٹھی سے نیچے گر گیا تھا عمر نے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینکا۔ غور سے سننے کے باوجود اس کے گرنے کی آواز کان میں نہ آسکی۔

عمر کچھ سوچتا ہوا بستر پہ گیا اور اپنے جسم کو اچھی طرح لپیٹ لیا پہاڑ کی ہوا خاصی سرد تھی۔ وہ کچھ دیر انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگاروں کو دیکھتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور آگ کی سرخی نیلگوں ہوتی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے لڑکے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی جو دروازے سے ٹیک لگائے سکڑا ہوا بے خبر سو رہا تھا۔ اس کا سیاہ وجود عمر نے دیکھا، جیسے نکھرے ہوئے سفید رنگ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کمرے کا طول و عرض بھی اسے یقیناً کچھ بڑھا ہوا دکھائی دیا۔ اور چھت جیسے بلند ہو کر رات کی سیاہیوں سے ہم آغوش ہو گئی تھی۔

لیکن اس کے باوجود عمر اپنے آپ کو توانا اور تندرست بھی محسوس کر رہا تھا۔

''عجیب قسم کی نیند آتی ہے۔ اس کوہستانی علاقے میں۔'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔

اگلے دن عمر کو معلوم ہوا کہ قلعہ الموت ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے جس کے دونوں طرف گہری گھاٹیاں ہیں۔ جس راستے سے وہ یہاں پہنچا تھا وہ اس جگہ سے نظر نہ آتا تھا کیونکہ گھاٹی کی ڈھلان سیدھی اس دریا پر جا کر ختم ہوتی تھی جس کا پانی اوپر سے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے پگھلی ہوئی چاندی سبک رفتاری سے بہہ رہی ہو۔ دریا کے اس پار پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ ایسا نظر آتا تھا جیسے فوج کے دستے یکے بعد دیگرے پڑاؤ ڈالے پڑے ہوں یا پھر جیسے بلند قامت مینار قطار اندر قطار کھڑے ہوں۔

چونکہ ''الموت'' کی دیواریں قدرتی چٹانوں میں تراشی گئی تھیں۔ عمر کو خیال آیا کہ یہ قلعہ گھاٹی کے دوسرے رخ سے پہاڑ کی چوٹی کی طرف نظر آنا چاہیے۔ واقعی سوائے ان عقابوں کے جو اس کے چاروں طرف منڈلاتے رہتے ہیں اور کوئی اس قلعے کو اوپر سے نہیں دیکھ سکتا۔ غور سے دیکھنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ قلعے کی عمارت اور اس کے وسیع صحن پہاڑ کی چوٹی کے محض ایک حصہ کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔

قلعے کے وسط میں ایک سنگین دیوار تھی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درخت اگے ہوئے نظر آتے تھے۔

''جی ہاں۔ وہ پائیں باغ ہے۔'' رکن الدین نے بتایا۔ ''جسے آپ کسی وقت ملاحظہ کریں گے۔''

کبھی کبھی عمر کو دیوار پر پہرے دار چلتے پھرتے نظر آجاتے تھے۔ جو حسب دستور سفید عبائیں، سرخ پٹکے اور جوتے پہنے ہوئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ سبعیتہ جنہیں اس نے رے میں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ نوکروں کی کثیر تعداد بھی وہاں موجود تھی جن میں سے بیشتر سیاہ فام حبشی اور مصری معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہاں اسے کسی عورت کا چہرہ نظر نہ آسکا۔ نہ اعلیٰ منصب دار قسم کے لوگ دکھائی دیئے۔ بجز ان چند اشخاص کے جو رکن الدین کی طرح چینی ساخت کے چغے پہنے ہوئے تھے۔ وہ ہر زبان میں ایک

دوسرے سے گفتگو کر سکتے تھے۔

''ہم محض ''داعی'' ہیں..... آپ مبلغ کہہ سکتے ہیں۔'' رکن الدین نے بڑی شگفتگی سے اس کا امر کا اقرار کیا۔ ''چونکہ ہم مختلف مقامات سے آئے ہیں اور مسلسل سفر کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے بہت سی زبانیں جانتے ہیں۔ میری ہی مثال لے لیجئے۔ میں قاہرہ کا باشندہ ہوں۔ لیکن سلیس فارسی میں بات چیت کر سکتا ہوں..... چلئے میں آپ کو کتب خانے کی سیر کراؤں۔ مجھے یقین ہے آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔''

وہ وسطی زینے سے پہلی منزل پر اتر آیا۔ اور ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا جس میں بے شمار محرابیں اور طاق بنے ہوئے تھے۔ ہر جگہ تیل کے چراغ روشن تھے۔ اونچی اونچی میزوں پر بہت سے آدمی لکھنے پڑھنے میں مصروف۔ یونانی مخطوطات کی الماری کے سامنے پہنچ کر عمر ٹھہر گیا اور انہیں الٹ پلٹ کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہ ارسطر قس (Aristarcus) کی اس کتاب کا نسخہ تھا جس میں چاند کے مدار کی پیمائش کی گئی تھی اور اس کے گھٹنے سے متعلق مسائل پر بحث تھی۔ برابر میں رکھی ہوئی کتاب پلوٹینس (Plotinus) کی ایک جلد تھی۔

''بخدا اس سے قبل یہ کتابیں میری نظر سے نہیں گزریں۔ عمر نے با آواز بلند کہا۔''

''جی ہاں۔ انہیں مصر سے حاصل کیا گیا ہے جہاں یہ اس آگ کی نذر ہونے سے بچ گئی تھیں جس نے اسکندریہ کے کتب خانے کو خاکستر کر دیا تھا۔ سنا ہے مسلمانوں نے ان کتابوں کو ایندھن کے طور پر جلایا تھا..... بہر حال بہت سی نادر الوجود کتابیں جلنے سے بچ گئی تھیں۔ ''سیدنا'' ہمارے آقا نے انہیں تلاش کر کے حاصل کر لیا ہے۔ ہمارے پاس نقشے بھی ہیں۔ میں آپ سے کیا عرض کروں کہ ہمارے پاس کیسے کیسے بے بہا خزانے ہیں۔ ہمارے دو داعی بازنطینی ہیں اگر آپ ارشاد فرمائیں تو اصلی یونانی متن کا ترجمہ آپ کے گوش گزار کریں۔''

عمر پلوٹینس (Plotinus) کی کتاب حاصل کر کے ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ رکن الدین مسلمانوں کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے وہ

اور اس کے ساتھی کسی اور مذہب کے پیروکار ہوں۔

''یہ قلعہ ہے یا کوئی دانش گاہ؟'' عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دونوں۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ جی ہاں..... ہم علم حاصل کرتے ہیں مگر توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے اثرات سے ماورا ہو کر..... یہ ملاحظہ کیجئے۔''

پستہ قد رکن الدین نے چند کثیر الاستعمال کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ الجبرا ہے۔ یہ معلولتہ القرینہ ہے۔ یہ چاند گرہن پر ایک کتاب ہے۔ اور یہ عمر خیام کا رسالہ نجوم و ہیئت ہے۔'' رکن الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ان سب کتابوں کی بڑی ضرورت رہتی ہے۔ میں نے علم ریاضی پر آپ کی تمام تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن آپ کے دوسرے علمی شاہکار میری ناچیز عقل اور سمجھ سے بالاتر ہیں۔ لیکن ''سیدنا'' نے انہیں بغور پڑھا ہے۔''

''یعنی شیخ الجبل، تمہارے آقا نے؟''

''جی ہاں۔ مجھے تو بنیادی سات علوم میں ہی تھوڑی سی ہی شدبد ہے۔ میری مراد منطق، علم الحساب، موسیقی، مساحت، نجوم، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات سے ہے۔ لیکن سیدنا کو تو تمام مذاہب کی جزئیات تک کا علم ہے۔ حتیٰ کہ ''سحر'' کے متعلق بھی ان کی معلومات مکمل ہیں۔ ان کا علم ہر جہت سے کامل ہے۔'' اس لئے ہم عقیدت سے ان کی فرماں برداری کرتے ہیں۔

عمر، پلوٹینس (Plotinus) کے صفحے الٹنے میں مصروف تھا۔ اس نے رکن الدین کا آخری جملہ نہیں سنا۔ اس کا دماغ جذر المکعب کے مسائل میں الجھ کر کہیں دور نکل گیا تھا۔

قلعہ الموت میں وقت کی کوئی تقسیم نہ تھی۔ جب عمر کتب خانہ اسکندریہ کے مخطوطات کے مطالعے میں مصروف نہ ہوتا تو وہ داعیوں کے پاس بیٹھ جاتا جو دنیا کے ہر آباد خطے کی سیاحت کر چکے تھے۔ چینیوں کے سائنسی نظریات سے لے کر بازنطینی موسیقی تک مختلف موضوعات زیر بحث آتے۔

عمر کو رکن الدین کے طلسمی مربع بنانے کے شوق پر بڑی ہنسی آتی تھی۔ اس

چھوٹے سے قد کے ریاضی داں نے اعداد کے کچھ ایسے ''اجتماعات'' ترتیب دے رکھے تھے جنہیں ہر پھیر کے جوڑنے یا ضرب دینے سے حاصل جمع اور حاصل ضرب ہمیشہ ایک ہی نکلتا تھا۔ عمر نے ہمیشہ عملی مسائل حل کرنے کی کوشش کی تھی ان مربعوں کو دیکھ کر رکن الدین سے یہی کہتا کہ ''یہ مربعے ہیں تو بڑے دلچسپ لیکن ان سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن عام آدمیوں کے لیے یہ بے معنی نہیں ہیں۔'' رکن الدین نے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک قسم کا معجزہ معلوم ہوتے ہیں یہ مربعے۔''

پہلی رات کی طرح عمر پر ہر رات نیم خوابی کی کیفیت طاری ہوتی رہی۔ اس کے کمرے کی دیواریں طرح طرح کے رنگ بدلتی رہیں۔ خود اسے بھی پہلے دن کی سی دانائی اور صحت کا احساس ہوتا رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ آیا یہ تیز شراب اور کوہستانی ہوا کے اثرات ہیں یا کوئی اور محلول؟

وہ ماہر فلکیات تھا چنانچہ اپنے شعبے سے غافل نہ رہ سکتا تھا۔ وہ شمالی افق پر نیچے کی جانب جھکے ہوئے ایسے ستاروں کا برابر مطالعہ کرتا رہا جو نیشا پور سے نظر نہ آسکتے تھے وہ حسب معمول رات ڈھلے ایک مینار پر چڑھا ہوا، ستاروں کے مطالعے میں مصروف تھا کہ رکن الدین ہانپتا کانپتا اس کے پاس پہنچا۔

''سیدنا، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ جلدی چلیں۔''

عمر شمالی افق کے ستاروں کی جدول بنانے میں مصروف تھا۔ اس نے جدول ادھوری چھوڑ دی اور چل پڑا۔ رکن الدین نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا۔ ''آپ آج ایسی چیزیں دیکھیں گے جنہیں اس سے پہلے باہر سے آنے والے کسی دوسرے شخص نے نہیں دیکھا۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں! میرے سوا کسی سے کوئی بات نہ کریں۔''

رکن الدین عمر کو اپنے ساتھ لیے مینار سے تقریباً دوڑتا ہوا اتر کر کتب خانے کے بڑے ہال میں داخل ہوا اور اس دفعہ اس نے ایک نئے دروازے کا رخ کیا جو ایک نئے زینے میں کھلتا تھا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ یہ زینہ ایک سخت چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔

"ذرا سنبھل کے اور احتیاط سے چلیں!" اس نے ایک گول قندیل اوپر اٹھاتے ہوئے پیچھے مڑ کر بلند آواز سے کہا۔

عمر نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی۔ سوائے پتھریلی دیواروں کے اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ نیچے کی جانب سے ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا۔ زینہ کچھ اس طرح گھومتا ہوا نیچے اتر رہا تھا جیسے دو بلند پہاڑیوں کے درمیان تنگ گھاٹی۔ عمر نے محسوس کیا کہ اس کے قدموں کے نیچے سیڑھیاں ایسے پتھر کی بنی ہوئی ہیں جس کے پرت اکھڑے ہوئے ہیں اور بے شمار انسانوں کے مسلسل استعمال سے گھسنے کی وجہ سے ان میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔

بعض جگہ تو یہ گڑھے اتنے گہرے تھے کہ اسے سنبھلنے کے لیے چٹان کی دیواروں کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آئی۔ رکن الدین بڑے اعتماد اور تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جیسے اسے ان کے چپے چپے کا علم ہو۔ وہ ایک چونچال بکری کی طرح قلانچیں بھر رہا تھا۔ قندیل کی روشنی ہچکولوں کی وجہ سے کبھی تیز ہو جاتی کبھی مدھم۔

جب وہ اس سرنگ نما راستے سے باہر نکل آئے تو عمر نے ایک گہرا سانس لیا۔ "یہ سیڑھیاں بہت قدیم معلوم ہوتی ہیں"۔ اس نے سادگی سے کہا۔ "کیا یہ کوئی مکان ہے؟"

پستہ قد فلسفی نے عمر کے چہرے پر ایک تجسس کی نظر ڈالی۔ تم پہلے شخص ہو جس نے یہ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد اس قسم کا سوال کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سیڑھیاں اس دور میں تعمیر کی گئی تھیں جب انسان سورج کی پرستش کرتا تھا..... اور آگ کی۔ وہ سونے سے بھی زیادہ قیمتی شے کی تلاش میں اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن اب آپ صرف آنکھوں سے کام لیں۔ زبان سے نہیں۔"

ایک چھتے میں داخل ہوتے ہوئے عمر نے سوچا یہ سرنگ قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے تقریباً دوڑتے ہوئے اسے طے کیا۔ جب وہ اس چھتے کے آخری سرے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک سیاہ فام پہرے دار نیزے کی ٹیک لگائے، پولی دروازے کے قریب اندھیرے میں اکیلا کھڑا ہے۔

پہرے دار نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور رکن الدین نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ مناسب لمبائی نہیں رکھتا تھا۔ اس سے گزرنے کے لیے عمر کو جھکنا پڑا۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اس نے خود کو ایک وسیع صحن میں پایا، جہاں خاصی تعداد میں آدمی پہلے سے جمع تھے۔

رکن الدین نے عمر کا ہاتھ پکڑا اور بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف لے گیا جنہوں نے انہیں قریب آتا دیکھ کر بڑی بے چینی کا اظہار کیا۔ ایک خالی جگہ دیکھ کر رکن الدین نے عمر کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ عمر نے بیٹھ کر اپنے سامنے نظر دوڑائی۔ دور تک کالے کالے سر اور چوڑے چوڑے شانے دکھائی دیتے تھے۔ اور آخری سرے پر آگ روشن تھی جس کے شعلے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد فرش کی سطح سے بلند ہو رہے تھے۔ ان شعلوں کی روشنی میں نیلاہٹ تھی اور ان کا رنگ آگ کے عام شعلوں سے قدرے مختلف تھا۔ سب لوگ آواز ملا کر گا رہے تھے۔ اور کسی نامعلوم جگہ سے اٹھتی ہوئی موسیقی کی لہریں ان کی آوازوں کے زیر و بم کا ساتھ دے کر ماحول میں ایک عجیب قسم کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔

یہ موسیقی۔ عمر نے سوچا۔ غالباً بانسریوں سے پیدا ہو رہی ہے لیکن کبھی کبھی سرگم کی آواز اور رو پہلی گھنٹیوں کی سریلی غنائیت کا بھی احساس ہوتا تھا جو اس گپھا کی بلندیوں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

یہ مجمع موسیقی کی تال پر بے خود ہو کر جھوم رہا تھا لیکن وقتاً فوقتاً ہر شخص گردن اٹھا کر اس خلا کی طرف بھی دیکھنے لگتا تھا جو آگ کے شعلوں کے اس پار تھا۔ عمر چند لمحے خاموشی سے حاضرین کو دیکھتا رہا۔

وہ سب نوجوان تھے حسب معمول قلعہ الموت کے پہرے داروں کا سا سرخ، سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو دبلے پتلے، سیاہ سروں والے عرب معلوم ہوتے تھے باقی ہندو یا چینی تھے۔

یہ "فدائی" ہیں۔ رکن الدین نے عمر کے کان میں کہا۔ یہ ان کی آزادی اور جشن کی رات ہے۔ انہیں بہت جلد آقائے موت و حیات کی زیارت نصیب ہوگی۔

ان کی آنکھیں ابل کر اوپر آ گئی تھیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے عماموں کے لٹکتے ہوئے سروں سے پسینہ پونچھتے جاتے تھے جو ان کی پیشانیوں سے برابر بہہ رہا تھا۔ شعلوں کے اس پار کوئی چیز دیکھنے کے لیے بار بار نظریں جما رہے تھے۔ جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا تھا۔

پھر رقص شروع ہو گیا۔ تلواروں کا رقص۔ ایک نیم برہنہ شخص اپنے بازو بلند کیے بیچ میں کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف تلواریں چمک رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس نے بھی ناچنا شروع کر دیا اور زور زور سے گانے کے انداز میں نعرے لگانے لگا۔ ''اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو۔''

تمام مجمع نے ایک آواز ہو کر یہ نعرہ دہرایا۔ ہر شخص جھوم رہا تھا اور دور کہیں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

گانے والے کے چاروں طرف ناچنے والے گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں دو تلواریں تھیں جن کو وہ اتنی چابکدستی سے گھما رہے تھے کہ کیا مجال تلوار سے تلوار ٹکرا جائے۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ ایک رقاص دوسرے رقاص کا سر قلم کر رہا ہے۔ اور جیسے رقص کی رفتار تیز ہوتی جاتی تھی ان کے ننگے بازوؤں سے پسینہ بہہ بہہ کر فرش پر ٹپکتا جاتا تھا۔ تلواروں کی مسلسل حرکت سے چمکتے ہوئے لوہے کی محرابیں سی بنتی بگڑتی نظر آ رہی تھیں۔

''اللہ ہو، اللہ ہو۔'' جھومتے ہوئے مجمع کی فلک شگاف آواز فضا میں گونجتی رہی۔ یہ رقص کتنی دیر جاری رہا عمر کو اندازہ نہ ہو سکا۔ لیکن اب ختم ہونے ہی والا تھا۔ رکن الدین نے عمر کا بازو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ دوسری جانب ایک نوعمر لڑکا سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

''اس کا وقت آ پہنچا ہے۔'' اس شور و غل میں کسی کی آواز تیر کی طرح آتی ہوئی سنائی دی۔ ''جنت کو..... جنت کو۔''

وہ شخص جس نے اپنے بازو بلند کر رکھے تھے اور سر نیوڑھا رکھا تھا تیزی سے حرکت کرتی ہوئی تلواروں کے سائے میں بدستور آہستہ آہستہ ناچ رہا تھا۔ اس رقاص کی پشت پر عمر کو کسی اور چیز کا احساس ہوا۔ بلند ہوتے ہوتے ہوئے شعلوں کے درمیان ایک ہیولہ نمودار ہونا شروع ہوا۔ ایک درندے کا ہیولہ۔ جس کے پاؤں خوں خوار جانور کی طرح ناخن دار تھے۔ ٹانگیں شیر کی سی، جسم بیل کی مانند، اس کا چہرہ انسانوں کا سا تھا جس پر ایک لمبی داڑھی تھی۔ لیکن بے حد بھیانک۔

چہرے کے دونوں جانب پرندوں جیسے مگر لمبے چوڑے بازو اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ گو یہ ہیولہ ایک پتھر کا مجسمہ تھا لیکن جلتی بجھتی روشنی نے اسے ایک زندہ وجود بنا کر پیش کر دیا تھا۔

''اب'' رکن الدین نے بلند آواز میں کہا۔ ''اب وہ جنت کو روانہ ہو رہا ہے۔''

رقص کرتا ہوا آدمی اب بالکل ساکت کھڑا تھا۔ تلواریں اس کے جسم سے مس ہو رہی تھیں۔ جگہ جگہ سے اس کا گوشت کٹ گیا۔ اور خون بہہ کر اس کے سفید لباس میں جذب ہونے لگا۔ کپڑوں پر خون کے دھبے بڑھنے شروع ہو گئے اور ایک اندرونی جوش کے زیر اثر اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ بلند بازو دفعتاً نیچے گر گئے۔ تلواریں اس کی گردن میں پیوست ہو گئیں اور اس کا سر تن سے جدا ہو کر الگ جا پڑا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا جسم اینٹھا۔ بازوؤں کو ایک جھٹکا سا لگا اور آخر وہ فرش پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

اس خونی منظر کے دوران موسیقی بند ہو چکی تھی۔ گانے والے خاموش ہو گئے تھے۔ ہر طرف موت کا سناٹا طاری تھا۔ عمر اور رکن الدین کے علاوہ ہر فرد کی پیشانی سجدے کی حالت میں فرش زمین پر ٹکی ہوئی تھی۔

خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز بلند ہوئی ''حیات اور موت کا آقا''

باریش بیل کی اگلی ٹانگوں کے بیچ میں سے ایک قد آور شخص سفید براق لباس میں نمودار ہوا۔ وہ ٹھوڑی سے پیروں تک سفید کپڑوں میں مصری ''ممی'' کی طرح لپٹا ہوا تھا لیکن اس کا سیاہ سر بتا رہا تھا کہ وہ حسن بن صباح ہے۔

اس نے جھک کر اپنے قدموں میں پڑی ہوئی لاش کو اٹھایا۔

''فدائیو! تم دیکھتے ہو'' اس نے با آواز بلند کہا۔ ''یہ شخص جنت کو سدھار گیا۔''

عمر کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے سب لوگ اپنے گھٹنوں پر کھڑے ہو گئے۔

انہوں نے سنگین درندے کی ٹانگوں کے درمیان حسن کو کھڑے پایا۔ اس کے بازوؤں میں سر بریدہ لاش تھی۔ لیکن..... مجمع کا سانس نیچے کا نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا کیوں کہ حسن کے بازوؤں پر لیٹے ہوئے شخص کے جسم پر خراش تک نہ تھی۔ اس کا سر اس کی گردن کے ساتھ تھا اور پیچھے کو لٹک رہا تھا۔ اور اس کے سفید کپڑوں پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہ تھی۔ وہ ڈھیلا ڈھالا جسم ہو بہو اس رقاص کا تھا جسے تلواریں مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

''بے شک'' سارے مجمع نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ''معجزہ ہے۔''

مذکورہ شخص کو اپنے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے حسن الٹے پاؤں پردار درندے کے پیروں کی طرف پیچھے ہٹتا گیا حتیٰ کہ غار کے عقبی اندھیروں میں نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔ تلواروں کے ساتھ رقص کرنے والوں کا سانس ہنوز پھولا ہوا تھا۔ وہ شعلوں کے گرد چکر لگا کر ایک ایک کر کے بقیہ مجمع میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ نوعمر لڑکے اپنے کندھوں پر صراحیاں اٹھائے ان سفید پوش افراد میں شراب کے چھلکتے جام تقسیم کرتے پھرنے لگے جام لینے کے لیے ہر طرف سے بے اختیار ہاتھ اٹھ رہے تھے۔

''معبودوں کی قسم'' رکن الدین نے دبی زبان سے کہا۔ ''اس طرح کا منظر دیکھنے سے جو ہیبت طاری ہوتی ہے اس پر قابو پانے کے لیے شراب سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہے..... بلند آواز سے کوئی بات نہ کرنا۔ ان تیغ زنوں پر اس وقت ایسا جنون سوار ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ سامنے والے سنگین درندے کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیں انہیں معلوم نہیں کہ تم ایک معزز مہمان کی حیثیت سے یہاں موجود ہو۔ سمجھے!''

جب اس نے جام ہاتھ میں لیا تو رکن الدین کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں جام خالی کر دیا۔ عمر نے دیکھا کہ ایک تیغ زن کپڑے سے اپنی تلوار پر جما ہوا خون صاف کر رہا ہے۔

اسے یقین ہو گیا کہ وہ خون یقیناً اصلی خون تھا۔

تیغ زن نے گھور کر عمر کو دیکھا اور غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے عمر کے عین سامنے آ کر اپنی ننگی تلوار اس کی آنکھوں کے قریب کر دی۔ ''لے چھو کر دیکھ! سونگھ اسے!

اور اگر پھر بھی تجھے شک ہے کہ یہ اصلی خون نہیں ہے'' اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''تو میں تجھے اچھی طرح یقین دلا دوں گا کہ آیا تیرا اپنا خون بھی اصلی ہے یا نہیں۔''

سارے مجمع نے دفعتاً مڑ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمر کو دیکھا۔ موت کے رقص نے ان سب میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی اور وہ اس حد تک مدہوش ہو چکے تھے کہ ہر قسم کا مجرمانہ تشدد ان کے لیے مزید سرخوشی کا باعث ہو سکتا تھا۔

''یا اللہ! یہ آخر یہاں آیا کس طرح؟ اسے یہاں کون لایا؟'' مجمع میں سے کسی نے کہا۔ رکن الدین نے ایک لڑکے سے شراب کا پیالہ چھین کر جلدی سے عمر کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''پی لے'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''خبردار جو ایک لفظ زبان سے نکالا۔ جنگی چیتے ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ شریف ہیں۔'' اور مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''یہ شخص داعیوں کا مہمان ہے۔ اسے حکم ملا تھا کہ یہاں آ کر ہمارے آقا کی زیارت سے مشرف ہو۔''

''کون اس کی ضمانت دیتا ہے؟''

ایک نوجوان لڑکھڑاتا ہوا اس حلقے میں آیا جو عمر کے گرد لوگوں نے بنا لیا تھا۔ معمر آدمیوں کے پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے اپنی کمر میں لٹکے ہوئے پیش قبض کے دستے پر مضبوطی سے ہاتھ جما لیا۔ اس کا منہ کچھ عجب طرح کھلا ہوا تھا وہ مشکوک نظروں سے عمر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر نشے کی شدت سے بار بار ادھر ادھر ہلتا تھا۔ ''کون اس کی ضمانت دیتا ہے۔''

''میں دیتا ہوں ضمانت'' رکن الدین نے اس نوجوان کی دھکیل کر پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''یہ ان پہاڑیوں کا باشندہ معلوم نہیں ہوتا۔ ذرا اس کی داڑھی پر لگے ہوئے خضاب کو دیکھو..... اس کے ہاتھوں کی سفید کھال پر نظر ڈالو..... ہمارے آقا کے غلامو! یہ شخص ضرور بھیس بدل کر یہاں آیا ہے۔ جاسوس معلوم ہوتا ہے۔''

غضب آلود چہرے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ شدت جذبات سے ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ان کے نتھنے وحشی درندوں کی طرح پھڑکنے لگے..... عمر کو

اچانک اپنا دماغ جلتا ہوا محسوس ہوا۔ غار کی دیواریں خود پر تنگ ہوتی معلوم ہوئیں۔ اس نے دیکھا جیسے راہبوں کی ایک بڑی تعداد اس کے سامنے موجود ہے۔ وہ جنہوں نے زمین کی مرکزی قربان گاہ کی بے لوث خدمت زمین کے اس شگاف میں بیٹھ کر روز ازل سے اب تک کی ہے۔

درندے کا بت پھیل کر دیو قامت سا ہو گیا تھا۔ اس کے سنگین بازو حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے پاؤں کے درمیان وہ قربان گاہ تھی جہاں ایک دن ہر شخص کو ضرور آنا تھا..... بعل کی قربان گاہ اور ہمیشہ جلتی رہنے والی آگ۔ عمر نے کھڑے ہو کر ایک قہقہہ لگایا کیونکہ اس کے خیال میں اس درندوں کے غضب سے محفوظ رہنے کی کوشش مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔

''راستہ دو۔ راستہ دو۔''

بھاری بھاری قدموں کی آواز قریب آتی سنائی دی۔ اور لمبے لمبے عصا مجمع کے سروں سے ٹکرانے لگے۔ سیاہ فام غلاموں کا ایک دستہ کندھے سے کندھا ملائے مجمع کو چیرتا ہوا عمر کی طرف بڑھا۔

سارے شمشیر زن جو کچھ دیر پہلے تک دیوانوں کی طرح غل غپاڑا مچا رہے تھے، اب ان حبشیوں کے عصاؤں سے مضروب ہو کر حیرت انگیز طریقہ سے ایک دم دو رویہ پیچھے ہٹ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ حبشی غلاموں نے بڑھ کر عمر کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ چند غلام اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر وہاں سے لے کر چل پڑے۔ زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں رفتہ رفتہ دور ہوتی چلیں گئیں۔ جب وہ ایک تاریک غلام گردش سے گزرے تو عمر نے محسوس کیا کہ حبشی غلاموں کے قدموں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔

عمر پر شدید قسم کی غنودگی طاری ہو گئی۔ کسی طرح کی ڈولی میں اندھیرے راستوں سے اسے کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر جب اسے رک جانے کا احساس ہوا تو تیز خوشبو کی مہک اس کی ناک میں پہنچی۔ اس نے کوشش کر کے اپنی آنکھیں کھولیں۔

اس نے گردن موڑ کر اس انگیٹھی کے دہکتے ہوئے کوئلوں کو دیکھا جہاں سے دھواں اٹھ کر لہراتا ہوا اس کے چہرے کی طرف آ رہا تھا۔ اس دھوئیں میں نفیس خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر کسی نے ہاتھ پھیرا۔ حسن بن صباح اس پر جھکا ہوا تھا بار بار یہ دو لفظ دہرا رہا تھا۔

''بہشت کو..... بہشت کو۔''

سات ستاروں کا جھرمٹ، آسمان پر، جوزا کے منطقے میں چمک رہا تھا۔ قریب ہی متھن اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھے۔ سرطان کی آنکھ سے تیز روشنی کی شعاعیں نکل کر اس کے پنجوں کی شکل واضح کر رہی تھیں۔

عمر نے سر اٹھا کر دوسرے ستاروں کے مقامات کا جائزہ لیا۔ تمام ستارے اپنے اپنے صحیح مقام پر موجود تھے لیکن اس کے باوجود عمر کو آسمان کچھ عجیب سا نظر آیا۔ اس نے سنہرے چاند کے گول چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس ہیئت کے آسمان پر اس وقت چاند کی موجودگی عمر کے لیے تعجب خیز تھی اور چاند بھی موسم خزاں کا پورا چاند! علاوہ ازیں اسے احساس ہوا کہ اگر وہ اپنا ہاتھ ذرا بلند کر لے تو وہ چاند کے چہرے کو چھو سکتا ہے۔

عمر نے اطمنان کے ساتھ ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آرام سے لیٹا ہوا ہے۔ اسے بدن بھی ہلکا پھلکا محسوس ہوا اور جب وہ اٹھا تو اسے حرکت کرنے میں بڑی آسانی نظر آئی۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کا دماغ ماؤف سا تھا جیسے اس کے اردگرد ایک باریک پردہ پڑا ہو۔ بہر حال وہ مستعدی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ایک پھل دار درخت پہ اس کی نظر پڑی۔ وہ درخت کچی کلیوں اور نیم شگفتہ پھولوں سے لدا ہوا تھا جن کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ ان پھولوں کے تمام رنگ چاندنی میں منعکس تھے۔ لیکن وہ چاند کہاں گیا؟ عمر کو اس امر کا یقین تھا کہ اس نے ابھی چاند دیکھا تھا۔

اس کے پیروں کے نیچے سرسبز اور ملائم گھاس اس کے تلووں کو گدگدا رہی تھی۔ اس نے اپنے بازوؤں پر نظر ڈالی جو ہلکے پھلکے ریشمی کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اسے

اپنا جسم غیر معمولی طور پر خوبصورت نظر آیا۔ ایک خوشگوار احساس عمر پر طاری تھا۔

اچانک بہتے ہوئے پانی کا ترنم اس کے کانوں میں رس گھولنے لگا۔ کشاں کشاں وہ اس مقام تک پہنچا جہاں سے پانی کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے خود کو ایک آبشار کے دہانے پر کھڑا پایا۔

وہ آبشار ایک چٹان سے برآمد ہو رہی تھی۔ وہ پانی پینے کے لیے گھٹنوں کے بل نیچے جھکا۔ پہلے اس نے چکھنے کے انداز میں ایک گھونٹ لیا پھر دیر تک پیتا رہا۔ اس کے حلق میں خشکی کی وجہ سے کانٹے پڑ گئے۔ اور وہ بہتا ہوا خوش ذائقہ پانی دراصل شیراز کی سرخ شراب تھی۔

''شیراز کی نفیس شراب'' عمر نے زور سے کہا اور خود اپنی آواز غور سے سننے لگا جو رات کی گھمبیرتا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

اب وہ متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں ایک شیر پر جا کر رکیں جو دانت نکوسے کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شیر کے سخت سر کو چھو کر دیکھا جو چینی کے برتن کی طرح چکنا تھا۔ عمر اچھل کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا لیکن اس پر بھی وہ ساکت کھڑا رہا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ اس کے پیٹھ سے اتر آیا۔ اس وقت تک عمر کو اس ''مہتاب باغ'' کے متعلق تین باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔

''پہلی یہ کہ چاند مصنوعی تھا۔ دوسری بات یہ کہ آبشار سے پانی کے بجائے شراب ابل رہی تھی۔ اور اس کی تیسری یہ کہ شیر چینی مٹی کا بنا ہوا تھا۔''

عمر کو اب کسی نادر دریافت کی جستجو تھی۔ یکا یک اس کا دماغ منطقی استدلال سے تھک گیا۔ اس کے قدم بلا ارادہ ایک چشمے کی طرف اٹھ گئے جو بہت ہی پرسکون اور دلکش تھا۔ سفید آبی پھول پانی کی سطح پر ہر طرف کھلے ہوئے تھے۔ ایک راج ہنس اپنے سفید پروں میں اپنا سر چھپائے نیند کے عالم میں تیر رہا تھا۔ عمر کو اس کے سونے کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔

باغ کے کسی گوشے سے ایک گنگناتی ہوئی آواز ابھری۔ چوکنا ہو کر اس نے آواز پر کان لگائے۔ اس کا خیال صحیح تھا۔ ''یہ بلبل نہیں جو اس ''مہتاب باغ'' میں ادھر

ادھر چہچہاتی پھر رہی ہو۔ یقیناً یہ کسی عورت کے گانے کی آواز ہے۔'' تھوڑی دیر سننے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ بانسری کی لے پر گا رہی ہے۔ آواز بڑی سریلی تھی تاہم زیادہ جاذب توجہ بھی نہ تھی۔

البتہ جس چیز نے اسے اپنی طرف کھینچا وہ سطح آب پر ایک مکان سا تھا۔ جو تیر نہیں رہا تھا تو جب وہ چشمہ نمودار ہوا ہو گا تو وہ عمارت وہاں پہلے سے موجود ہو گی۔ بہر حال ایک عمارت وہاں موجود تھی۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

زمین پر بچھی ہوئی گھنی بیلوں میں اس کا پیر الجھ گیا اور وہ اچانک گر پڑا۔ دراصل وہاں اندھیرا تھا اور اس جگہ چاند کی روشنی درختوں کی اوٹ سے نیچے نہ جھانک سکتی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں انگور کی بیلوں میں بری طرح پھنس گئیں اور وہ چشمے کے کنارے پانی میں گر پڑا کچھ دیر وہ بے بسی کے عالم میں پڑا رہا۔ پھر اس نے خود ہی سوچا کہ انگور کی یہ بیلیں بھی تو جانی پہچانی ہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کہ ایک شاخ پکڑی اور زور لگا کر کنارے پر آ گیا پاس ہی اسے ایک پتلا سا پل دکھائی دیا جس کے اختتام پر وہ عمارت واقع تھی۔ پل کے وسط میں پہنچ کر اس کی نظر خود اپنے سائے پر پڑی جو اس کے ساتھ ساتھ پانی کی سطح پر چل رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے وہ رکا۔ جب اس کا سایہ بھی رک گیا تو اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اسے یہ بات بڑی دلچسپ معلوم ہوئی۔

پانی میں کھڑے اس مکان میں عمر نے قدم رکھا تو مکان کو ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اس نے پردہ سرکا کر اندر جھانکا۔ قالین پر پڑا ہوا ایک اور چاند اپنی روپہلی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر اسے چھوا۔ روشنی کی ایک چمکتی ہوئی بڑی سی گیند میں حرارت تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے اندر کوئی چیز کلبلائی۔ اور دبی آواز میں کسی نے کہا۔ ''ابراہیم کے بیٹے!''

عمر گیند کو چھوڑ کر وہیں ملائم گدیلوں پر بیٹھ گیا۔

چاند کا دروازہ کھلا اور اس میں سے جنت کی حور نکلی۔ کنیز آداب بجا لاتی ہے۔

جنت کی اس حور کی آواز میں اجنبیت نہیں تھی۔ لیکن خواب میں نظر آنے والی مخلوق فارسی یا عربی میں اس طرح گفتگو نہیں کیا کرتی کہ وہ آپ سے باتیں کرے اور

آپ اس باتوں کو سمجھ بھی جائیں۔

لمبے سنہرے بال اس کے گھٹنے پر رکھی ہوئی پیشانی کے دونوں طرف لہرا رہے تھے۔ ریشم سے بھی زیادہ ملائم انگلیاں ان میں پیوست تھیں۔

''کیا یہ کشتی'' عمر نے سوال کیا۔ ''کبھی نہ ختم ہونے والی رات میں مسلسل تیرتی رہتی ہے؟''

''ہر رات دوسری رات سے مشابہ ہوتی ہے۔''

''اور یہ چاند'' عمر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''کبھی نہیں بدلتا، کبھی نہیں نکلتا، کبھی نہیں ڈوبتا، نہ یہ کبھی بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔ اور فوق الفطرت مخلوق اس کی پرستش کرتی رہتی ہے۔''

عمر نے اس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا۔ جس کا رنگ زرد تھا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے عمر کو دیکھا۔ نازک ہونٹوں پر پژمردہ ہنسی نمودار ہوئی۔ عمر کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

''زوئی!'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ اسے خراسان کی بڑی سڑک یاد آگئی جب وہ اپنے خیمے میں لیٹا رحیم کے غم میں آنسو بہا رہا تھا..... ''وہ تمہیں مجھ سے چھین کر لے گئے تھے۔ اور اس وقت میں صرف ابراہیم کا بیٹا تھا۔''

زوئی کا جسم بالکل ٹھنڈا تھا۔ وہ روپہلی روشنی میں خاموش اور ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ عمر نے اس کے لبوں کا بوسہ لیا۔ ان میں بھی گرمی مفقود تھی۔ اس نے زوئی کے بلوریں بازو پر اپنا سر رکھتے ہوئے سوچا کہ آخر وہ اس قدر خوف زدہ کیوں ہے۔ اور اس کا جسم لباس سے کیوں عاری ہے؟ لیکن کچھ بھی سہی زوئی حسین تھی۔ حالانکہ وہ اس مکان نما کشتی میں رات کے وقت ایک مردے کی طرح تیر رہی تھی۔ رات جو کبھی ختم نہ ہوگی۔

''میں تجھے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔ لیکن فوراً ہی وہ مسکرایا۔ ''نہیں نہیں۔ آج بھی میری حیثیت ابراہیم کے بیٹے سے زیادہ نہیں ہے۔''

زوئی کی آنکھوں سے خوف زائل ہوگیا۔ اور اس کے ہونٹوں کی افسردگی شگفتگی میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے اپنی صراحی دار گردن عمر کے سر سے پیوست کر دی۔ اور گہرا سانس لیا۔ راج ہنس بدستور نیند کے عالم میں پانی کی ساکن سطح پر تیرتا ہوا۔ چینی مٹی کے

شیر کے قریب سے گزرا۔ عمر نے دیکھا کہ زوئی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز روشنی کی طرف پھینکی اور روشنی رفتہ رفتہ اتنی مدھم ہوگئی جیسے خیمے کی سوتی دیوار سے چھن کر آ رہی ہو۔

زوئی نے عمر کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور اس مرتبہ اس کا جسم مردے کی طرح سرد نہ تھا..... اس میں حرارت تھی۔ زندگی تھی۔

حسن نے عمر کو بیدار کرنے اور اس سے ملاقات کرنے کا وقت دوسرے دن صبح کو طے کر رکھا تھا۔ جب وہ عمر کے کمرے میں بغیر اطلاع کے داخل ہوا تو نوعمر سیاہ فام غلام کا چہرہ مارے خوف کے فق ہوگیا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ احتیاط کے ساتھ دروازہ بند کر کے حسن نیند میں مدہوش عمر کے قریب قالین پر بیٹھ گیا اور آہستہ آواز میں عمر سے مخاطب ہو کر بولتا رہا حتیٰ کہ عمر نے کروٹ لی۔

عمر چھت پر نظریں جما کر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہو گئے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے گہرے سائے ناچ رہے تھے۔ ''میں سوتا رہا اور خواب دیکھتا رہا۔''

''کیا واقعی وہ سب کچھ خواب تھا جو تم سے دیکھا؟''

''نہیں۔ سب کچھ خواب نہیں تھا۔ مگر ہاں تھوڑا سا۔''

''تو پھر تم کہاں تھے؟'' حسن نے سینکڑوں بار یہ سوال اس سے قبل ان تمام افراد سے کیا تھا جو اس قسم کی نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔ اور بڑے اعتماد کے ساتھ ایک ہی جواب اسے ملا تھا۔ ''جنت میں'' سینکڑوں افراد ایک زبان ہو کر یہ جواب دے چکے تھے۔

''ایک نادر قسم کی مصنوعی بہشت عمر نے سوچتے ہوئے کہا''

یہ کوشش کرتے ہوئے کہ اس کے چہرے یا لہجے سے کسی قسم کا تعجب ظاہر نہ ہونے پائے حسن نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مصنوعی؟''

''ہاں۔ چاند آسمان سے بہت نیچے تھا۔''

''اور کیا؟''

عمر مسکرایا۔ وہ اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ ''تمہاری جنت کی حور ایک لڑکی تھی جسے میں پہلے سے جانتا تھا۔''

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ کون لڑکی تھی؟''

"بازنطینی زوئی جھیل میں تیرتی ہوئی کشتی پر سوار۔"

حسن کو اس بات میں کمال حاصل تھا کہ وہ جب چاہے اپنے ارادے کا کسی طرح اظہار کے بغیر اپنا لائحہ عمل بدل دے۔ اس کے جاسوسوں نے اسے یقین دلایا تھا..... کہ عمر کو محض جذباتی بنا کر رام کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً شراب کے خمار کے ذریعے۔ حسن نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیا۔

"مجھے یقین ہے۔" اس نے اپنے لہجے میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کہ تم نے میری جنت کی شراب کو خوش ذائقہ پایا ہوگا؟"

"جی ہاں! بہت اچھی تھی۔"

مجھے افسوس ہے کہ چاند سے ایک منجم مطمئن نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی سے دن کی روشنی اس نظر بندی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لیکن میرے فدائیوں نے کبھی اس سلسلے میں شبہ ظاہر نہیں کیا۔ ایک دفعہ جنت کی سیر کرنے کے بعد ان کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ ایک بار پھر وہ وہاں واپس جا سکیں۔ ظاہر ہے وہ سب کے سب نوجوان ہیں۔ جہاں تک رفیقوں کا تعلق ہے۔ جن میں سے چند تمہیں رے میں مل چکے ہیں۔ وہ اس جنت کے آسمانی ہونے کے تو قائل نہیں ہیں لیکن بہر کیف لطف اندوز وہ بھی ہوتے ہیں۔"

عمر نے پوچھا۔ "رکن الدین اور اس کے ساتھی دوسرے داعیوں کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ کیا وہ بھی کبھی جنت کی سیر کرتے ہیں؟"

"نہیں وہ سب میرے علمی مشیر ہیں۔ ان کا دائرہ عمل کتب خانے اور معمل تک محدود ہے۔ ان کی اپنی دلچسپیاں ہیں تمہیں اب اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میرے پیروکار مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔"

"تم نے صرف چار طبقوں کے نام لیے ہیں۔"

"پانچواں طبقہ عام آدمیوں کا ہے..... مثلاً اقرونوس کی طرح کے تاجر جو باہر کی دنیا میں تجارتی معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ تاجر ہونے کی حیثیت سے وہ میری بدولت خاصا نفع کماتے ہیں۔ لیکن وہ آج تک باب العلم میں داخل نہیں ہو سکے۔ عمر کو اقرونوس کا خیال آیا جو صرف ایک مرتبہ قلعہ الموت کے دروازے تک ہی آیا تھا۔

"تم بہت سے ناموں سے مشہور ہو۔ حسن بن صباح۔"

"ہاں۔ عوام اور فدائیوں کے لیے میں حقیقتاً زندگی اور موت کا آقا ہوں۔ اگر تمہیں شک ہے تو میں ابھی اس کا ثبوت پیش کر دوں گا۔ وہ مجھے شیخ الجبل کے نام سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے قلعے پہاڑوں پر واقع ہیں۔ مثلاً الموت جو ایک قلہ کوہ پر بنا ہوا ہے۔ بہت بڑی فوج کے حملے کی صورت میں بھی مٹھی بھر آدمی اس قسم کے مقامات کی حفاظت بخوبی کر سکتے ہیں۔"

"اور رفیق۔ ان کی رائے کیا ہے؟"

"یہ لوگ نئے مذہب کے کٹر پیرو ہیں۔ وہ مجھے مہدی کا قاصد اور نمائندہ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ تم نے بیت المقدس میں دیکھا تھا۔"

"لیکن اب میری اور تمہاری کسی قسم کی شناسائی نہیں ہے۔" عمر اٹھ کر کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ "تمہارے پیروؤں کے باقی دو طبقوں کا کیا عقیدہ ہے؟"

"باقی دوسرے دو کون ہے۔" میں پانچوں کے پانچوں طبقوں کا حال تمہیں بتا چکا ہوں۔

"پانچ۔ لیکن سب کے سب کا حال نہیں بتایا۔ عمر نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ سب ملا کر سات ہوتے ہیں۔"

حسن کی سیاہ آنکھوں میں چمک ابھری گئی۔ معاف کرنا۔ میں اس وقت یہ بھول گیا تھا کہ تم ریاضی داں ہو۔ ذرا مجھے بھی سمجھا دو کہ تم نے سات کا تعین کیوں کیا ہے؟"

"کیا تم سبعیہ نہیں کہلاتے۔ تمہارے مبلغ ناواقف عوام سے دریافت کرتے ہیں کہ ہفتے میں سات دن کیوں ہیں۔ یا پھر آسمان پر چاند، سورج سمیت سات سیارے کیوں ہیں؟ میں ایک درہم کی شرط لگاتا ہوں کہ تمہارے معتقدوں کے بھی ضرور سات طبقے ہیں۔"

عمر کی اس تنقید پر حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب'' تمہاری مثال اس لوہے کی ہے جو تپے ہوئے لوہے کی کاٹتا ہے۔ اقرونوس اکثر قسم کھا کر کہا کرتا ہے۔ ''عمر دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ میں کہتا ہوں: دنیا میں نام پیدا کرنا کیا بڑی بات ہے۔ تم اس سے بھی اعلیٰ چیز کے اہل ہو..... الموت کے اور کون کون سے پوشیدہ راز تم نے دریافت کیے ہیں؟''

عمر نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ حسن سے مصالحانہ انداز میں گفتگو کرنا بہتر ہو گا یا معاندانہ طرزِ عمل پر۔ الموت ایسا مقام نہ تھا جہاں کسی قسم کی کمزوری کا اظہار کیا جاتا۔

''مکتوب الیہ تک مکتوب پہنچنے سے پہلے اس کا مضمون اڑا لینے کا راز'' عمر نے طنزاً کہا۔

''کون بدبخت کہتا ہے کہ میں اس طرح کی دھوکے بازی کرتا ہوں۔ یہ کیا افترا پردازی ہے۔'' حسن کی آنکھوں سے بدگمانی اور شبہ جھلک رہا تھا۔

''کوئی نہیں کہتا۔ رے کے راستے میں ایک باز کے ذریعے مجھے یہ راز معلوم ہوا تھا۔'' عمر نے اپنی پیٹی سے چاندی کی ایک نلکی ٹٹول کر نکالی جس میں کاغذ کا ایک پرزا بند تھا۔ اس پر تحریر تھا: عمر رے جانے والی شاہراہ پر سفر کر رہا ہے۔''

حسن نے جلدی سے وہ عبارت پڑھی اور نلکی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بہت حیران تھا۔ اب غصے کے آثار اس کے چہرے سے غائب ہو چکے تھے۔ ''خدا کی قسم! بڑی عجیب سی بات ہے کہ نامہ بر کبوتر کو ایک باز ہوا میں دبوچ لے۔ حسن اتفاق ہے..... اور پھر تم خود بھی مقدر کے سکندر ہو۔''

حسن نے اثبات میں سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ صحیح ہے کہ میں کبھی کبھی نامہ بر کبوتروں سے بھی کام لیتا ہوں۔ وہ یہاں قلعہ الموت میں میرے پاس دنیا کے ہر کونے سے خبریں لاتے ہیں۔ لیکن اس بات کا علم داعیوں کو بھی نہیں ہے۔ کبوتر قریب کے ایک گاؤں سے آتے جاتے ہیں۔ اس قلعے سے براہ راست ان کا کوئی تعلق نہیں ہے..... میرے خیال میں تمہاری تشفی کے لیے یہ تفصیل کافی ہے: لیکن کیا ہم دوست اور شریک کار نہیں بن سکتے؟''

حسن سرک کر عمر کے قریب آ گیا۔ ''تم یہ سوچ رہے ہو..... حسن کیا ہے؟ تو سنو! حسن ایک بدنصیب شخص ہے۔ کبھی اس کارگاہ حیات کا طالب علم تھا۔ ایسی دنیا میں علم و فراست کا حصول محض بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جہاں سلاطین اور ان کے وزراء انسان کی روح اور جسم دونوں پر حکمراں ہوں۔ قاہرہ کے مسلح محافظوں کے کوڑوں کے خوف سے میں مدتوں آوارہ کتے کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔ میں شرم اور بدنامی کا مزا چکھ چکا ہوں۔ میں نے طنز کے تیز نشتروں کی تڑپا دینے والے خلش بھی برداشت کی ہے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں سن بلوغ کو پہنچ رہا تھا لیکن قاہرہ میں رہ کر میں نے اسماعیلی علما سے علم حاصل کیا..... اسماعیلی جنہیں تم سبعیتہ کہہ سکتے ہو میں نے سمندر پار گلیلی کے زیریں ساحل پر طبریہ میں مقیم بوڑھے علماء کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ میں نے بہت کچھ بتا دیا..... میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ اور جب تھکی ہوئی زمین پر ستاروں کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے اور اس وقت تم نے بھی اسرار قدرت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔''

حسن نے اپنی گردن جھکا لی۔ ''علم و فراست کے خوشنما پھل کا تلخ ذائقہ میرے کام و دہن نے اچھی طرح چکھ لیا ہے۔ خدا کا کہیں وجود نہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب ایک بوڑھی ہوتی ہوئی عورت کے مانند ہیں۔ ان کا حسن اور افادیت زائل ہو چکے ہیں۔ ان کا وجود سکڑ کر توہم پرستی کی خشک ہڈیوں کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے، جب تمام مذاہب کا وجود ختم ہو جائے گا اور صرف چند سوکھی ہوئی کھالیں اور ہڈیاں باقی رہ جائیں گی جنہیں پرانے قیمتی پتھروں کی طرح آثار قدیمہ کے شیدائی خانقاہوں میں حفاظت سے رکھ لیں گے۔ حجر اسود بھی عجیب قسم کا پتھر ہے جو فولاد سے ملتا جلتا ہے۔ اگر میری آواز ساری دنیا کے سننے والوں کے کانوں تک پہنچ سکے تو میں پکار پکار کر یہ پیغام پہنچاؤں گا کہ تمام مذہبی قربان گاہوں اور شاہی مسندوں کو اکھاڑ کر پھینک دو۔ وہ تمام افراد جو شاہی مسندوں پر براجمان اور مذہبی قربان گاہوں پر قابض ہیں ان کی حیثیت عام انسانوں سے مختلف نہیں ہے۔ وہ جھوٹ اور فریب کی آڑ لے کر اپنے مفاد کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج

کے مسلمان جو خدا کی عبادت کرتے ہیں ان کافروں سے زیادہ عقلمند نہیں ہیں جو عہد عتیق میں سورج کی پرستش کیا کرتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''میں جانتا ہوں'' عمر نے حسن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک شاہ بھی ایک عام انسان ہے۔ لیکن بفرض محال اگر تم اسے تخت سے اتار دو تو اس کی جگہ کسے بٹھاؤ گے؟''

''سب سے پہلے تو موجودہ طرز حکومت اور غلامی کا استیصال کیا جائے۔ چار ملک شاہ مل کر بھی تمہاری عقل کو نہیں پہنچتے۔ ہم آخر کیوں بادشاہ پرستی کو جاری رہنے دیں؟ انسان جہالت کے اندھیرے سے نکل کر علم و عقل کی روشنی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب وہ عقلیت کی تکمیل کرے گا..... لہٰذا میں غیر مطمئن روحوں کو نئی راہیں دکھاتا ہوں۔ انہیں ایک دوسرے کا رفیق بناتا ہوں۔ ہم چوری چھپے نئے عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں۔''

حسن کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا تم نے کتب خانے کی سیر کی ہے۔ تم نے داعیوں سے بھی گفتگو کی ہے۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم ہر شئے کی کہنہ کا مکمل علم حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اور تم یہ بھی اچھی طرح سمجھتے ہو..... جھٹلانے کی کوشش نہ کرنا..... کہ بیشتر ایرانی سوائے قرآن کے اور کسی چیز پر ایمان لانے کی تیار نہیں ہیں۔ ہمیں عوام کے طبقے سے نئے عقیدے کو ماننے والے چاہئیں۔ کیونکہ چند مفکروں کے بنائے کچھ نہیں بن سکتا۔ سوائے اس کے کہ وہ قید خانوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں یا زندہ جلا دیئے جائیں۔ چنانچہ عوام میں ہم مہدی کے ظہور کی تبلیغ کرتے ہیں جو ایرانیوں کا قدیم عقیدہ ہے۔ سمجھدار اور ذہین افراد کو علمی فتوحات کے نام پر اپنا ہمنوا بناتے ہیں۔''

اپنے شانے اچکا کر حسن نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''کیا زندگی اسی ایک نہج پر گزرتی رہے گی؟ نظام الملک اپنے کمرے میں بیٹھ کر تم سے جو باتیں کرتا ہے کیا وہ ساری باتیں ملاؤں کو بھی بتا دیتا ہے؟''

''نہیں افلاطون نے اس نظریئے کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ دنیا کا ہر کام

اسی طریقے پر چلتا ہے۔ روشنی کے ساتھ اندھیرے کا وجود ناگزیر ہے۔ صنف قوی کے پہلو میں صنف نازک کی موجودگی ضروری ہے۔ دونوں مل کر ہی ایک مقصد کو پورا کرتے ہیں..... ہر طبقے میں ہمارے عقیدے کو ماننے والے موجود ہیں۔''

''پھر بھی تم نے جادو سے کام لیا ہے۔''

''کیوں نہیں۔ جادو، سحر، فراست کی آخری حد ہے۔''

''شاید عوام کی نظر میں۔ تمہارے نامہ بر کبوتر اور تربیت یافتہ باز عام لوگوں کو معجزہ معلوم ہوتے ہیں۔''

''اور سمجھدار طبقے کے لیے جنہیں ہم، عارج، کہے ہیں اس سے بلند تر ایک اور جادو ہے۔ بعض فنون میں نے مصر میں حاصل کیے تھے.....'' حسن باتیں کرتے کرتے یکا یک خاموش ہو گیا..... کون سے فن کی مدد سے پندرہ سال پہلے تم نے شہزادے سے۔ جواب ملک شاہ ہے..... اس کے باپ اور رومی شہنشاہ کی موت کی پیشین گوئی کی تھی؟''

عمر جواب دینے والا تھا کہ اس کے ضمیر نے اسے روک دیا۔ ''وہ معجزہ'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''میرا ایک راز ہے۔''

''مجھے بھی اس راز میں شریک کرو۔ آخر میں نے بھی تو اپنے تمام راز تم پر ظاہر کر دیئے ہیں۔''

''سوائے ایک کے۔''

حسن نے عمر خیام کو بڑے غور سے دیکھا۔ ''اور وہ کون سا راز ہے۔''

''یعنی تمہارے مذہب کے دو سب سے بلند طبقوں کا عقیدہ کیا ہے؟ میرا مطلب ان لوگوں سے ہے جو داعیوں سے اونچے درجے کے ہیں اور مصر میں مقیم ہیں۔''

''واللہ۔ مصر میں ان کی موجودگی کے متعلق میں نے تو کسی سے بھی تذکرہ نہیں کیا۔''

''بیشک تم نے تو نہیں بتایا'' عمر نے یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ

میرا اپنا قیاس تھا کہ انہیں وہاں ہونا چاہیے۔"

"یہ تمہارا اپنا قیاس تھا۔" حسن کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "اگر یہ تمہارا محض قیاس ہے تو اس بات کو تم کیونکر ثابت کرو گے؟ خواجہ عمر! جب ہم بابل کے کھنڈروں میں ملے تھے تو تم مجھے بے حد پسند آئے تھے۔ بیت المقدس میں ملاقات کے بعد میرے دل میں تمہیں دوست بنانے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس بات کو برسوں گزر گئے۔ میں نے اس کے بعد بہت کچھ حاصل کر لیا لیکن تم! سلطان کے دربار میں تمہاری حیثیت ویسی کی ویسی ہی ہے۔ نہیں بلکہ آج تم نظام الملک کی سرپرستی سے بھی محروم ہو چکے ہو۔ اس بڈھے نظام الملک کے ساتھ جو ایک کنٹھے دار لڑاکا مرغے کی طرح بدمزاج ہے اب تمہارا اس کے ساتھ چلنا اتنا آسان نہیں جتنا پہلے تھا۔"

"خود ہی غور کرو" اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں نے تمہارے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ میں نے اقرونوس کو حکم دیا تھا کہ وہ تمہاری دولت و امارت میں اضافہ کرے۔ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔ دریائے فرات کے کنارے ریگستان میں اس نے تمہیں موت کے منہ سے بچایا۔ اس نے تمہارے محلات کو سامان عیش و نشاط سے بھر دیا ہے۔ وہ اور میں دونوں عرصہ دراز سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ تم مجھ سے آملو۔ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ میں تمہاری حرکات و سکنات کی نگرانی کرتا رہا ہوں۔ لیکن ایک ایسے شخص کی طرح جو دوستی کا خواہش مند ہو۔ تمہاری نئی زیچ۔ تمہاری تصانیف۔ نیشاپور میں تمہاری رصد گاہ۔ میں ہر کامیابی کو تعریف کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ کیا اسلام کے سربرآوردہ زعما تمہیں اسی زاویے سے دیکھتے ہیں؟ کیا ملک شاہ میں تمہاری ان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت ہے؟ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ سلطان کسی وقت بھی تم سے ناراض ہو کر تمہیں دربار سے نکلوا سکتا ہے۔ لیکن میرے لیے تمہارا وجود ناگزیر ہوگا جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔ میری اس گزارش پر غور کرو۔ آؤ! میں تمہیں قلعہ الموت کے استحکام اور مضبوطی کا مشاہدہ کراتا ہوں۔ کیوں کیا خیال ہے؟....." حسن مسکرایا..... "اب تک تم نے جو کچھ دیکھا ہے وہ میرے پیروؤں کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اب تم خود میری آنکھوں سے دیکھو۔"

عمر کو سر میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ اور سورج کی روشنی اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی نیچے کبھی اوپر ناچتی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے حسن بن صباح کی ذہانت کا ساتھ دینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ لیکن حسن اسے زیادہ سوچنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے کر پہاڑ کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا۔

سفید پتھر کی غلام گردش سے گزر کر حسن نے عمر کو ایسے غار میں لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں کچھ لوگ تو بھٹیوں میں دھاتوں کو گلا کر صاف کر رہے تھے۔ اور کچھ ایسی گلخنوں پر کام کر رہے تھے جن میں پگھلا ہوا شیشہ ابل رہا تھا۔

یہ لوگ اس راز کو مصر سے لائے ہیں۔ حسن نے عمر کو بتایا۔ "آخر شیشے کی مصنوعات اس قدر نایاب کیوں ہوں کہ صرف سلاطین کے محلوں ہی میں نظر آئیں۔ میرے گماشتے شیشے کی بنی ہوئی چیزیں اب ان بازاروں میں کھلے عام فروخت کرتے ہیں جہاں پہلے صرف مٹی کے ظروف اور چینی کے برتن فروخت ہوتے تھے۔

کارخانے سے نیچے اتر کر وہ توشہ خانے میں پہنچ گئے جو شراب کی صراحیوں، گیہوں کی بوریوں اور شہد کے مٹکوں سے بھرا ہوا تھا۔ روشنی دکھانے کے لیے اس نے ایک مشعل بردار غلام کو بلایا اور ایک ایسے کمرے میں پہنچا، جس میں چاول کی بوریاں چھت سے لگی تھیں۔

"محاصرے کی صورت میں" اس نے عمر کو بتایا۔ "قلعے کے باشندے دو سال تک انہیں آرام سے استعمال کر سکتے ہیں۔"

پھر وہ سب سے نیچے کمروں میں پہنچے وہاں لکڑی کے بنے ہوئے بے شمار پیپے ایک غار کے تاریک دہانے کے قریب چنے ہوئے تھے۔

"کان لگا کر سنو!" حسن نے عمر سے کہا۔

پہاڑ کے اس شگاف سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے پانی کسی تالاب میں گر رہا ہو۔

"جب کرۂ ارض کو وجود میں آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا۔" حسن نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آبریز ذرا بلند سطح پر ایک چھوٹا سا دریا ہوگا۔ غالباً پانی

چونے کے پتھر کو آہستہ آہستہ کاٹتا رہا اور نتیجے میں وہ تمام سرنگیں اور غار پیدا ہو گئے جو تم نے ابھی دیکھے ہیں۔ صدیاں گزریں کہ انسان نے بالائی غاروں کو دریافت کر لیا اور انہیں باقاعدہ تراش کر وہ ہموار راستے اور سیڑھیاں بنا لیں جن سے گزر کر ہم ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ان پہاڑوں کے قلب میں ایک عبادت گاہ تعمیر کر لی..... ہم نے ان کی قربان گاہ کا بھی پتا چلا لیا ہے۔ آؤ وہ میں تمہیں دکھاتا ہوں!''

عمر نے اندازہ لگایا کہ قلعہ الموت کی عمارت جو قلہ کوہ پر واقع ہے زیادہ سے زیادہ ایک بڑے قلعے کے برابر ہوگی۔ لیکن پہاڑ کی گہرائیوں میں مضبوط اور پر پیچ بھول بھلیاں بنی ہوئی ہیں۔ اگر لوگ نسلاً بعد نسل باہر کی جانب قلعے کے پاس سے گزرتے رہیں تو بھی وہ قلعے کے ان رازوں سے کبھی واقف نہ ہو سکیں گے جو اس کے سنگین غاروں کے سینے میں چھپے ہوئے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات جو اس سلسلے میں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ان زیر زمین بھول بھلیوں میں ہزاروں انسان دنیا والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ابدالاباد تک زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

وہ ایک حبشی پہرے دار کے قریب سے گزرے جو حسن کو دیکھ کر سجدے میں گر پڑا تھا۔ حسن نے ایک تنگ سرنگ کے دہانے پر پہنچ کر ایک دروازہ کھولا عمر نے خود کو اس پر دار درندے والے غار میں پایا جہاں وہ ایک دفعہ پہلے آچکا تھا۔

اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ موسیقی کی آواز آرہی تھی اور نہ فدائیوں کے مجمع کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ البتہ زرد رنگ کے شعلے اس قدرتی شہ نشین کے سامنے جہاں درندے کے پاؤں کے درمیان عمر نے فدائیوں کو رقص کرتے دیکھا تھا پتھر کے جوف سے نکل نکل کر بدستور بلند ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی درندے کے بت کا باریش چہرہ صاف نظر آجاتا تھا۔ جب شعلے ذرا دھیمے پڑ جاتے تو سارا غار اندھیرے کی تہوں میں لپٹ کر معدوم سا ہو جاتا تھا۔ اس دفعہ عمر کو احساس ہوا کہ ہوا میں گرمی ہے اور تیل کی بو فضا میں بسی ہوئی ہے۔ دو راتیں قبل جب وہ وہاں گیا تھا تو اسے یہ بات محسوس نہ ہوئی تھی۔

حسن بھی اس وقت خاموش تھا اور غالباً اس کبھی نہ بجھنے والی آگ کے متعلق

سوچ رہا تھا۔

''اس راز کا کسی کو علم نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''نشیب میں کسی جگہ اس قسم کے تیل کا ذخیرہ ہے جسے یونانی اپنے چراغوں میں جلاتے تھے۔ لیکن یہ ایک معما ہے کہ آگ یہاں پہلی مرتبہ کس طرح پہنچی اور کب سے مسلسل روشن ہے؟ مجھے یقین ہے: یہ اس زمانے سے بھی پرانی ہے، جب مصر میں ''راع'' دیوتا کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ عہد زرتشت سے بھی قدیم ہے۔ غالباً آفتاب پرستوں نے سب سے پہلے اس آگ کو الوہیت کا مظہر سمجھ کر پوجنا شروع کیا ہوگا کیونکہ انہیں یہ فوق الفطرت محسوس ہوئی ہوگی۔ انہوں نے اس آگ کو ایک قسم کا سحر تصور کیا ہوگا..... وہ لوگ خود بھی تو بڑے جادوگر تھے۔''

''لیکن یہ پروالا سانڈ ان کا بنایا ہوا نہیں ہو سکتا۔''

''نہیں یہ قدیم ایرانیوں کی تخلیق ہے جو آگ کی پرستش کرتے تھے میں نے اسی قسم کے بت زرکسیز کے محل کے کھنڈروں میں بھی دیکھے ہیں جو اصفہان کے جنوب میں واقع ہیں۔ ایرانی اسے محض ایک متبرک مقام خیال کرتے تھے کیونکہ یہ ایک قدیم عبادت گاہ تھی۔ اور انہوں نے اس متبرک آگ کی خوشنودی اور اعزاز میں درندے کا یہ بت تعمیر کیا ہوگا۔ اب میں یہاں اپنے فدائیوں کی روحانی اصلاح کے لیے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسلامی رسوم ادا کرتا ہوں۔''

چند لمحوں کے بعد حسن پھر ایک مختلف شخص نظر آنے لگا۔ غار سے نکل کر وہ ایک تاریک راستے کی طرف مڑا۔ گرم ہوا کے ایک جھونکے نے انہیں آگے دھکیل دیا..... اب عمر کو سمجھ میں آگیا کہ آگ مسلسل کیوں روشن رہتی تھی اور غار میں سانس لینے کے لیے تازہ ہوا کس طرف سے آتی تھی..... وہ یکے بعد دیگرے پر پیچ راستوں سے گزرتے رہے حتیٰ کہ اندھیرا دھندلی روشنی میں تبدیل ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سر کے اوپر نیلے آسمان کا ایک ٹکڑا نظر آنے لگا۔ اور ایک تنگ شگاف کی پتھریلی دیواریں ان کے دونوں جانب نمودار ہو گئیں۔ ٹوٹی پھوٹی چٹانوں پر چڑھتے اترتے جب وہ شگاف کے آخری سرے پر پہنچے تو غروب ہوتے ہوئے سورج

کی تیز روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ حسن وہاں پہنچ کر رک گیا اور اپنے دونوں بازو اوپر اٹھا دیے۔

''اے میرے جاں نثارو! بہشت کی نعمتیں تمہیں نصیب ہوں اور اللہ تمہارے بازوؤں کو اور قوت عطا کرے!''

وہ ایک ایسے مقام پر کھڑا تھا جہاں دست قدرت نے ایک گول سی تماشا گاہ بنا رکھی تھی۔ اس کی پشت پر کوہستانی درے کی دیواریں تھیں جنہوں نے بلندی پر ایک اونچی ڈھلوان چٹان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ قلعہ الموت کی بنیاد تھی۔ اسی بلند چٹان کو تراش کر قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ سیڑھیوں والی بیضوی شکل کی پہاڑی دراصل ایک مسطح فراز تھا، جو پہاڑ کی ڈھلان کے وسط میں واقع تھا۔ چاروں طرف سے سفید پوش افراد مٹی کے بنے ہوئے حجروں سے نکل کر وہاں جمع ہو گئے اور حسن کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ عمر نے ان میں سے بیسیوں فدائیوں کو پہچان لیا جنہوں نے اس کے ساتھ غار میں تلواروں کا رقص دیکھا تھا۔ پہاڑ کا یہ قطعہ ان کی سکونت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ عمر سوچنے لگا کہ یہاں سے وادی میں اترنے کے لیے کوئی راستہ ضرور ہونا چاہیے۔

''ہمارے آقا پر سلامتی ہو.....!'' وہ ایک زبان ہو کر چلائے۔

حسن کی آواز ہنوز پہاڑیوں میں گونج رہی تھی اور وہ اس شان سے وہاں کھڑا تھا جیسے ایک پیغمبر ہو اور اپنے منتخب جاں نثاروں کو ایک موعودہ سرزمین کی طرف لے جانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہرا اور عمر کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا اسی درۂ کوہ میں واپس آ گیا جہاں سے وہ اس مقام پر پہنچا تھا۔

اپنے قلعے کے زیریں حصے کو پیچھے چھوڑتا ہوا، وہ تیزی سے بلندی کی جانب بڑھتا رہا اور اس کی چوٹی پر جا پہنچا۔ سورج پھر نظر آنے لگا۔ جب وہ ایک وسیع دمدمے پر پہنچے تو ہوا کے تیز جھونکوں سے ان کے قدم ڈگمگائے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ تین نوجوان فدائی جو وہاں پہرا دے رہے تھے اپنے ہتھیار الگ رکھ کر نماز پڑھنے میں مشغول تھے۔

تم نے آج سے پہلے کبھی کوئی معجزہ رونما ہوتے دیکھا ہے؟'' حسن نے عمر

کے کان میں کہا۔ ''لو دیکھو.....''

ان نوجوانوں پر جھک کر اس نے اپنا ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھا۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اپنے آقا کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہیں حسن کی آنکھوں پر جم گئیں۔

پھر اس کی آواز گونجی۔

''دیکھو۔ تمہارا وقت آ گیا ہے۔ جنت تمہارے انتظار میں ہے۔ میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ کود جاؤ۔''

آخری الفاظ سن کر جیسے ان میں بجلی کوند گئی۔ تین چھریرے جسم کپکپائے۔ اور تیزی سے جست لگا کر دمدمے کی دیوار پر چڑھ گئے۔ عمر نے دیکھا کہ ایک شخص کا چہرہ اشتیاق سے چمک اٹھا۔ اور دوسرا خوف کی شدت سے بھیانک ہو گیا۔

دو فدائی۔ دمدمے کی دیوار سے اک دم غائب ہو گئے۔ تیسرا آنکھیں بند کر کے آگے پیچھے جھولنے لگا۔

''تو بھی کود جا'' حسن نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے تنبیہہ کی۔

تیسرے پہرے دار نے بھی بالآخر خلا میں اس طرح چھلانگ لگائی۔ جیسے مجبوراً گر پڑا ہو۔ دمدمے کی دیوار پکڑ کر عمر نے نیچے جھانکا۔ وہ پہلے دو کے پیچھے تیزی سے لڑھکتا ہوا جا رہا تھا..... سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی تین گیندیں جیسے ڈھلوان چٹان پر اچھلیں اور پھر سینکڑوں فٹ نیچے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئیں۔

''تم نے دیکھا'' حسن نے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی تھی۔ ''میرے حکم کی تعمیل کس طرح کی جاتی ہے۔ کیا ملک شاہ کے احکام پر بھی اسی طرح عمل درآمد ہوتا ہے۔''

''میری نگاہوں کے سامنے تین جانیں خوامخواہ ضائع ہو گئیں۔''

''خوامخواہ نہیں۔ ثبوت کے طور پر..... تین جانوں کی حقیقت ہی کیا ہے؟ یہ سورج جو اس وقت غروب ہو رہا ہے۔ اس کے طلوع ہونے سے قبل ہزاروں انسان حشرات الارض کی طرح رینگتے ہوئے گوشہ گمنامی میں روپوش ہو جائیں گے اور ایسے ہی

دوسرے ہزاروں کیڑے غلاظت کے اس ڈھیر سے جسے تم دنیا کہتے ہو۔ ابل کر اوپر آجائیں گے۔"

حسن نے ٹھوکر مار کر قریب پڑے ہوئے بے کار نیزوں کو دمدمے کی دیوار سے ملا دیا۔ "تم نے ابھی میری طاقت اور اقتدار کی ایک جھلک، صرف ایک ہلکی سی جھلک دیکھی ہے۔ کیا تم میرے یار وفادار بن کر داعیوں کے زمرے میں شامل ہونا پسند کرو گے؟ تمہارا کام فلکیات اور ریاضی کی تحقیقات ہوگا۔ جیسا کہ اب ہے۔"

"یہاں۔ قلعہ الموت ہیں؟"

"نہیں۔ دنیا کے کسی حصے میں بھی۔ جہاں تم رہنا پسند کرو۔ تمہارے لیے ہر وہ چیز مہیا کی جائے گی جس کی تمہیں خواہش ہوگی..... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں..... اور وعدہ کر کے میں کبھی نہیں مکرتا..... دولت اور اعزاز جو تمہیں آج میسر ہے اس کے مقابلے میں بے حد حقیر ہے جو میری جانب سے پیش کیا جائے گا۔"

عمر نے جھک کر تاریک ہوتی ہوئی وادی پر نظر ڈالی۔ "اور اگر میں تمہاری تجویز قبول نہ کروں؟"

"تو میں تمہیں فی الحال نیشا پور واپس نہ جانے دوں گا۔ جب تک چند واقعات رونما نہ ہو جائیں تم یہاں اسی طرح آرام سے مقیم رہو گے۔ اس کے بعد اگر تمہارا جی چاہے گا تو تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت ہوگی۔"

لمحہ بھر سوچنے کے بعد عمر نے جواب دیا۔ "میں ایک ہفتے کے بعد سوچ کر جواب دوں گا۔"

"بہتر" حسن نے اطمینان محسوس کیا۔ "ایک ہفتے تک میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ اس دوران میں اس چار دیواری کے اندر میرے جتنے غلام موجود ہیں وہ ہر وقت تمہاری خدمت کے لیے حاضر رہیں گے۔"

بیسواں باب:

قلعہ الموت سے فرار

اپنے کمرے میں پہنچ کر عمر نے اطمینان کا سانس لیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تنہائی کی لذت کا احساس ہوا۔ حیرت میں ڈالنے والی بہت سی باتیں اسے معلوم ہو چکی تھی۔ وہ حسن کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا اور بڑے تعجب سے یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون سے ذرائع ہیں جنہیں کام میں لا کر اس نئے روحانی سلسلے کے رہنما نے دولت جمع کی ہے۔ حسن نے کچھ تجارتی کاروبار کا ذکر کیا تھا۔ اور یہ واقعہ تھا کہ اقرونوس ایک خارش زدہ دم توڑتے ہوئے اونٹ کو بھی کثیر منافع پر فروخت کر سکتا تھا۔ لیکن حسن کی دولتمندی کا کوئی اور راز ہونا چاہیے جو اس نے ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

امام غزالیؒ کا ایک مقولہ اس کے ذہن میں آیا۔ "خود پرستی کے مقابلے میں ہر چیز کی پرستش بہتر ہے۔"

اگرچہ انسانوں کی حیثیت درحقیقت ذہین جانوروں سے زیادہ کچھ نہیں ہے تو ان حالات میں جس کا نیا روحانی سلسلہ منطقی طور پر سب سے بہتر ہے..... لامحدود صلاحیتوں کا حامل ایک رہنما یکہ و تنہا لاتعداد متوازن دماغوں کے تفکر کی سمت متعین کرتا ہے۔

"بہر حال" عمر نے سوچا "افلاطون کی ریاست بھی احمقوں کی بستی ہی ہوتی جہاں مدرسوں کے بے شمار استاد انبساط کے فلسفے پر بحث مباحثہ کیا کرتے۔"

الموت میں قیام کرنا کچھ ایسا برا بھی نہ ہوگا جہاں زوئی جیسی زینت پہلو میں موجود ہو..... دوسرے خود یہ جگہ بڑی حد تک ایک ایسی رصد گاہ کے مانند ہے جہاں سے ساری دنیا نظر آتی ہے۔ یہاں اسے نظام الملک یا غزالی یا خود اپنے ضمیر سے الجھنا بھی نہ پڑے گا۔ بڑے سکون سے زندگی گزرے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے بہ شدت محسوس کیا کہ اس کا ضمیر حسن جیسے شخص سے وابستہ ہونے کی کبھی اجازت نہیں دے گا۔

عمر نے سوچا اگر وہ حسن کی ملازمت اختیار کر لے تو اپنے ذاتی تحقیقی کاموں کی تکمیل نہ کر سکے گا۔ اس نے چند ہی روز ہوئے کہ اپنے اس نظریے کی عملی تحقیق کا آغاز کیا تھا کہ کرۂ ارض خلا میں گردش کرتا رہتا ہے اور فضائے بسیط میں ساکن نہیں ہے۔

''میں سمجھتا ہوں حسن کسی قیمت پر مجھے یہاں سے نہ جانے دے گا۔ عمر کو یہ خیال کر کے بڑا لطف آیا۔ نہیں! نہیں!

قلعہ الموت کا چپہ چپہ دکھانے کے بعد وہ میرا یہاں سے جانا کسی طرح بھی گوارا نہ کرے گا۔ مجھے اب یہاں ایک قیدی کی حیثیت سے رہنا ہوگا۔ یہ تقریباً طے ہے..... چنانچہ ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی مجھے کسی نہ کسی ترکیب سے فرار ہونا پڑے گا۔

لیکن اس فیصلہ کے ساتھ اسے حسین زوئی یاد آ گئی اور اس کی جدائی کے خیال سے وہ کچھ افسردہ سا ہو گیا۔

عمر کو اس نامعلوم عرق کا خیال برابر پریشان کر رہا تھا جس کے پینے سے اس کے حواس کچھ عجب طرح منتشر ہو جاتے تھے اور ایک نیم خوابی کی سی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی تھی۔ شراب سے یہ اثر پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ وہ شراب کے اثرات سے خوب واقف تھا۔ وہ شے جس کے پینے سے اس کا دماغ تپنے لگتا تھا شراب سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ وہ اس پریشان کن عرق سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ کیونکہ حاضر دماغی کی اسے شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

عمر کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ نوعمر حبشی غلام پر خفگی کا اظہار کر کے اپنی

آرام گاہ میں انگیٹھی روشن کرنے کی ممانعت کر دے۔ لیکن اس نے یہ خدشہ محسوس کیا کہ اگر وہ اس تیز شراب کے پینے سے انکار کر دے جو اسے پیش کی جاتی تھی یا انگیٹھی سلگانا بند کرا دے تو وہ نامعلوم شے کسی اور طرح سے کھلائی یا پلائی جائے گی۔ چھپ کر اس کی نگرانی کرنے والوں کی اس بات کا یقین رہنا چاہیے کہ وہ بدستور مذکورہ عرق استعمال کر رہا ہے۔

عمر نے اس بات پر احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ شراب سے بھرے ہوئے پیالے جو صبح شام اس کے لیے لائے جاتے ہیں ناکافی ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ اس قیمتی شراب سے بھری ہوئی ایک بڑی صراحی ہر وقت اس کے قریب رکھی رہنی چاہیے۔ چنانچہ ایک بڑی صراحی فوراً حاضر کر دی گئی..... حسن بھی غالباً یہی چاہتا ہوگا کہ عمر اس عرق کو شراب سمجھ کر زیادہ سے زیادہ استعمال کرے..... عمر نے تجربے کے طور پر ایک پیالہ بھر کر پیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس کے پیتے ہی اس پر ویسی ہی مجہولیت طاری ہونے لگی جیسی پہلی دفعہ استعمال کرنے سے ہوئی تھی۔

''اور اب آئندہ'' اس نے صراحی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔'' ہر شب یہ وادی تجھ سے سیراب ہوا کرے گی۔''

جب رات کا ایک پہر گزر گیا اور حبشی غلام کمرے کے باہر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ عمر نے صراحی انڈیل کر ایک پیالہ بھرا اور بغیر چکھے ہوئے کھڑکی کے باہر ہاتھ بڑھا کر پھینک دیا۔ لیکن جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اسے مذکورہ مشروب کی طلب پیدا ہوئی جس کا وہ عادی ہو گیا تھا۔

قریب رکھی ہوئی صراحی سے نکل کر پھیلتی ہوئی خوشبو سے وہ بے قابو ہو گیا۔ وہ ایک دفعہ اٹھ کر صراحی تک گیا لیکن فوراً ہی اپنے بستر کی طرف پلٹ آیا۔ اس کی تشنگی بڑھنے لگی تھی اور اس کے بازوؤں میں ایک قسم کا تشنج محسوس ہو رہا تھا۔ دوسری رات کو بھی اسے حسب معمول خواہش پیدا ہوئی لیکن اس نے صراحی تک جانے کی کوشش سے احتراز کیا۔ چوتھی رات کو وہ بغیر کسی الجھن کے آرام سے سو گیا۔ البتہ کچھ دیر یہ ضرور سوچتا رہا کہ انسانی اعصاب پر اس عجیب و غریب عرق کا اثر کتنا شدید پڑتا ہے۔

اس دوران میں ستاروں کا مطالعہ کرنے کے بہانے ، اس نے الموت کی فصیل کا اس مقصد سے تفصیلی جائزہ لے لیا کہ آیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے وہ اسے عبور کر کے نیچے اتر سکے۔ اس نے قصے کہانیاں میں پڑھا تھا کہ وہ بالوں کی رسیاں بنا کر یا کمبلوں میں لپٹ کر اس قسم کی دیواروں سے نیچے پھسل جاتے تھے۔ لیکن اسے اندازہ ہوا کہ عملی طور پر ایسا کرنے کے مقابلے میں اس طرح کی کہانیاں تصنیف کرنا بہت آسان تھا۔

کئی دفعہ عمر ہمت کر کے نشیبی راستوں تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن آگ کے دروازے پر متعین مسلح پہرے داروں نے اسے ہر دفعہ آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پہرے دار بات بالکل نہ کرتے تھے کیونکہ وہ گونگے تھے۔ اس نے اس بات کی بھی تحقیق کر لی تھی کہ قلعے میں اسلحہ کا ذخیرہ بھی کہیں موجود نہ تھا۔ جو بلند قامت حبشی اور فدائی قلعے کی فصیل کی نگرانی کرتے تھے صرف ان کے پاس ہتھیار ہوتے تھے۔ اور جب ان کی چھٹی مل جاتی تھی تو وہ اپنے ہتھیار ساتھ لے جاتے تھے۔

فدائیوں کے رہائشی علاقے تک پہنچنا بھی ممکن نہ تھا۔ رہا ان سے بات چیت کر کے تعلقات پیدا کرنے کا سوال۔ سو وہ دیکھنے ہی میں چیتوں کی طرح خونخوار تھے ان سے گفتگو کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے علاوہ تین یا سات سات کی ٹولیوں میں وہ مختلف مقامات پر متعین تھے۔

''اس کا مطلب یہ ہے'' اس نے سوچا۔ ''کہ خواہ میں چار دیواری کے اندر چلوں پھروں یا باہر جانا چاہوں بہر حال مجھے ان پہرے داروں کے بیچ میں سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ اور باہر جانے کے لیے کسی نہ کسی دروازے سے گذرنا لازمی ہے۔''

صدر دروازہ رات کے وقت بند ہو جاتا تھا۔ ایک قندیل اس کے اوپر روشن کر دی جاتی تھی اور سات فدائی وہاں پہرا دیتے تھے۔ عمر نے صرف ایک مرتبہ رات کے وقت ایک شخص کو قلعے سے باہر جاتے دیکھا تھا اور وہ بھی چھوٹے بغلی دروازے سے جو وسیع صحن کے دوسرے کنارے پر تھا۔ وہ شخص ایک دراز قد داعی معلوم ہوتا تھا اس نے تین پہرے داروں کو جو وہاں متعین تھے، ایک تحریر دکھائی تھی تب انہوں نے اس

دروازے کا قفل کھولا تھا۔

دن چھپنے کے بعد جب عمر اپنی قیام گاہ سے باہر جاتا تو غلام گردش کے نگراں اس پر نظر رکھتے تھے۔ یہ بات اس کے علم میں تھی۔ لہٰذا رات کے وقت چھپ کر بھاگنا بھی محال تھا۔

''تو پھر دن کے وقت صدر دروازے کے رستے ہی فرار ہونا چاہیے۔'' عمر نے اپنے دل میں یہ قطعی فیصلہ کر لیا۔ (بغلی دروازے میں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک قفل پڑا رہتا تھا)

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد عمر نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ دن بھر ایک کھلی چھت پر بیٹھا بظاہر اونگھتا رہتا لیکن بیشتر وقت وہ دروازے کی طرف غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ اور فرار ہونے کی کوئی امید افزا صورت اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کسی غیر آدمی یا گھوڑے کو دروازے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب دیہاتی اجناس یا دوسری اشیاء لاتے تو دروازے پر پہرا دینے والے فدائیوں کے سپرد کر دیتے، وہ سامان قلعے کے اندر پہنچانا فدائیوں کا کام تھا۔ اکثر اوقات فدائیوں کے مسلح دستے قلعے کے نشیبی تہ خانوں سے نکل کر اوپر کے صحن میں آتے دکھائی دیتے اور خاموشی سے دروازے کے باہر چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایک یا دو ایسے داعی آتے جاتے نظر آ جاتے جو کسی خاص کام سے قلعہ الموت سے باہر جاتے یا باہر سے اطلاعیں لے کر قلعے میں آتے تھے۔ لیکن حسن کو کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

اس کے باوجود شیخ الجبل ہر روز صدر دروازے سے گزرتا تھا لیکن کوئی شخص اسے پہچان نہ سکتا تھا۔ اگر عمر نے ہر آنے جانے والے کا غور سے جائزہ نہ لیا ہوتا تو اسے بھی اس بات کا پتہ نہ چل سکتا۔

عمر نے دیکھا کہ وہی طویل القامت داعی جسے اس نے رات کے وقت بغلی دروازے سے جاتے دیکھا تھا متواتر تین روز سے دوپہر ڈھلے، سخت گرمی اور تیز دھوپ میں، صدر دروازے سے تنہا باہر جاتا تھا اور تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد واپس آ کر صحن عبور کر کے قلعے کی عمارت میں غائب ہو جاتا تھا۔ اس کی اس جانب آمد و رفت کچھ زیادہ

بڑھ گئی۔ ایک دفعہ جب اس شخص نے دروازہ کھولنے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو عمر نے فوراً پہچان لیا کہ داعی کے بھیس میں خود حسن باہر آتا جاتا ہے۔ اس دوران میں حسن ہمیشہ اپنی نگاہیں نیچی رکھتا اپنے ہاتھ عموماً آستینوں میں چھپائے رہتا۔ اور اپنے چہرے کے خدوخال چینیوں کے سے بنا لیتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چینی نژاد ظاہر کرنے کے لیے کندھے جھکا کر چلتا تھا۔ مزید برآں اس نے اپنے سر کے چمکتے ہوئے بال پیچھے کی طرف سمیٹ کر ان میں چینیوں کی طرح گرہ بھی لگا رکھی تھی باوجودیکہ وہ بظاہر اپنی ہیئت تبدیل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن عمر کی نگاہوں سے وہ اپنے ہاتھ نہ چھپا سکا۔

عمر کو اس بات پر بڑا تعجب تھا کہ آخر حسن اپنے ہی قلعے کے دروازے سے بھیس بدل کر کیوں آتا جاتا ہے۔ اور وہ بھی ایک مقررہ وقت پر؟

ان سوالوں کا جواب بھی عمر کے سمجھ میں فوراً ہی آ گیا۔ رفیقوں نے اسے بتایا تھا کہ شیخ الجبل کو کسی نے کبھی قلعے سے باہر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ دراصل حسن اپنے معتقدین پر اپنی فوق الفطرت قوت کا سکہ بٹھانا چاہتا تھا۔ خود حسن نے بھی اتفاقاً اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ پیامبر کبوتر ایک قریبی گاؤں میں رکھے جاتے تھے اور وہ الموت کے باشندوں پر یہ راز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ خبریں کس طرح بھیجتا اور منگواتا ہے۔ لہٰذا وہ روزانہ دوپہر کے وقت چھپ کر گاؤں میں کبوتروں کے اڈے پر جاتا تھا۔

اس طرح وہ فدائیوں اور عام آدمیوں کو ایک داعی نظر آتا تھا۔ اور..... عمر یہ سوچ کر مسکرایا..... داعی اس وقت یا تو سوئے ہوتے تھے یا قلعے کے تہ خانوں میں کام کر رہے ہوتے تھے۔ لیکن اگر اتفاق سے وہ حسن کو اس وقت دیکھ بھی لیں تو زیادہ سے زیادہ یہی سمجھیں گے کہ باہر سے کوئی نیا داعی وارد ہوا ہے۔

عمر نے ان زائچوں کی مدد سے، جو اس نے الموت کے قیام میں صاف نظر نہ آنے والے ستاروں کو دیکھ کر ترتیب دیئے تھے حسن کے اس رویے سے چند نتائج بھی اخذ کیے تھے۔ بہر حال اس نے سوچا کہ سارے داعی نہ تو آپس میں صورت شناس ہو

سکتے ہیں اور نہ آواز سے ہی ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں۔

''لہٰذا فرار ہونے کا موقع صرف اس طرح مل سکتا ہے۔'' اس نے ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکالا۔ ''کہ حسن کے نقش قدم پر چل کر ایک داعی کے بھیس میں دروازہ عبور کیا جائے۔''

دوسرے دن دوپہر کو عمر نے داعیوں کا لباس حاصل کرنے کی ایک ترکیب سوچی۔ رکن الدین کئی دفعہ جنت کی شراب کا تذکرہ کر چکا تھا۔ عمر کو یاد تھا کہ رکن الدین تلواروں کے رقص والے دن کس قدر اشتیاق سے شراب کا بھرا ہوا پیالہ غٹ غٹ پی گیا تھا۔ اور پھر حسن کا یہ قول بھی اس کے ذہن سے محو نہ ہوا تھا کہ ''میں نے اپنے عالموں اور سائنس دانوں پر جنت کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونا ممنوع قرار دے رکھا ہے!'' یہ سوچ کر عمر نے رکن الدین کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور اندر سے دروازہ اچھی طرح بند کر لیا۔

اس نے لاابالی انداز سے شراب کی صراحی اٹھا کر پیالہ بھرا اور اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے پستہ قد فلسفی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''جنت کی شراب۔''

رکن الدین بیتاب ہو کر صراحی کے قریب کھسک آیا اور اسے بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کیا یہ..... واقعی وہی ہے؟''

عمر نے پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''خود پی کر دیکھ لو۔''

دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے رکن الدین نے ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر دیا۔ مسرور ہو کر ایک گہرا سانس لیا اور اس کے موٹے موٹے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ بڑی حسرت سے اس نے پیالہ نیچے رکھا۔

''صراحی میں ابھی کافی شراب ہے۔'' عمر نے بڑی لاپروائی سے کہا۔ ''جی چاہے تو اور پی لو۔''

تیسرا پیالہ ابھی آدھا ہی پیا تھا کہ ٹھگنے آدمی پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ وہ

Pakistanipoint
Waqar Azeem

چاروں شانے چت گدے پر لیٹ گیا۔ پپوٹے نشے سے بوجھل ہو گئے۔ گفتگو میں بے ربطی پیدا ہو گئی۔ عمر قریب بیٹھا، کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے بڑے پرسکون لہجے میں رکن الدین سے اس طرح سوال کیا، جیسے وہ اس مسئلے پر دیر سے گفتگو کر رہے ہوں۔

''حسن کے پاس جو بے اندازہ دولت ہے، جو غیر معمولی قوت و اقتدار اسے حاصل ہے۔ یہ سب کچھ کہاں سے اور کیسے آیا ہے؟''

''خوف کے ذریعے۔ اس خنجر کے ڈر سے جو قتل کرتا بھی ہے اور نہیں بھی کرتا۔ اس نے ہمیں سمجھایا ہے کہ انسان معلوم کے مقابلے نامعلوم وجود سے زیادہ ڈرتا ہے۔ علی ہذا القیاس اس کے قبضے میں ایک پوشیدہ.....

رکن الدین ایک دفعہ پھر اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھا اور پیالے کی باقی شراب بھی جلدی جلدی اپنے حلق میں انڈیل لی..... منہ ہی منہ میں وہ کچھ بڑبڑایا اور پھر بے سدھ ہو گیا۔

عمر نے اپنے کپڑے اتارے اور ان کے بجائے بے ہوش رکن الدین کا سرخ ساٹن کا خلعت پہن کر اس کی مخمل کی چوگوشیا ٹوپی اوڑھ لی۔ حالانکہ خلعت قدرے چھوٹا تھا لیکن ڈھیلی ڈھالی آستینوں اور پھیلے ہوئے دامن سے کام چل گیا۔ اس نے اپنے سفری جوتے اتار کر رکن الدین کے چھوٹی ایڑی کے بوٹ بھی پہن لیے جو اس کے پاؤں میں ٹھیک آ گئے۔

کھڑکی کے باہر نظر دوڑا کر عمر نے اندازہ لگایا کہ ابھی شام ہونے میں دیر ہے۔ یقیناً حسن گاؤں سے واپس آ چکا ہو گا۔

بخارا کے گھوڑوں کے تاجر کا سا لمبا چوڑا لباس جو اس نے اتار ڈالا تھا رکن الدین کے جسم پر ڈال دیا تا کہ اگر کوئی اندر جھانکے تو سمجھے، عمر خود لیٹا ہوا ہے۔ اپنے ہاتھ آستینوں میں چھپا کر وہ غلام گردش میں نکل آیا۔ اسے کہیں دور سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی لیکن اس وقت غلام گردش میں کوئی نہ تھا۔

تیز تیز قدم اٹھاتا عمر صحن میں کھلنے والے دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی

رفتار سست کر دی اور گردن جھکا کر چلنے لگا۔ دستار کے بغیر اسے پنا سر کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ سنگ سفید کے صحن کی چمک سے اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

صراحیاں اٹھائے دو غلام اس کے قریب سے گزر گئے۔ اب دروازہ اس کے سامنے تھا جہاں سوائے پہرے داروں کے اور کوئی نہ تھا۔ جیسے جیسے وہ دروازے کے قریب آتا جا رہا تھا اس کے دل کی حرکت تیز ہوتی جا رہی تھی۔

فدائیوں کا سالار جس کے کمر میں تلوار لٹکی ہوئی تھی کبھی کبھی نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیتا تھا۔ کسی نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ دیواروں سے گرمی نکل کر ہوا میں گھل رہی تھی۔ صرف چار قدم اور چل کر وہ دروازے تک پہنچ جائے گا۔ عمر نے سوچا۔ ایک..... دو..... تین..... چار.....

''راہداری کا لفظ۔؟'' پہرے داروں کے سالار نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

عمر جیسے دم بخود رہ گیا۔ اس نے نہ تو پہلے سنا تھا اور نہ یہ سوچا تھا کہ شناختی لفظ (کوڈ ورڈ) کی بھی ضرورت ہو گی۔ اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ''مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ سیدنا نے مجھے خود بھیجا ہے.....'' معقول وجہ بتانے کے لیے اس نے دماغ پر زور دیا۔ ''گاؤں جانے کے لیے..... کبوتر کے ذریعے پیغام بھجوانا ہے۔''

ساٹن کی عبا کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے اپنی پیٹی سے چاندی کی وہ نلکی نکالی جو حسن کبوتروں کے ذریعے پیغام رسانی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ''یہ دیکھو مجھے بہت جلد جانے کا حکم ہے۔''

سائے میں کھڑے ہوئے پہرے داروں نے تجسس آمیز نگاہوں سے عمر کو دیکھا ان کا سردار خائف ہو گیا۔ اسے تو محض ہتھیار استعمال کرنے کی تربیت ملی تھی۔ عقل سے کام لینا اس کی بساط سے باہر تھا۔ عمر نے جلدی سے نلکی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''تو ذرا اسے اپنے پاس رکھ! میں ابھی گاؤں سے کبوتر لے کے آیا۔ لیکن سمجھ لے اس میں جو پیغام بند ہے وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ ورنہ یاد رکھ! آقا کا غضب تجھ پر نازل ہونا یقینی ہے۔''

پہرے داروں کے سردار نے نلکی کو مضبوطی سے مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔ ''یا

اللہ! لیکن آقا جلدی کرنا!''

پہرے داروں کو اپنی واپسی کا یقین دلانے کے بعد، عمر نے دروازے سے نکل کر سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ قلعے کی فصیل سے اس نے گاؤں کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ البتہ اسے یہ معلوم تھا کہ وہاں گھوڑے بھی رکھے جاتے تھے اور مختلف سمتوں سے آنے والے کارواں وہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں اقرونوس سے ملاقات نہ ہو جائے۔ یا کسی ایسے شخص کی اس پر نظر نہ پڑ جائے جو اسے پہچانتا ہو۔

گھاس کے انباروں اور کھاد کے ڈھیروں سے گزرتا ہوا وہ کبوتر خانے کی طرف بڑھتا رہا جس کے اوپر کبوتر تاوے کاٹ رہے تھے۔ اس نے سڑک کے کنارے درختوں کے سائے میں کچھ مزارعوں اور اجنبی قبائلیوں کو بیٹھے دیکھا، کہ کبوتر خانے کے صحن میں داخل ہو کر اسے جو شخص سب سے پہلے ملا عمر نے اس سے چلا کر کہا۔

''ایک پنجرے میں دو کبوتر بند کر کے جلدی لاؤ۔''

''خوب! کیا تو، وہ کبوتر طلب کر رہا ہے جنہیں آقا استعمال کرتا ہے یا.....''

''ہاں ہاں! وہی کبوتر۔ شیخ الجبل کا حکم ہے۔''

وہ عمر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ شاید اس سے قبل حسن نے کبھی کسی کے ذریعے کبوتر نہ منگوائے ہوں گے یا پھر اس کا نام سن کر وہ کچھ بدحواس سا ہو گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا، بید کی لکڑی سے بنے ہوئے پنجروں کے ڈھیر کی طرف چلا۔

''اور اصطبل سے ایک گھوڑا زین کسوا کر فوراً منگواؤ۔ گھوڑا بہت عمدہ ہونا چاہیے۔'' عمر نے عجلت آمیز لہجے میں اس جاتے ہوئے آدمی کو ہدایت دی۔ ''گھوڑا لانے کے لیے کسی اور آدمی کو بھیجو۔''

عمر نے بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ کبوتروں کے نگراں نے سڑک کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے اعلان کیا کہ ایک سرخ پوش آقا قلعے سے وارد ہوا ہے اور اسے فوراً ایک تیز رفتار گھوڑا چاہیے۔ خدا کے لیے جلدی کرو ورنہ ضرور ہم پر کوئی شدید مصیبت نازل ہو جائے گی۔ سڑک کے کنارے اونگھتے ہوئے لوگ احاطے

کے دروازے پر جمع ہو کر اندر جھانکنے لگے۔ کبوتروں کا نگراں ایک ہاتھ میں کبوتروں کا پنجرا لٹکائے اور دوسرے ہاتھ میں زین سے پنجرا باندھنے کے لیے رسی لیے بھاگم بھاگ عمر کے پاس آیا۔

عالیجاہ! لیجئے یہ حاضر ہے۔ دیکھئے بازو کے اندر کی طرف یہ پر چوکور کترا ہوا ہے اور دم پر سرخ روشنائی سے یہ دائرہ بنا ہوا ہے۔ ان نشانات کی وجہ سے یہ کبوتر دوسرے کبوتروں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اور اگر آقا.....

اتنے میں گھوڑا پہنچ گیا۔ اور عمر بات ادھوری چھوڑ کر جلدی سے اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے جھک کر کبوتروں کا پنجرا زمین سے اٹھایا اور کسی قسم کے رخصتی کلمات کہے بغیر لگام کھینچ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا احاطے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

بڑی شاہراہ پر پہنچ کر وہ دائیں ہاتھ مڑ گیا تا کہ دریا اس کے راستے میں حائل نہ ہو۔ وہ اقرونوس کے ہمراہ دریا عبور کر کے آیا تھا جہاں اس نے محسوس کیا تھا کہ پہرا لگا ہے۔ اسے اس کا قطعی علم نہ تھا کہ دوسری سڑکیں کس طرف جاتی ہیں البتہ یہ یقین تھا کہ ہر شاہراہ خواہ وہ کہیں جاتی ہو اسے الموت سے دور لے جانے میں ضرور مدد کرے گی۔ اور وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ دن چھپنے سے پہلے اپنے اور حسن کے درمیان زیادہ سے زیادہ طویل فاصلہ حائل کر لے۔

جب وہ ایک ایسی شاہراہ پر مڑا جس پر کارواں کے نشانات دور تک صاف نظر آ رہے تھے اور ایک تنگ وادی سے ہوتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اچانک چند آدمی ہاتھوں میں نیزے لیے ایک غار سے نمودار ہوئے۔ عمر کے لباس اور گھوڑے کو غور سے دیکھنے کے بعد سب نے ''خدا حافظ'' کا نعرہ لگایا۔ ''خدا تمہارا بھی حافظ و ناصر ہو۔''

جیسے ہی وہ سرحدی چوکی نظروں سے اوجھل ہوئی عمر نے چابک مار کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا جو اونچی نیچی پہاڑیوں کو پھلانگتا اور تن آور چیڑ کے گھنے جنگل میں طرارے بھرتا ہوا دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ عمر نے یکا یک ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

الموت کے دروازے پر عمر نے جو چاندی کی نلکی پہرے داروں کے سالار کو

دی تھی اس کے اندر یہ پیغام تھا ''عمر خیام رے کی جانب سفر کر رہا ہے۔''

شام ہوتے ہوتے، پسینے میں شرابور۔ لنگڑاتے ہوئے گھوڑے پر سوار اس نے آخری پہاڑی عبور کر لی اور وسیع میدانی علاقے میں داخل ہو گیا۔ دھندلاتے ہوئے اجالے میں اس نے سامنے نظر ڈالی تو اسے شاہراہ ایک سفید فیتے کی طرح دکھائی دی جو ایک شکستہ مقبرے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس مقبرے کے قریب ہی کھیتوں میں بنی ہوئی جھونپڑیوں کے دروازوں سے جھانکتی ہوئی چراغوں کی روشنیاں بڑھتے ہوئے اندھیرے پر چشم نمائی کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں الاؤ بھی روشن تھے۔

پہلے الاؤ کے قریب گھوڑے سے اتر کر اس نے گاؤں کے مکھیا کو طلب کیا اور ایک تازہ دم گھوڑا لانے کا حکم دیا۔ ''میں شیخ الجبل کے کام سے سفر کر رہا ہوں۔'' عمر نے یہ بات اس خیال کے تحت کہی کہ وہ گاؤں کوہستانی سڑک کے اختتام پر واقع تھا اور وہاں کے باشندے اس سے قبل بھی حسن کے آدمیوں کی خدمت ضرور بجا لاتے ہوں گے۔

''کون شیخ الجبل'' بوڑھے کسان نے عمر سے سوال کیا۔ ''وہی جو پہاڑ کی بلندیوں پر رہتا ہے؟''

''ہاں قلعہ الموت میں۔''

ایک دوسرے سے سرگوشی میں بات کرنے کے بعد چند کسان عمر کے گھوڑے کو ساتھ لیے۔ الاؤ چھوڑ کر چلے گئے۔ اب خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی بچی کسی طرف سے وہاں آنکلی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ عمر نے اس کی موجودگی کا کوئی خیال نہیں کیا تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کبوتروں کے پنجرے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے پنجرے میں اپنی انگلی ڈال کر کبوتروں کے پروں کو چھوا۔

عمر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس قدر تھک گیا تھا کہ بھوک پیاس کا احساس بھی نہ کر سکتا تھا۔ ہر چند وہ الموت سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ آیا وہ حسن کے خدام کی گرفت سے بچ نکلنے میں بھی کامیاب ہو سکے گا یا نہیں؟

''ان کبوتروں کو تم نے اس پنجرے میں کس طرح بند کر لیا؟'' بچی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

جب عمر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ کبوتروں کو چھوڑ کر چلی جائے۔ ''میں انہیں اکثر ہوا میں اڑتے دیکھتی ہوں۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''کبھی کبھی یہ اتر کر پیڑوں پر بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اور جب میں قریب پہنچتی ہوں تو پھر سے اڑ جاتے ہیں۔''

''وہ کھیتوں میں اتر کر دانہ بھی چگتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے وہ کچھ دیر میرے ساتھ کھیلیں لیکن ذرا کی ذرا ٹھہر کر اڑ جاتے ہیں اور میں انہیں دیکھتی رہ جاتی ہوں۔''

عمر نے بچی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم چاہتی ہو کہ کبوتر اتر کر تمہارے پاس آ جائیں اور بے کھٹکے تمہارے چاروں طرف زمین پر پھدکتے پھریں؟''

''ہاں! یہی تو میں چاہتی ہوں۔'' اس نے خوش ہو کر ہلکے سے تالی بجاتے ہوئے جواب دیا۔

عمر نے جھک کر اپنے قدموں کے نیچے سے تھوڑی سی گیلی مٹی اٹھا لی۔ قریب ہی ایک تالاب تھا اور ان چوپایوں کی آمدورفت سے جو تالاب کے کنارے پانی پینے آتے تھے آس پاس کی مٹی گیلی ہی رہتی تھی۔ تھوڑی سی مٹی اور لے کر عمر نے لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر جمائی اور مٹی کو دبا کر ایک کبوتر کا پتلا بنایا۔ بچی پاس آ کر بیٹھ گئی اور بڑی دلچسپی سے مٹی کا کبوتر بنتے دیکھتی رہی۔ عمر نے لکڑی کی دو تیلیاں اس مٹی کے پتلے میں لگا کر گویا کبوتر کے پاؤں بنا دیئے اور اسے زمین پر کھڑا کر دیا۔ ''اب تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔'' اس نے بچی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ کل دھوپ میں سوکھ جائے تو اسے کہیں پانی کے قریب رکھ دینا۔ ہوا میں اڑتے ہوئے کبوتر جب تمہارے اس کبوتر کو دیکھیں گے تو ضرور اتر کر اس کے پاس آ جائیں گے۔ مگر دیکھو۔ تم چپ چاپ انہیں دیکھتی رہنا۔ ان کے پیچھے دوڑنا مت۔''

ارے واہ! یہ تو سچ مچ کا کبوتر معلوم ہوتا ہے۔'' بچی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

جب کسان تازہ دم گھوڑا لے کر اس کے پاس پہنچے تو عمر نے اندازہ لگایا کہ وہ دیہاتی قسم کا گھوڑا نہ تھا۔ اس نے انگڑائی لی اور کبوتروں کا پنجرا اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا وہ جلد آئے گا۔'' نمبردار نے رازدارانہ لہجے میں عمر سے پوچھا ''یعنی وہ دن جس کے ہم منتظر ہیں؟''

''نمی دانم۔ خدا می داند۔'' (میں نہیں جانتا۔ خدا ہی جانتا ہے)

''عمر تمام رات سفر کرتا رہا۔ جب وہ ایک شہر کی فصیل کے پاس پہنچا تو پہچان گیا کہ وہ قزوین کی شہر پناہ ہے اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ شہر پناہ کے اس پار خراسان جانے والی عظیم شاہراہ حد نظر تک سیدھی چلی گئی تھی۔ وہ پھر اس سڑک پر ہو لیا کیونکہ اسے خیال تھا کہ شاید الموت کے مخبر اس کی تلاش میں اس وقت تک قزوین پہنچ چکے ہوں گے۔

جب سورج کی کرنوں نے بلند قامت پہاڑوں کو چوٹیوں کی بوسہ دیا اور تاریکی کا پردہ چاک کر کے بھوری پہاڑیوں نے سر اٹھایا تو ایک ناقابل برداشت غنودگی عمر پر غالب آنے لگی۔ وہ زین کا ہتا پکڑ کر اونگھنے لگا۔ تھکے ہوئے گھوڑے کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ عمر کو یقین تھا کہ وہ رے کی سمت سفر کر رہا ہے۔ خراساں کی طویل شاہراہ پر۔ جس پر اس نے رحیم کے ہمراہ سفر کیا تھا۔ جس پر چل کر انسان کسی منزل پر نہیں پہنچتا۔ وہ مٹی کے کبوتر ہی تو ہیں جو ریتیلے میدانوں میں چلتے پھرتے ہیں..... اس غنودگی کے عالم میں عمر کے دماغ میں بے ربط خیالات آ رہے تھے..... آخر یہ معصوم بچے معجزوں، فوق الفطرت باتوں کو اتنی آسانی سے کیوں قبول کر لیتے ہیں۔ شاید ان کے بڑے بوڑھے جن کی دماغی صلاحیتیں کمزور پڑ چکی ہیں انہیں شکی بناتے ہیں۔ ان میں سوءظن پیدا کر دیتے ہیں۔ اس نے محسوس کیا جیسے مٹی کے بنے ہوئے کبوتر تنبیہی پیغامات لیے ہوا میں ادھر ادھر اڑ رہے ہیں۔ ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اسے اپنے قریب گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور جب ایک آواز نے اسے عربی میں مخاطب کیا تو وہ ایک دم چوکنا ہو گیا۔

''کون ہو تم؟''

سورج کی بھرپور روشنی میں گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھا۔ ڈھیلی ڈھالی عبائیں پہنے اور سروں پر کساوے باندھے، سواروں کی ٹولیاں عمر کے قریب سے گزرنے لگیں۔ کبھی کبھی کچھ لوگ رک کر اسے غور سے دیکھنے لگتے تھے۔ عمر نے بھی اپنے گرد آلود ساٹن کے لباس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔

''میں ایک مسافر ہوں'' اس نے جواب دیا۔ ''میں ان فلک بوس پہاڑوں سے آ رہا ہوں'' عمر نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا..... اور عظیم المرتبت سلطان ملک شاہ کی بارگاہ تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔''

''حضور! آپ؟'' ایک جانی پہچانی آواز فضا میں گونجی۔ ایک کبڑا اپنے گھوڑے کی پشت سے کود کر عمر کی طرف دوڑا اور اس کی رکاب تھام لی۔ جوش مسرت سے کبڑے کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''کیا آپ اپنے غلام جعفرک کو بھول گئے؟''

''لیکن'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جعفرک تجھے قصر کو چک میں ہونا چاہیے تھا۔''

''نہیں'' مسخرے نے قہقہہ لگایا۔ ''فوج واپس آ گئی۔ ملک شاہ کی سوار فوج سمرقند سے واپس آ گئی۔ میں بھی ان کے ہمراہ چل پڑا تا کہ رے پہنچ کر آپ کو تلاش کروں۔''

چلتے چلتے ایک اونٹ رکا اور لڑکھڑاتا ہوا بیٹھ گیا۔ محمل کا پردہ ہٹا کر ایک عورت زمین پر کود پڑی۔ اور سواروں کے درمیان دوڑتی ہوئی عمر کی طرف بڑھی۔

''میرے آقا'' عائشہ چلائی۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو تمام آفتوں سے محفوظ رکھا۔ شہر رے کے بازاروں میں..... آپ کے محافظ دستے کے بیوقوف شمشیر برداروں نے بتایا۔ کہ آپ کو جنات اڑا کر لے گئے تھے۔'' اس نے عمر کی رکاب مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے آپ کی شکل بھی بدل ڈالی ہے۔ یہ آپکی داڑھی کو کیا ہوا؟''

''آقا!'' اسحاق دربان نے احتراماً زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ مگر یہ لڑکی بھلا قصر میں کب ٹکنے والی تھی۔

جعفرک سے ساز باز کر کے آپ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر سڑکوں پر بے نقاب ماری ماری پھر رہی ہے۔

میرے ضمیر نے مجھے پکارا: ''اے اسحاق! اپنے آقا کی ناموس کی حفاظت تیرا فرض ہے۔'' وہ رے پہنچ کر سکون سے نہ بیٹھی۔ اس عرب دستے کے کمان دار کے پاس گئی۔ آپ کی گم شدگی کا حال بتایا۔ پھر وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا..... خدا ہمارے سلطان پر اپنی برکتیں نازل فرمائے..... سلطان نے حکم دیا۔ عمر خیام کو تلاش کیا جائے۔ وہ کہیں بھی ملے۔ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر یا سمندروں کی طوفانی سطح پر.....''

''بکواس بند کر۔ خوشامدی کتے'' عائشہ نے جھلا کر اسحاق کو ڈانٹا۔ عمر کی بازیافت پر عائشہ اس قدر جذباتی ہوگئی تھی کہ عرب سواروں کے درمیان اسے اپنے بے پردہ ہونے کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ عرب سوار خود ہی اس کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گئے تھے..... ''کمبخت اس میں تیری کوششوں کو کیا دخل ہے کہ میرا آقا صحیح سلامت مجھے مل گیا ہے۔ اگر میں یہ سب کچھ نہ کرتی تو قصر کوچک کے دروازے پر بیٹھا تو آج تک ناک صاف کرتا رہتا اور اس جاسوس خواجہ سرا سے رشوت میں سونا وصول کر کے اپنی جیبیں بھرتا رہتا.....''

''خاموش!'' عمر نے درشت لہجے میں کہا۔ سوار دستے کا افسر اس کی طرف آرہا تھا۔

عائشہ نے بھی فوراً اپنے چہرے پر نقاب درست کر لیا۔ نوجوان افسر نے عمر کے سامنے پہنچ کر اپنا بایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے جھک کر اسے سلام کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ عمر کے لباس کی انوکھی وضع کو متجسس نگاہوں سے بھی دیکھتا رہا۔

''مجھے صحیح صحیح بتاؤ'' اس نے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی تم سلطان کے منجم ہو؟''

''بے شک'' عمر نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔ مگر یہ بھی سوچنے لگا کہ اپنی موجودہ ہیئت کذائی کا کیا جواز پیش کر سکتا ہے..... ''میں وہاں۔ اوپر کوہساروں میں جادوگروں سے جنگ کر رہا تھا اور انہی کے لباس میں وہاں سے بھاگ کر آرہا ہوں۔''

''واللہ! آج کل کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔''

عرب افسر کی حیرت ایک پوشیدہ خطرے میں تبدیل ہوتی نظر آئی۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''اب میں سلطان کے حکم سے آپ کو آگاہ کرتا ہوں۔ آپ کو میرے ہمراہ براہ راست بارگاہ سلطانی میں حاضر ہونا ہے۔''

''سلطان کا حکم سر آنکھوں پر۔'' عمر چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ نیشاپور اپنی رصدگاہ میں پہنچ جائے۔ ''آجکل سلطان کا پڑاؤ کہاں ہے؟ سردار!''

ظل الٰہی اصفہان کی سمت سفر فرما رہے ہیں ہمیں بھی اسی طرف جانا ہے۔''

جب وہ عائشہ کے اصرار اور اپنی نیند کی شدت سے مجبور ہو کر محمل میں سوار ہو گیا تو عرب دوشیزہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''دیکھا! سفر ایسے ہوتا ہے۔ ایک ہزار تیغ زن آپ کے جلو میں چل رہے ہیں اور سلطان کی لامحدود عنایات آپ کا انتظار کر رہی ہیں..... ان کوہستانی جادوگروں کے یہاں کچھ عورتیں بھی ضرور ہوں گی؟''

عمر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ''ہاں۔ پرستان کی ایک دوشیزہ وہاں تھی۔ جو جنت کی نہر میں تیرتی ہوئی کشتی پر بیٹھی رو رہی تھی۔''

''جنت! کیا آپ اس دنیا کو چھوڑ کر اس جنت میں چلے گئے جہاں حوریں ہوتی ہیں؟''

وہ ایک خواب تھا۔ عائشہ! درحقیقت اصلی جنت تو زندگی کے راستے میں ایک لمحہ آرام کر لینے کے مترادف ہوگی۔''

عائشہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر اس نے اپنے بازو عمر کی گردن میں حمائل کر دیئے اور اپنے ہونٹ اس کے کان سے ملا کر اسے بتایا: نظام الملک کو سلطان نے برخاست کر دیا ہے اور اسی وجہ سے آپ کو طلب کیا گیا ہے۔''

عمر کو شبہ ہوا کہ شاید وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔ نظام الملک جو دو نسلوں سے مسلسل سلجوقی سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک رہا ہے برخاست کر دیا گیا۔ یہ

کیسے ممکن ہے؟''

''ایک خط کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔'' عائشہ نے عمر کے تذبذب کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ نظام الملک کس قدر طاقتور ہو گیا تھا۔ اس کے پوتے تک صوبوں کے گورنر بنے بیٹھے تھے۔ بہر حال! کسی شخص نے سلطان کو ایک خط میں لکھا کہ نظام الملک وزیر سلطنت ہے یا تخت سلطنت کا حصے دار اور ملک شاہ نے ایک روز مغلوب الغضب ہو کر نظام الملک سے کہا کہ میں صاحب تاج و سریر ہوں اور آج سے بغیر تیری مدد کے براہ راست اور بذات خود حکومت کا انتظام کروں گا۔

عمر بڑی محویت سے عائشہ کی باتیں سن رہا تھا اسے نظام الملک سے اپنی آخری ملاقات کا خیال آ گیا۔ کاش! اس نے نظام الملک کے حکم کی تعمیل میں ملک شاہ کو مطلع کر دیا ہوتا کہ سلطان کے خراسان کی طرف واپس آنے سے ازروئے نجوم ناخوشگوار واقعات رونما ہونے کا اندیشہ ہے۔ تو بوڑھے وزیر کو یہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

''اور وہ خط'' عائشہ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک کبوتر لایا تھا۔ دور افتادہ فلک بوس پہاڑوں سے۔''

عمر یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ جب وہ خراسان جانے والی سڑک پر ایک فصیل والے شہر میں آرام کرنے کے لیے ٹھہرے تو عمر محمل سے باہر آیا اور اسحاق دربان کو حکم دیا کہ وہ اس چوبی پنجرے میں سے جو اس کی تحویل میں تھا ایک کبوتر نکال لائے۔ جب کاغذ، قلم دوات اور ایک چھوٹی نلکی جو کبوتروں کے ذریعے پیغام رسانی کے لیے استعمال ہوتی تھی، مہیا ہو گئے تو عمر نے کاغذ کے ایک پرزے پر حسب ذیل عبارت لکھی:

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا راستہ الگ ہے اور تیرا راستہ الگ۔

لیکن جو کچھ میں نے تیرے یہاں رہ کر دیکھا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک مجھے یا میرے متعلقین کو تیری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ میں اس کا تذکرہ کسی سے نہ کروں گا۔''

بغیر القاب و آداب لکھے اور بغیر دستخط کیے اس نے کاغذ کا یہ پرزہ لپیٹ کر نلکی میں رکھ دیا اور نلکی کبوتر کے پنجے میں باندھ دی۔ اس امر کا یقین کرنے کے لیے کہ وہ پرندہ الموت ہی کا ہے کٹے ہوئے پر اور دم پر سرخ نشان کا بھی ایک مرتبہ جائزہ لیا۔ جب کبوتر کو ہوا میں اچھالا گیا اس نے پہلے شہر کا تاوا کاٹا اور پھر شمال کی طرف پہاڑوں کا رخ کر کے تیزی سے افق میں غائب ہو گیا۔

عائشہ اور اسحاق جو اس کام میں عمر کے شریک تھے حیرت زدہ ہو کہ برابر عمر کی حرکتوں کو دیکھتے رہے۔

''اب یہ جادوگروں کے گڑھ کی طرف اڑ گیا۔'' عائشہ نے خود کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

غالباً دربان کی بھاری آواز آئی۔ ''خدا جانے اُس نے کوئی دُعا لکھی تھی یا منتر۔ بہر حال جنات کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کرنا بہتر ہے۔ لیکن آخر میں نتیجہ خراب ہی ہوتا ہے۔'' اُس نے ڈرتے ہوئے کہا۔ ''ریچھ کے بھٹ سے کبھی کوئی زندہ نکل کر بھی آیا ہے۔''

اکیسواں باب:

ابن العطاش کی حویلی

عائشہ اصفہان میں بہت خوش تھی۔ رنگا رنگ ریشمی کپڑے ہر عورت کی فطری کمزوری ہوتے ہیں۔ بازار کپڑوں سے پٹے پڑے تھے۔ اُس نے نارنجی، شوخ قرمزی اور گہرے اُودے رنگ کے کپڑوں کے انبار خرید ڈالے۔ اسحاق دُکان دُکان اس کے ساتھ پھرتا اور اس بات پر مسلسل بڑبڑاتا اور کھولتا رہا کہ ایک خوبصورت کنیز کا اس طرح بازار میں آزادی کے ساتھ خرید و فروخت کرنا اُس کے خیال میں قطعی نازیبا اور مروجہ رسم ورواج کے خلاف تھا۔ اُس کے کان آنے جانے والوں کی فقرے بازی پر لگے ہوئے تھے اور اصفہان میں تماش بینوں کی بھلا کیا کمی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسے اس کام میں لطف بھی آرہا تھا۔ ایک سُنسان پائیں باغ میں تنہا بیٹھ کر مکھیاں مارنے کے مقابلے میں بازار میں مڑگشت کرنا بہر حال دلچسپ مشغلہ تھا۔ اسحاق اپنی نئی ذمے داری پر دل ہی دل میں نازاں بھی تھا..... اُس نے دو دیلمی شمشیر بردار مُحافظ بھی ملازم رکھ لئے تھے جن کا کام یہ تھا کہ جب وہ عائشہ کے ہمراہ عمر کی نئی قیام گاہ سے کہیں باہر جائے تو وہ دونوں محافظ اس کے پیچھے پیچھے چلیں تا کہ دیکھنے والوں پر ذرا رُعب پڑے۔

عمر خیام اب ملک شاہ کا واحد منظورِ نظر اور چہیتا مُشیر تھا۔ اُس کے دروازے پر ہر وقت بڑے بڑے امیروں اور عہدے داروں کی بھیڑ لگی رہتی تھی جو اس کی خوشنودی حاصل کرنے اور دربارِ سلطانی میں سفارشیں پہنچانے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔

مختلف قسم کی سواریوں کی قطاریں صبح سے شام تک وہاں لگی رہتیں۔ اسحاق کی کم ظرفی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ایک روز اس نے سپہ سالار کے حاجب کو جو عمر کی خدمت میں ایک ضروری کام سے حاضر ہوا تھا اس وقت تک اندر جانے کی اجازت نہ دی جب تک کہ عمر نے ایک زیرِ مطالعہ کتاب کا آخری صفحہ ختم نہ کر لیا۔

اسحاق دربان نے یہ واقعہ مزے کے ساتھ جعفرک سے بیان کیا تو جعفرک نے اُسے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا ''چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں ورنہ ایک نہ ایک دن کوئی بچھو کی طرح ایسا ڈنگ مارے گا کہ تجھے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔''

''ہاں ہاں! سُن لیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا سر کہاں ہے اور پیر کہاں۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میرے پاؤں اُکھڑ کر سر پر جا لگیں۔''

جعفرک زیادہ وقت سڑکوں کی مڑگشت میں گزارتا تھا۔ اسحاق کے خیال میں اس طرح وقت ضائع کرنا محض حماقت تھی جبکہ عمر کے دروازے پر سکون سے بیٹھ کر خاصا پیسا کمایا جا سکتا تھا کیونکہ ہر شخص جو وہاں آتا تھا دربان کے لیے خیر سگالی کے طور پر ایک نہ ایک تحفہ ضرور لاتا تھا۔ اسحاق کو اس بات کا البتہ افسوس تھا کہ عمر اپنے ملاقاتیوں کو بہت جلد رخصت کر دیتا تھا۔

بجائے اس کے کہ عمر طاقتور امراء کی خاطر مدارات کر کے اُن سے تعلقات بڑھاتا یا دولتمند تاجروں سے مل کر کچھ مشترکہ نفع بخش معاملات طے کرتا یا غریبوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور شفقت سے پیش آتا۔ اُس کا طرزِ عمل کچھ عجیب قسم کا تھا۔ وہ ہر ملاقاتی کی باتیں بڑی بے دلی سے سنتا اور ایک دو لفظوں میں روکھا پھیکا جواب دے کر اسے بہت جلد ٹال دیتا تھا۔ بعض لوگوں سے تو وہ یہاں تک کہہ دیتا کہ وہ سلطان کا کوئی وزیر تو ہے نہیں کہ ان کی درخواستوں کو خود منظور کرے یا سلطان سے منظور کرائے۔ حالانکہ ہر فرد اس بات کو سو فی صد جانتا تھا کہ ملک شاہ عمر کی مٹھی میں تھا۔

''کیونکہ وہ ستاروں کا طلوع و غروب نہیں دیکھ سکتا۔ اور ان کے بڑھنے، گھٹنے کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا مزاج چڑ چڑا ہو گیا ہے۔'' اسحاق نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ انتہائی عقلمند ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں

جانتا کہ ایک امیر جو سلطان کا قرب حاصل کرنے کا متمنی ہے۔ اس کی کس طرح ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ واللہ! یہ بڑے تعجب کی بات ہے!''

عائشہ ان باتوں پہ توجہ نہ دیتی لیکن وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ عمر کوئی معمولی عہدے دار نہیں ہے۔ ورنہ ملک شاہ آنکھ بند کر کے اس پر اس قدر اعتماد کبھی نہ کرتا۔ سب سے بڑا اعزاز اس کے خیال میں یہ تھا کہ عمر کو اس عظیم شخص کی سرپرستی و خوشنودی حاصل رہنی چاہیے جس کے ادنیٰ سے اشارے پر لاکھوں مسلح سوار اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور بس۔

ملک شاہ جب سہ پہر کو بڑے چوک میں چوگان کا کھیل دیکھنے آتا تو عائشہ بھی حرم سرا کے جھروکے میں بیٹھ کر بڑے ذوق و شوق سے یہ نظارہ دیکھتی اور اسے یہ کھیل دیکھنے میں مزا بھی بہت آتا تھا۔ اس وقت تمام عالی شان امراء طرے دار، جواہر نگار عمامے سر پر باندھے، ریشمی اور زربفت کی عبائیں پہنے وہاں حاضر ہوتے تھے۔ اور خود سلطان بھی گل انار رنگ کے شامیانے کے نیچے عمر کے ساتھ تشریف فرما ہوتا تھا۔ چابکدست سوار گیند کو لڑھکا کر سنگ مرمر سے تراشے ہوئے ستونوں کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ جب ملک شاہ کے حکم سے کھیل ختم ہو جاتا تو موسیقاروں کے سازوں کی کھنکتی ہوئی آوازیں عجیب سماں پیدا کر دیتیں۔ اس سارے پس منظر میں عائشہ عمر کے قوت و اقتدار کا اندازہ لگانے لگتی۔ اور زنجبیل کی میٹھی گولیاں چوستے ہوئے ان نقب پوش عورتوں کو حسد بھری نظروں سے دیکھتی رہتی جو شاہی منجم کی ایک نگاہ التفات کی خواہشمند دکھائی دیتی تھی۔

ایک دفعہ رات کے وقت عمر اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ایک کمبل پوش صوفی سے باتیں کر رہا تھا۔ دوران گفتگو میں صوفی نے فیصلہ کن انداز میں اس بات پر زور دیا کہ روز ازل سے صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ مستقبل میں کیا ہوگا۔

''تو پھر اسے یہ معلوم تھا کہ میں شراب پیوں گا۔'' عمر نے جواب میں کہا ''اور اس حقیقت سے انکار کرنے والا میں ہوتا بھی کون ہوں۔''؟

عائشہ کو عمر کی یہ بات بہت ناگوار گزری تھی اور اس پر ایک خوف طاری ہو گیا

تھا صوفی کے رُخصت ہونے کے بعد عائشہ عمر کے پاس پہنچی تھی اور بڑی عاجزی سے اُسے سمجھایا تھا کہ مشیت خداوندی کا مذاق اُڑانا بہت بری بات ہے۔ اس نے عمر سے کہا تھا کہ وہ اس دولت و اقتدار پر نظر کرے جو اللہ تعالیٰ نے اُسے عطا فرمائے ہیں۔

اور عمر نے اپنی خوبصورت کنیز کو جس کا چہرہ اس وقت کسی نامعلوم خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''عائشہ!

جب تم اس دنیا سے رُخصت ہونے لگو گی تو کیا یہ ساری دولت و حشمت اپنے ساتھ لے جاؤ گی؟''

''مجھے کیا معلوم'' اپنی رُوپہلی چوڑیوں کو اُنگلی سے کلائی پر گھماتے ہوئے اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

''تو پھر جتنا عیش کرنا ہے کر لو۔ کیونکہ..... میں یقین دلاتا ہوں۔ تم اس دنیائے آب و گل میں واپس نہ آؤ گی۔''

اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے جیسے وہ ایک دلدوز آہ کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''نہیں عائشہ۔'' عمر نے اسے اپنے آغوش میں کھینچتے ہوئے کہا ''جنت میں ملنے والی حور کی امید میں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آج تجھے اپنے سینے سے جدا کر دوں۔''

''اس حور کے لیے بھی نہیں جو کسی جھیل کے اندر تیرتی ہوئی کشتی میں لیٹی تھی؟''

''کون سی حور؟ اوہو! میں سمجھا۔'' عمر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں! اس کے لیے بھی نہیں۔''

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے عائشہ عمر کے بالوں میں اپنی نازک نازک انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی..... عائشہ نماز بہت پابندی سے پڑھتی تھی اور دن میں ایک مرتبہ ضرور جامع مسجد جا کر دعا مانگتی تھی۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ کاش مرنے کے بعد بھی اسے جنت میں عمر ہی کے ساتھ رہنا نصیب ہو۔

محض اس تصور ہی سے اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی کہ مبادا ایک سنہری بالوں والی کا فرحسینہ وہاں بھی عمر کے آغوش کی تمنا دل میں لیے ہوئے انتظار کر رہی ہو۔

ملک شاہ عمر کو دربار سے رخصت کرنے کا عندیہ نہ دے رہا تھا۔ جب سے اس نے نظام الملک کو برخاست کیا تھا وہ روز بروز اپنے منجم کے صلاح مشورے پر اعتماد کرنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حدود مملکت کی توسیع اور اس کی اپنی شاندار فتوحات عمر کی جچی تلی پیشین گوئیوں کی مرہون منت تھیں۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو اس میں سب سے بڑا دخل تھا لیکن ستاروں کے اثرات کے صحیح تجزیئے نے بھی یہ فیصلہ کرنے میں مدد دی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے۔

(نشانیاں تو بیشک اللہ تعالیٰ کے ہی قبضہ میں ہیں''۔ ملک شاہ نے ایک روز کلام پاک کی یہ آیات بآواز بلند تلاوت کیں۔ (اور اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور ان سے مردے باتیں کرنے لگتے اور ہم تمام موجودات (غیبیہ) کو ان کے پاس ان کی آنکھوں کے روبرو لا کر جمع کر دیتے تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے ہاں اگر خدا ہی چاہے تو اور بات ہے۔)

''اور بالغرض میں ستاروں کی چالیں صحیح نہ سمجھ سکوں، اے فرمانروائے شرق و غرب! تو پھر کیا ہو؟ میں بھی انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے کسی وقت بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔''

ملک شاہ نے عمر کی یہ بات غور سے سن کر سر ہلایا۔ ''قسم ہے کعبے کی مجھے اس بات کا شمہ بھر بھی اندیشہ نہیں ہے۔ ایک ٹٹ پونجیا رمال یا ہاتھ دیکھ کر اٹکل پچو قسمت کا حال بتانے والا بے شک دروغ بیانی کر سکتا ہے۔ لیکن ترا علم کامل ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ایک معمولی سا فلکیاتی مشاہدہ کرنے میں تجھ سے غلطی سرزد ہو جائے۔

عمر کے جواب دینے سے پہلے ہی سلجوقی فرماں روا نے اضطراری طور پر اپنے خیالات مجتمع کرتے ہوئے کہا کہ ''قرآن میں یہ بھی آیا ہے کہ پیغمبروں کے دشمن ہوتے ہیں۔ انسانوں میں شیطان بھی ہوتے ہیں اور سرکش جنات بھی۔ میں تو ایک معمولی بادشاہ ہوں اور یہ بادشاہی بھی محض خدا کی دین ہے۔ میرے بھی لاتعداد دشمن ہیں۔ اس لیے مجھے صحیح مشورے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔''

قرآن مجید بند کرتے ہوئے اس نے عمر کی خاموشی کو اتفاق رائے پر محمول کیا۔ کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایک ادنیٰ درجے کے رمال کو غلط بیانی کرنے کے لیے رشوت دی جا سکتی ہے..... کبھی کبھی اس قسم کا خیال تیرے متعلق بھی میرے دماغ میں آیا ہے۔ لیکن تیرے علم و شخصیت کے پیش نظر میں ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ از روئے نجوم اگر کسی بات کا جواب نفی میں آئے تو سونے کا پہاڑ بھی رشوت میں پیش کر کے دنیا کی کوئی طاقت ''نہیں'' کے بدلے تجھے ''ہاں'' کہنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔''

عمر خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ نجوم کے معاملے میں کوئی بھی دلیل سلطان کے عقیدے میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ ''نظام الملک نے تو سلطان المعظم کو کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔'' اُس نے بڑی جسارت سے عرض کیا۔

''نظام الملک نے شاہی اقتدار کا بہت بڑا حصہ اپنے قبضہ و تصرف میں لے لیا تھا۔'' ملک شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے قرآن مجید کی ورق گردانی کر کے اُس میں سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکالا۔ یہ کچھ تیرے بارے میں ہے'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

اُس کاغذ پر خوشخط باریک الفاظ میں یہ پیغام لکھا ہوا تھا:۔ ''اگر خیام پیغمبری کا جامہ پہن کر بھی سامنے آئے تو اُس کی بات پر یقین کرنے سے پہلے یہ ضرور تحقیق کر لینا کہ شیر کی کھال کے اندر کہیں گیدڑ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔''

''مجھے کسی بات کے دیکھنے یا تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس سے پہلے کہ عمر کچھ کہے ملک شاہ خود ہی بول پڑا۔ ''مجھے تیری قدر و قیمت معلوم ہے۔ ملاذگرد کی جنگ کے وقت سے ہماری قسمتیں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔

کاغذ کا پُرزہ عمر سے واپس لے کر اس نے اپنی مضبوط انگلیوں سے چاک کر دیا۔ اور غصہ کے ساتھ اسے سامنے رکھی ہوئی روشن انگیٹھی میں پھینک دیا۔

"جاسوس" اُس نے بلند آواز سے کہا "میں اس قسم کے تمام افراد کو اپنی حدود مملکت سے نکال باہر کروں گا۔ نظام الملک کہا کرتا تھا کہ وہ میرے چشم و گوش ہیں۔ وہ میرے افسروں اور خادموں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ وہ لوگ جو مجھ سے خائف ہیں یا میرے خلاف سازشیں کرتے ہیں وہ ان جاسوسوں کو دل کھول کر رشوت دیتے ہیں تا کہ وہ میرے روبرو ان کی تعریفیں کریں۔ اور خدا کی قسم جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ انھیں جاسوسوں کو رشوت دینے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ آج کل لوگ میرے سامنے دشمنوں کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں اور میرے دوستوں کی برائیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے تیرے متعلق کوئی نازیبا کلمہ میرے سامنے نہیں کہا نہ کوئی الزام تجھ پہ لگانے کی جسارت کی ہے۔"

"لیکن میں خود اپنے آپ کو قابل الزام گردانتا ہوں۔" عمر نے زور دے کر کہا میں یہاں رہ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی رصد گاہ واپس چلا جانا چاہیے!"

ملک شاہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا "واللہ! مجھے تیری رفاقت کی ضرورت ہے۔"

"میں نے حال ہی میں ایک نئی دریافت کی ہے۔ کرۂ ارض کے متعلق ایک بالکل نئی تحقیق۔"

"آہا۔ شاید کوئی سیارہ دریافت کر لیا! سلطان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے طشت میں سے انگوروں کا ایک خوشہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ انگور کے کچھ دانے عمر کی طرف بھی بڑھائے..... سلطان شاذ و نادر ہی یہ عزت کسی کو عطا کرتا تھا۔ "بے شک، بے شک۔ ہمارا دورِ حکومت تیری عقل و دانش کی روشنی سے ضرور جگمگائے گا....."

"وہ کوئی نیا سیارہ نہیں ہے میں نے دریافت کیا ہے کہ..... یہ کرۂ ارض۔ یہ زمین حرکت کرتی ہے۔ گھومتی ہے۔"

ملک شاہ کے چہرے پر حیرت اُبھری۔ پھر اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح کے بھیانک خواب سبھی دیکھتے ہیں۔ میں نے بھی ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ میں گر رہا ہوں۔ نیچے اور نیچے۔ جیسے پیروں تلے زمین نہ ہو۔ اور

آخر کار میں خلا میں گردش کرنے لگا تھا..... تیرے خیال میں یہ کوئی برا شگون تو نہ تھا؟"

"وہ تو محض ایک خواب تھا۔ خداوند نعمت کا ستارہ عروج پر ہے۔ کسی طرح کا خوف دل میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔" عمر تفصیل سے ملک شاہ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کس طرح کئی برس سے اس نظریئے کا تجربہ کر رہا ہے کہ "زمین" بجائے ساکن رہنے کے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں اپنے گرد گھوم جاتی ہے۔ اور جسامت میں سورج یا چاند سے بڑی ہونے کے باوجود زمین درحقیقت فضائے بسیط میں ایک چھوٹا سا دھبہ نظر آتی ہے..... لیکن ملک شاہ کو اس بات کا یقین نہ آیا۔ وہ بات ٹالنے کے لیے آہستہ آہستہ انگور کھانے لگا اور ان کے ذائقے کی تعریف شروع کر دی۔

"کل ہی کی بات ہے" سلطان نے بات چھیڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے ان جانوروں کے سر شمار کرائے جو میں نے شکار میں مارے تھے۔ وہ نو ہزار سے بھی زیادہ تھے۔ میں نے سوچا، محض اپنا دل خوش کرنے کے لیے اللہ کی اتنی مخلوق کو قتل کرنا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے؟ اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے میں نو ہزار طلائی سکے خیرات کروں گا۔"

"الحمد اللہ!"

"بے شک۔ اللہ ہی تعریف کے لائق ہے۔" ملک شاہ نے عاجزی سے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا "میں کچھ دن بعد تجھے گھومنے پھرنے کی اجازت دے دوں گا۔ لیکن اس وقت تجھے رخصت دینا خود اپنا بازو اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالنے کے مترادف ہو گا۔"

عمر دربار شاہی سے رخصت ہو کر عقبی کمرے سے ہوتا ہوا باہر آیا۔ وہ اس وقت بہت دل شکستہ اور اداس دکھائی دے رہا تھا۔ جب وہ چوک سے گزرا تو چراغ روشن ہو چکے تھے اور گرد و غبار کے دھند میں ٹمٹما رہے تھے۔ لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ مختلف قسم کی چہ میگوئیاں سنتا ہوا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔

"وہ دیکھو! وہ خیام جا رہا ہے جس نے نئی زیج مرتب کی ہے..... یہ خواجہ امام عمر ہے جو یہ بتاتا ہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے..... کافروں کا رفیق..... یہ شاعر بھی

ہے۔ مگر شعر کہہ کر تلف کر دیتا ہے کہ مبادا.....''

اس کے مکان کے دروازے پر ملاقاتیوں کا ایک ہجوم تھا۔ عمر نے ان سب لوگوں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ وہ اس وقت کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ اور سیدھا زنان خانے میں چلا گیا جو بالائی منزل میں تھا۔ عائشہ نے بڑھ کر مضحکہ خیز انداز میں فرشی سلام کرتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ نہ معلوم کب سے سولہ سنگار کیے بیٹھی تھی۔ بازار سے کئی قسم کی مٹھائیاں منگا کر سلیقے سے دسترخوان پر چن رکھی تھیں۔ ایک سنہری صندوقچہ جس میں گہرے رنگ کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اس نے خرید کر وہاں رکھ چھوڑا تھا۔ عوددان میں صندل کا برادہ جلا کر اس نے عمر کے آنے سے پہلے ہی کمرے کو معطر کر رکھا تھا اور اس کا انتظار کرتے کرتے اکتا سی گئی تھی۔

کمرے میں پھیلی ہوئی شوق انگیز خوشبو کا اثر لیئے بغیر عمر لیٹ گیا۔ اس کی طبیعت گپ شپ کے لیے آمادہ نہ تھی۔ جب اس نے قلم اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عائشہ نے بھی اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

کچھ دیر تک تو وہ اپنے بال سنوارتی رہی۔ آخر ایک طرح کے جذبہ رفاقت سے مجبور ہو کر اس نے عمر سے پوچھا۔

''کیا لکھا جا رہا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''یہ کوئی ایسی چیز ہے.....'' اس نے کاغذ پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا ''جو تمہیں افسردہ بنا دیتی ہے۔ شاید کوئی تعویذ ہے؟ کیا لکھا ہے اس میں؟''

''مرد گڑیوں سے نہیں کھیلتے'' عائشہ نے جل کر کہا۔ ''وہ شاہین کی طرح دشمنوں پر جھپٹتے ہیں۔ بہر حال یہ بڑی بیکار سی بات ہے۔ اگر تم گڑیا ہوتے تو تمہارے اندر سوچنے کی صلاحیت نہ ہوتی اور انسان تو ایک جیتی جاگتی چیز ہے اس کے ساتھ گڑیا کی طرح نہیں کھیلا جا سکتا۔'' عائشہ نے عمر کو لبھانے کے لیے ادائے خاص سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''ایسی بے مزا باتیں لکھنا تو نیم خواندہ منشیوں اور خشک مزاج زاہدوں کو ہی زیب دیتا ہے۔''

عمر نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی جو عائشہ کی چھوٹی بڑی قیمتی اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ طشت میں میوہ بھری کھجوریں جوں کی توں رکھی تھیں۔ باوجودیکہ اس طرح کی تازہ کھجوریں عائشہ کو بے حد مرغوب تھیں مگر عمر کے انتظار میں اس نے آنکھ اُٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

وہ اس کے پہلو میں آرام سے لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں جب عائشہ بناؤ سنگار کر کے اپنے بہترین ریشمی کپڑے پہنتی تو وہ جنت کا ایک خوش رنگ طائر نظر آتی تھی۔ لیکن اس طرح لاپروائی اور بے تکلفی سے لیٹے ہوئے دیکھ کر عمر اس کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

گردن جھکا کر عمر نے بڑے پیار سے اس کے ہونٹوں کو چوما۔ اور نوجوان دوشیزہ نے باہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں۔ دراصل وہ مصنوعی طور پر سوئی سوئی اور اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اس کاغذ پر فاتحانہ نظر ڈالی جس پر صرف چار سطریں تحریر تھیں اور اب دور فرش پر جا گرا تھا۔

''آقا'' جعفرک نے عمر کو بتایا'' تیرے کوہستانی جادوگر اصفہان تک آپہنچے ہیں۔''

کبڑے جعفرک کی گفتگو کا اختصار یہ تھا کہ شہر کے بازاروں میں عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اس نے رات کے وقت مسجد کے دروازے پر لوگوں کو سرگوشیاں کرتے سنا تھا۔ وہ لوگ ایک شخص کا ذکر کر رہے تھے جس نے حیات بعد الممات کے راز فاش کر دیے تھے۔ جب وہ مر گیا تو اسے جنت کی سیر کرائی گئی اور وہاں کے حالات بیان کرنے کے لیے اسے پھر دنیا میں واپس بھیج دیا گیا۔

''اس نے جنت میں کیا دیکھا؟'' عمر نے سوال کیا۔

چشموں سے ابلتی ہوئی شراب۔ سبزے پر بچھے ہوئے رنگ برنگے قالین اور سیاہ چشم حوریں جن کے حسن نے اسے مدہوش کر دیا۔''

''کیا جنت میں کوئی دریا بھی بہتا ہے؟''

جعفرک نے بڑے والہانہ انداز سے سر ہلایا۔

''جن لوگوں نے اس مردہ شخص کو باتیں کرتے سنا ہے وہ اس کے برعکس بتاتے ہیں کہ وہاں دریا وغیرہ نہیں ہے بلکہ ایک جھیل ہے جس پر ہر وقت روپہلی چاندنی چھائی رہتی ہے۔''

اس نے تجسس بھری نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ عائشہ نے جعفرک کو بتایا تھا کہ جب عمر پہاڑوں پر جادوگروں سے برسرپیکار تھا تو اسی زمانے میں اس نے ایک خواب دیکھا تھا اور اسے خواب میں ایک ایسی ہی جھیل دکھائی دی تھی۔ لیکن اس شخص کے برعکس، جو مرنے کے بعد زندہ ہو کر گوشہ قبر سے پھر دنیا میں واپس آیا ہے عمر نے اپنا خواب زیادہ تفصیل سے کبھی بیان نہ کیا تھا۔

''ہاں'' عمر نے جعفرک کی بات پر صاد کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک جھیل ہے اور اس جھیل میں ایک تفریحی کشتی سوتے ہوئے راج ہنس کی طرح خاموشی سے تیرتی رہتی ہے۔''

''واللہ! کچھ اور حالات بتایئے۔ میرے آقا۔''

''پھر صبح کو آنکھ کھل گئی۔ اور بس۔''

جعفرک نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ بدن کے جوڑوں میں ایک طرح کی سختی محسوس کرتے ہوئے اسے اپنے بڑھاپے کا خیال آیا۔ اس کے دل میں یہ تمنا کروٹیں لینے لگی کہ کاش مرنے کے بعد وہ جنت میں پہنچ کر ایک مرتبہ پھر نوجوان ہو جائے۔ تنو مند، وجیہ اور قد آور۔

''بھلا کون واپس آیا ہے اس طویل سفر سے؟''

عمر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایک شخص کو تو بہرحال واپس آتے ہوئے ہم سن رہے ہیں۔''

جعفرک کے دل کو یقین آ گیا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبرﷺ نے جنت میں ہمیشہ بہنے والی نہروں کی خوش خبری دی تھی۔ عمر نے بھی جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا بقول عائشہ کے ..... خواب میں جنت کی سیر کی تھی جہاں شراب کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس شخص کی بات کا یقین نہ کیا جائے جو اسی قسم کی نہروں کا ذکر کر رہا تھا۔ جعفرک اپنے اس یقین کو مزید تقویت دینے کے لئے اپنے کانوں سے مذکورہ شخص کو بولتے ہوئے سننا چاہتا تھا۔ دن چھپتے ہی وہ مسجد کے دروازے کا چکر لگانے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ لیکن اس کے کان بدستور سرگوشیوں پر لگے ہوئے تھے۔

ایک دُبلے پتلے خستہ حال درویش سے اس سلسلے میں اس کی بات چیت ہوئی تھی۔ وہ بھی اس واقعے کو سمجھتا تھا۔ اسی نے جعفرک کو پوری تفصیل بتائی تھی اور یقین دلایا تھا کہ اس وقت وہ خود وہاں موجود تھا جب مردہ شخص نے ایک خاص بڑے مجمع کے سامنے باتیں کی تھیں۔ اور آئندہ جمعے کو بھی مسجد کے عقب میں ابن العطاش کے مکان پر

وہ پھر گفتگو کرے گا۔ جعفرک کا خیال تھا کہ اگر کوئی درویش کسی معجزے کی تصدیق کر دے تو یقیناً وہ سچا ہی ہوگا۔

وہ عمر کے سامنے یہ سب باتیں بیان کرتا رہا۔ عمر نے یہ سب کچھ سن لینے کے بعد جعفرک کو غور سے دیکھا اور خاموش ہو رہا۔

جعفرک کے دل میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ ابن العطاش کے مکان پر جو جامع مسجد کے عقب میں واقع تھا ضرور جائے گا۔ دوسرے دن سر شام سے ہی وہ اس امید میں وہاں پہنچ گیا تھا کہ شاید اسے مذکورہ اجنبی شخص کو بچشم خود باتیں کرتے دیکھنے کا موقع مل جائے۔

ابن العطاش کے دروازے پر پہنچ کر وہ وہاں سے آنے جانے والوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ارے جعفرک! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

مخاطب ہونے والا توتوش تھا۔ اصفہان کے بازاروں میں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ عجیب واقعات رونما ہو رہے تھے جن کا جاسوسوں کے سربراہ توتوش نے تذکرہ کیا۔

گذشتہ مہینے سے متعدد افراد یکے بعد دیگرے گم ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں پریشان کن بات یہ ہے کہ گم ہونے والے بھک منگے یا معمولی حیثیت کے انسان نہ تھے۔ ان میں سے بیشتر مالدار تاجر، معزز نو وار داور مشہور قبیلوں کے سردار تھے..... پانچ افراد تو بالکل ہی مفقود الخبر ہیں۔

یہ امر طے شدہ ہے کہ انہیں آوارہ گرد قبائلیوں نے اغوا نہیں کیا تھا کیونکہ شہر پناہ کے باہر جاتے ہوئے انہیں کسی نے نہ دیکھا تھا۔ وہ شہر کے اندر ہی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اور یہ تمام واقعات دن چھپنے کے تھوڑی دیر بعد ہی رونما ہوئے تھے۔ پانچوں اشخاص یا تو گھوڑوں پر سوار تھے یا اکیلے پیدل چل رہے تھے..... ان میں سے اکثر مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے اپنے اپنے گھر واپس جاتے ہوئے گم ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں..... ایک عجیب بات یہ تھی کہ..... پانچوں آدمیوں کو کسی نامعلوم

شخص کی طرف سے غیر معمولی قسم کے تحفے بھیجے گئے۔ تفتیش کے دوران میں ان کے گھر والوں نے توتوش کو بتایا تھا کہ تمام گم شدہ افراد کے سرہانے مختلف اوقات میں نہ معلوم کون دو تازہ روٹیاں لپیٹ کر رکھ گیا تھا۔

''کھاتے پیتے لوگوں کی مسہریوں کے سرہانے بھلا روٹیوں کا کیا کام'' توتوش ہر دفعہ یہ سوال کرتا تھا۔ ''ارے روٹیاں! اور وہ بھی تازہ پکی ہوئی جیسے فوراً کوئی تنور سے نکال کر لایا ہو۔''

جعفرک نے اپنا سر ہلایا۔ یہ واقعات نوعیت کے اعتبار سے بڑے ہی غیر معمولی تھے۔ لیکن اللہ ہی سب کچھ کرتا ہے۔ اس طرح کے واقعات کو معجزہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نہ خرق عادت جیسا کہ ایک درویش نے دیکھ کر اس سے بیان کیا تھا۔

''غور کرنے کی بات ہے''..... توتوش بڑبڑایا..... وہ مسجد سے پیدل جا رہے تھے..... پانچ میں سے تین کو آخری بار جامع مسجد میں دیکھا گیا تھا۔ لہٰذا میں نے تمام دروازوں اور قرب و جوار کی چھتوں پر اپنے آدمی متعین کر دیئے ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اندھیرے میں کیا دکھائی دے سکتا ہے؟ گم شدہ اشخاص کے عزیز و اقارب نے عدالت میں واویلا مچا رکھا ہے۔ اور گورنر..... لیکن تو راتوں کو کیوں سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا پھر رہا ہے؟''

''میں اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں جس سے مجھے قرض وصول کرنا ہے..... میرا خیال ہے کہ ان پانچوں آدمیوں کو کہیں چھپا دیا گیا ہے۔''

''تو پھر وہ کہاں چھپائے گئے ہیں؟ سڑکوں پر متعین پہرے داروں نے انہیں نہیں دیکھا! پھر وہ سب مشہور دولت مند آدمی تھے کوئی چور اُچکے نہیں تھے۔ مالدار آدمی جب روپیہ پیسہ لے کر کہیں جاتے ہیں تو محض نہتے بھی نہیں ہوتے۔

جعفرک دل ہی دل میں خوش ہو رہا تا کہ جاسوسوں کا طاقتور سربراہ اس سے تبادلہ خیال کرنے کے لیے رک گیا تھا۔ ''اچھا اگر وہ سب مالدار اسامیاں تھے تو ممکن ہے انہیں آوارہ و سرکش بدمعاش تاوان لے کر چھوڑنے کے لالچ میں پکڑ کر لے گئے ہوں۔''

توتوش تیزی سے تسبیح پھراتے ہوئے پھر بڑبڑایا۔ ''لوگ تجھے بے وقوف کہتے ہیں لیکن تو بعض اوقات عقلمندوں سے زیادہ سمجھداری کی باتیں کرتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ انہیں تاوان یا ڈنڈ کے لالچ میں کوئی پکڑ کر نہیں لے گیا۔ کیونکہ ان پانچوں میں سے کسی کے اعزا کو بھی اس قسم کا کوئی مطالبہ موصول نہیں ہوا..... تاہم ..... اللہ ہی عالم الغیب ہے..... ممکن ہے کسی وقت روپیہ طلب کرنے کے لیے کوئی ان کے پاس آجائے۔ بہرصورت الزام میرے ہی سر آتا ہے۔''

''خدا آپ کو تفتیش میں کامیاب کرے۔''

جعفرک نے جاسوسوں کے افسر اعلیٰ سے اجازت چاہی۔ لیکن ایک لمحے کے لیے اس نے توقف کیا۔ وہ توتوش کے ملازموں کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا مگر گلی میں جا کر درویش سے باتیں کرنے کو بھی اس کا دل چاہ رہا تھا۔ شاید کسی نئے معجزے کا حال درویش سے معلوم ہو سکے۔ وہ گلی میں داخل ہونے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتا اس امید میں مسجد کی طرف چل پڑا کہ شاید مسجد کے دروازے پر درویش سے ملاقات ہو جائے۔

اس وقت تک تقریباً ایک پہر رات گزر چکی تھی۔ اور عشاء کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ محرابی دروازے پر آویزاں قندیل کی روشنی میں اسے صرف دو ملا نظر آئے اور ایک پہرے دار جو نیزے کا سہارا لیے کھڑا اونگھ رہا تھا۔ ایک نابینا اپنی لکڑی سے کھٹ کھٹ کرتا اندھیرے میں چل رہا تھا۔ جعفرک جب اس کے سامنے پہنچا تو وہ گڑگڑا کر جعفرک سے مخاطب ہوا۔

''اے اللہ کے بندے! کیا تو اندھے پر ترس کھا کے گھر کے دروازے تک پہنچنے میں اس کی مدد کرے گا؟''

''بے شک۔'' جعفرک نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ''کدھر ہے تیرا گھر؟''

''مسجد کے پچھواڑے۔'' اندھے نے کبڑے کا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی جلدی راستہ طے کرنے لگا۔ ''بائیں ہاتھ کو تیسرا دروازہ جہاں فصیل ختم ہوتی ہے۔ ویسے تو کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے مگر جس کے آنکھیں نہ ہوں اس کے لیے اتنا فاصلہ بھی میلوں لمبا

معلوم ہوتا ہے۔ ہائے میری قسمت!''

''بائیں ہاتھ کو تیسرا مکان۔'' جعفرک نے ایک اضطراری دلچسپی کے ساتھ دہرایا۔ ''وہ ابن العطاش کا مکان تو نہیں ہے؟''

نابینا نے جعفرک کی طرف منہ پھیرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ اس کے چہرے کو گھورنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''ابن العطاش؟ تو اسے کیسا جانتا ہے۔ اے اندھے کے مہربان دوست؟''

''مجھے اس کی تلاش ہے۔''

''بہت لوگ اس کی تلاش میں آتے ہیں۔'' جیسے ہی وہ مسجد کے کونے پر پہنچ کر تنگ گلی میں داخل ہوئے سخت زمین پر اندھے کی لکڑی کی کھٹ کھٹ کی آواز سنی اور اس نے اندھیرے میں مطلوبہ تیسرا دروازہ ڈھونڈ نکالا۔ شاید اس اندھے آدمی کو اس مکان کا راز معلوم ہو اور کچھ باتیں اس سے معلوم ہو جائیں؟ جعفرک سوچنے لگا۔

''ارے دروازہ آگیا!'' اندھے نے لکڑی سے چھو کر اندازہ لگایا اور دستک دی۔ دروازہ چرمراہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ ''اے رفیق شب'' اندھے نے سرگوشی کے انداز میں کہا ''آؤ! اندر آجاؤ اور کچھ دیر آرام کر لو۔''

جعفرک کے بازو کا سہارا لیتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ ان کی پشت پر کوئی چیز حرکت کرتی معلوم ہوئی اور ایک آہنی پنجے نے درباری مسخرے کا گلا سختی سے دبوچ لیا۔ جعفرک شدت کرب سے بیتاب ہو گیا اور گھپ اندھیرے میں منہ کے بل گر پڑا۔

بائیسواں باب:

حشیشین

عائشہ کی نیند میں یکا یک کچھ خلل واقع ہو گیا اور وہ سوتے سوتے چونک کر جاگ اٹھی۔ وہ بہت ذکی الحس واقع ہوئی تھی۔ اس نے اپنے قریب کسی ایسی غیر معمولی شے کو حرکت کرتے محسوس کیا جس کی موجودگی خطرے سے خالی نہ تھی۔ کھلی ہوئی چھت پر عمر کے پہلو میں قالین کے اوپر لیٹے لیٹے اس نے بغیر ہلے جلے کچھ سننے کی کوشش کی۔

اس نے پھر وہی ہلکی سی آواز سنی جس نے اسے نیند میں چونکا دیا تھا..... کوئی شخص چکنے فرش پر ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ اُن دونوں کے علاوہ ایک تیسرا شخص اس کے اتنے قریب گہری گہری سانسیں لے رہا تھا کہ خوف کی شدت سے اس کے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کسی چیز کے نیچے کاغذ دبانے کی ہلکی سی آواز آئی اور ایک عجیب قسم کی بو اس کی ناک میں داخل ہوتی محسوس ہوئی۔ نوجوان لڑکی چیخ مار کر اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے خوفزدہ ہرنی خطرے کے احساس سے یکا یک بدک جاتی ہے۔

جیسے ہی وہ کھڑی ہوئی اس نے ٹمٹماتے ستاروں کی مدھم روشنی میں ایک سیاہ ہیولے کو حرکت کرتے دیکھا۔ ننگے پیروں کی کھس کھس دور ہوتی چلی گئی۔ عمر نے بھی گھبرا اس نے ایک شخص کو زینے کی طرف بھاگتے دیکھا وہ للکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔

نیچے صحن میں اس قدر اندھیرا تھا کہ اسے یہ پتا نہ چل سکا کہ وہ نامطلوب مہمان کدھر گیا۔ اونگھتے ہوئے ملازمین اپنے اپنے حجروں سے نکل کر گرتے پڑتے عمر کی طرف بھاگے۔ مشعلیں روشن ہو گئیں۔ نامعلوم حملہ آور غائب ہو چکا تھا۔ صدر دروازہ بدستور مقفل تھا۔ اسحاق جو دروازے کے قریب زمین پر پڑا سو رہا تھا بار بار قسمیں کھا کر یہ یقین دلا رہا تھا کہ دروازہ کسی وقت بھی نہیں کھلا۔

عائشہ نے چھت سے نیچے جھانکتے ہوئے پکار کر عمر سے کہا ''میرے آقا! اوپر آیئے۔ دیکھئے یہ کیا ہے؟''

جب مشعلیں اوپر لائی گئیں تو عمر نے اپنے تکیے کے قریب دو چیزیں پڑی دیکھیں۔ ایک بغیر نیام کا خنجر اور دو تازہ روٹیاں لپٹی ہوئی۔ جن میں سے اس وقت تک ایسا بھپکا نکل رہا تھا جیسے ابھی تنور سے نکالی گئی ہوں۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹا تھا تو اس طرح کی کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔ وہ خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا کسی باہر کے آدمی نے جان جوکھوں میں ڈال کر یہ کام کیا ہے۔ یا پھر اس کے اپنے خادموں ہی میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہے۔ عائشہ کو یقین تھا کہ خنجر گھبراہٹ میں یوں ہی زمین پر نہیں گرا بلکہ ضرور کسی نے بڑی احتیاط سے عمر کے سرہانے رکھا تھا۔

عمر نے اس ہتھیار کو اٹھا کر غور سے دیکھا۔ وہ بھورے فولاد کا بنا ہوا نہایت نفیس خمدار خنجر تھا۔ اس نے پہلے بھی اس نمونے کے خنجر الموت میں فدائیوں کی کمر میں لٹکے دیکھے تھے۔ اس نے خنجر زمین پر رکھ دیا اور سنجیدگی سے اس واقعے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

''لیکن اس کا مطلب کیا ہوا؟'' عائشہ نے سوال کیا۔ وہ ہنوز خوف اور غصے کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی..... ''یعنی اس خنجر اور روٹیوں کا۔''

''یہ دو علامتیں ہیں'' اسحاق نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''روٹیاں زندگی کی علامت ہیں اور خنجر موت کا نشان ہے۔ یقیناً اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے۔''

''تو ٹھیک کہتا ہے۔'' عائشہ نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا ''اگر ہماری زندگیوں کا انحصار تیری دربانی پر ہوتا تو اے خراٹوں کے بادشاہ ہم لوگ نجانے کب کے اللہ کے پیارے ہو چکے ہوتے۔ اے واہ! اس وقت تجھ پر نیند کی پٹکی نہیں پڑتی۔ جب ملاقاتی سونے چاندی کے سکوں سے تیری مٹھی گرم کرتے رہتے ہیں۔ اور جب

اندھیرے میں چور اندر گھس آتے ہیں تو اس وقت تو کہاں منہ کالا کر جاتا ہے؟''

''دیکھئے!'' اسحاق نے ایکدم چلا کر کہا ''یہ کاغذ کیسا پڑا ہے۔ اس پر کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔''

اس نے جھک کر باریک برنجی کاغذ کا ایک چوکور ٹکڑا اٹھایا اور عمر کی طرف بڑھا دیا۔ عمر روشنی کے قریب جا کر اسے پڑھنے لگا۔ تحریر فارسی زبان میں تھی۔ صرف ایک سطر بغیر دستخط کے۔ ''ضرورت اس امر کی ہے کہ تو اپنی زبان قابو میں رکھ۔'' اس نے بلند آواز سے پڑھا۔

''تو اپنی زبان قابو میں رکھ'' اسحاق نے فلسفیانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے دہرایا۔ ''حضور! کس قدر کھلی ہوئی تنبیہ ہے۔ یہ عائشہ کے لیے ہے۔ ذرا خنجر کو ملاحظہ فرمایئے بعینہ ایسا ہی نوکدار ہے جیسے عائشہ کی زبان۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ روٹی پکائے اور خاموشی سے گھر میں پڑی رہے۔''

عمر جانتا تھا کہ اس تنبیہ کا مخاطب وہ خود ہے۔ اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ یہ الموت سے نازل ہوئی ہے۔ یہ اور بات تھی کہ حسن نے خود اپنے قلم سے اس کو نہ لکھا ہو۔ کاغذ بھی بجنسہ اسی قسم کا تھا جو نامہ بر کبوتروں کے ذریعے پیغامات بھیجنے کے لیے شیخ الجبل استعمال کرتا تھا۔ بغیر دستخط کیے کاغذ کا ایسا پرزہ اس کے سوا اور کون بھیج سکتا تھا؟ اصفہان پہنچنے کے بعد عمر نے الموت اور وہاں کے واقعات کو تقریباً فراموش کر دیا تھا۔ اور کسی سے ان باتوں کا ذکر تک نہ کیا تھا جو اس نے الموت کے دوران قیام میں سبعیہ کے متعلق دیکھی یا سنی تھیں۔ لیکن اسے اس پر بڑا تعجب تھا کہ آخر حسن نے روٹیاں اور خنجر اس کے پاس کیوں بھیجے۔

صبح ہوتے ہی اس کی وجہ عمر کی سمجھ میں آ گئی۔ توتوش کا ایک جاسوس عمر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ادب سے جھک کر فرشی سلام کیا۔

''کیا بات ہے؟'' عمر نے بے صبری سے پوچھا۔

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے اسے کس نے ٹھکانے لگا دیا؟'' ظل السلطان! ہم تمام رات مسلسل سڑکوں پر گشت کرتے رہتے ہیں۔ جب ذرا روشنی نمودار ہوئی تو ہم نے آپ

کے ایک خادم کو نالے میں مردہ پڑا ہوا پایا۔ چلیے دیکھیے۔ ہم اس کی لاش اٹھا کر لائے ہیں۔''

نیچے پہنچ کر وہ عمر کو صحن کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی مسہری کے قریب لے گیا۔ لاش چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔

عمر نے اپنا مضبوط ہاتھ بڑھا کر چادر اٹھائی اور اچانک غم و غصہ کی شدت سے وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

وہ لاش جعفرک کی تھی۔ چہرہ تقریباً سیاہ ہو گیا تھا اور ٹھوڑی کے نیچے گلے میں ایک شگاف تھا جس میں سے زبان نکال کر قاتل نے اسے اس قدر کھینچا تھا کہ غالباً جڑ سے اُکھڑ کر ساری کی ساری باہر نکل آئی تھی۔

''افسوس! کس قدر عبرتناک منظر ہے!'' گشت کرنے والے سپاہی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس سے پہلے کبھی کسی کو اس طرح قتل ہوتے نہیں دیکھا۔ پھر یہ تو کمزور اور بے ضرر آدمی تھا۔''

عمر نے لاش کو پھر چادر سے ڈھک دیا اور ایک گہرا سانس لیا۔ اس میں خبر دینے والے کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ اس نے دل میں سوچا تو توش کے آدمی ہو تم؟ اپنے آقا کو فوراً میرے پاس بھیجو!''

توتوش اس قدر جلد وہاں پہنچ گیا جیسے وہ کہیں قریب ہی عمر کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ خیام نے اسے اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے کر ایک ایسے کونے میں جا کھڑا ہوا جہاں کوئی ان کی باتیں نہ سن سکے۔ توتوش نے اپنے عمامے کے لٹکتے ہوئے گوشے سے پسینہ پونچھا اور بے چینی کے ساتھ جلدی جلدی اپنی تسبیح گھمانے لگا..... اسے یاد تھا کہ اسی جعفرک کی بدولت چند سال پہلے وہ کس طرح عمر کے غیض و غضب کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے اپنے میزبان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اس کی ہمت اور بھی پست ہو گئی۔

عمر کے دماغ پر اس وقت مقتول جعفرک کا خیال غالب تھا۔ اس وفادار درباری مسخرے کی موت سے ان یادوں کا آخری رشتہ بھی منقطع ہو گیا تھا جن کا تعلق

اس بے فکری کے ایام سے تھا جو عمر نے رحیم مرحوم کے ساتھ گزارے تھے۔

''یہ کس کا کام ہوسکتا ہے؟'' عمر نے تلخ لہجے میں طوطوش سے پوچھا۔ ''اس کا کوئی دشمن نہیں تھا..... اف خدایا! وہ ایک شیر خوار بچے کی طرح بے ضرر تھا۔''

توتوش نے اس قدر جھک کر سلام کیا کہ اس کا ہاتھ تقریباً زمین سے لگ گیا..... ''جناب والا کی اجازت ہو تو عرض کروں!..... یہ ایک ایسا معما ہے جس کو سمجھنے سے میری ناقص عقل قاصر ہے۔ میں علیؑ کی ریش مبارک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ گذشتہ شام جامع مسجد کے قریب مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اور میں نے اسے سڑکوں پر بے مقصد گھومنے سے سختی کے ساتھ منع بھی کیا تھا..... اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو مجھ پر خدا کی مار ہو..... نہ صرف یہ بلکہ ایک محفوظ مقام تک میں اسے چھوڑنے بھی گیا.....'' اپنی صفائی پیش کرتے کرتے توتوش پر ایک خوف طاری ہوگیا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ کیونکہ وہ تلوار کی کاٹ سے کہیں زیادہ عمر کے جلال سے خائف تھا..... ''میں قسم کھاتا ہوں.....'' اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور وہ جملہ پورا نہ کرسکا۔

''اس کی لاش تجھے کہاں سے ملی ہے؟''

''لاش کو میرے ایک آدمی نے مسجد سے خاصے فاصلے پر دریا کے کنارے والی شاہراہ پر نالے میں پڑا پایا۔ معلوم ہوتا ہے اسے اس مقام پر قتل نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ وہاں خون کے ایک قطرے کا نشان بھی نہ تھا۔ میں حسنؑ اور حسینؑ اور تمام شہدائے کربلا کی قسم کھاتا ہوں۔ جناب والا! میری بات کا یقین کیجیے!.....''

''خاموش!'' عمر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''حسن، حسن بن صباح۔ حسن نے تھوڑی ہی دیر پہلے تنبیہ کی تھی کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ جعفرک کی زبان گذشتہ رات کھینچ کر گدی سے نکال دی گئی تھی۔ آخر کیوں..... کن وجوہ کی بنا پر؟ یہی کہ حسن کے آدمیوں کو شبہ ہوا ہوگا کہ وہ ان کی مخبری کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں جعفرک کن خیالات میں گم تھا؟ وہ اس منحوس معجزے کے چکر میں تھا جس کی بدبو سے الموت کی ساری فضا بھری ہوئی تھی۔ ابن العطاش کی حویلی میں ایک مردہ زندہ ہوکر جنت کے حالات بیان کرتا تھا۔ عمر نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے ایک ہنکارا ابھرا..... ٹھیک ہے۔ اس نے یہ

افواہ جامع مسجد کے قریب ہی سنی تھی۔ جامع مسجد کی پشت پر سرراہے۔ جمعے کی شام کو۔ تو پھر یہ اس طرح ہوا کہ..... جعفرک کو غالباً جامع مسجد کے آس پاس قتل کیا گیا اور وہاں سے اس کی لاش کو لے جاکر خاصے فاصلے پر پھینک دیا گیا۔

مسجد کی پشت پر جو ابن لعطاش کی حویلی ہے۔ اس کے متعلق تجھے کیا معلوم ہے؟ عمر نے سوال کیا۔

کچھ نہیں..... میں پہلی مرتبہ یہ نام سن رہا ہوں۔

عمر اس ارادے سے اٹھا کہ مذکورہ حویلی میں جاکر خود دیکھے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ لیکن کچھ سوچ کر وہ قریب بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گیا۔ توتوش نے پھر گہرا سانس لیا۔ قاتلوں کو وہاں تلاش کرنا بے سود تھا۔ وہ لوگ ارتکاب جرم کر کے مزے سے مسجد میں درویشوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے ''یاہو'' ''یاحق'' کر رہے ہوں گے۔

''میں صرف اتنا جانتا ہوں'' عمر نے گہری سوچ سے اُبھرتے ہوئے کہا'' کہ رات کو ایک چور میرے سرہانے ایک تحریر چھوڑ گیا تھا جس میں مجھے اپنی زبان بند رکھنے کی تاکید و تنبیہ کی گئی تھی۔''

جعفرک کی موت کا خیال آتے ہی توتوش کا جبڑا ڈر کے مارے سخت ہونے لگا۔

دور چلمن کے پیچھے سے آتی ہوئی ایک آواز نے انھیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''میرے سرتاج! میں اس دخل در معقولات کے لیے معافی چاہتی ہوں..... خنجر اور تازہ پکی ہوئی روٹیوں کا حال بھی اسے بتائیے۔''

''عائشہ'' عمر نے سنجیدگی سے کہا ''حرم میں واپس جاؤ۔''

ریشمی لباس سرسرایا اور پھر خاموشی طوری ہوگئی۔

''روٹیاں!'' جاسوس کے افسر اعلیٰ نے بآواز بلند دہرایا۔

''ہاں..... ان کے متعلق کیا بات ہے؟''

''یا اللہ! اور ایک خبر؟''

''تم نے سن لیا؟''

توتوش ایک لمحہ سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح اعلیٰ طبقے کے پانچ افراد اپنے سرہانے روٹیاں پانے کے بعد مفقود الخبر ہو گئے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ جعفرک کو قتل کرنے کے بعد روٹیاں میرے سرہانے رکھی گئی تھیں۔'' عمر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ''یقیناً یہ ایک ہی شخص کا کام تھا۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔ میں آپ کی تائید کرتا ہوں۔'' توتوش نے سوچ کر گردن ہلائی۔ جعفرک بھی راتیں اسی مسجد کے قریب گذارتا تھا جہاں سے تین افراد گم ہوئے تھے۔''

''تو پھر یہ فدائیوں کا کام ہونا چاہیے۔'' عمر نے رائے ظاہر کی۔

ان الفاظ کا توتوش پر عجیب طرح کا اثر ہوا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس کے سارے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ''کس..... کس کا.....؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

فدائی۔ نشہ آور عرق پینے والے۔ موت و حیات کے مالک حسن بن صباح کے خنجر بردار۔ جو قلعہ الموت کا مالک ہے۔ جسے لوگ سبعیہ (باطنیوں) کا قائد بھی کہتے ہیں۔

توتوش نے خوف کے فوری اثر کے تحت ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اُٹھا کر بڑی لجاجت سے کہا ''عالیجاہ! یہ نام زبان سے نہ نکالئے۔''

عمر نے خاموشی کے ساتھ توتوش کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ''تو پھر تجھے سبعیہ کا علم ہے۔ اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ یہ انہی کا کام ہے؟''

''فلکیات کے ماہر میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں نے تو صرف چند افواہیں سنی ہیں۔ لیکن لوگ یہ نام سن کر جو عالیجاہ نے ابھی ارشاد فرمایا۔ ڈر کے مارے کانپنے لگتے ہیں۔''

''تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم ان سبعیہ کے متعلق کیا کیا جانتے ہو۔''

جو باتیں توتوش کے دماغ میں تھیں انھیں اُگلوانا آسان کام نہ تھا۔ وہ سبعیہ سے بھی اتنا ہی خوف زدہ تھا، جتنا عمر سے۔ بہر حال بڑی ہمت کر کے اس نے حالات

بیان کرنے شروع کیے لیکن بار بار وہ چلمن کی طرف اس طرح دیکھتا جاتا تھا جیسے اس کے پیچھے کوئی اژدہا چھپا بیٹھا ہو۔

نظام الملک نے ان کے متعلق تحقیقات کا حکم دے رکھا تھا۔ توتوش نے زور دیتے ہوئے بتایا۔ کیونکہ نظام الملک کا خیال تھا کہ حسن کے پیرو مسلمہ عقاید کے شدید مخالف ہیں۔ نظام الملک نے اپنی کتاب میں بھی اس پراسرار جماعت کا تذکرہ کیا تھا جو خفیہ طور پر مصر سے آ کر ایران پر حملہ آور ہوئی تھی۔ اس نے کتاب کے اس حصے کو سربمہر کر دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ اسے اس کے مرنے کے بعد پڑھا جائے۔ وہ یعنی توتوش تو محض ایک خادم تھا جس کا کام احکام کی تعمیل کرنا ہوتا ہے۔

حسن نے توتوش کی تحقیقات کے مطابق۔ حسن نے سیدھے سادے مسلمانوں اور وفادار ملازمان شاہی کو خوف زدہ کر کے قوت واقتدار حاصل کیا تھا وہ مال دار تاجروں کو دھمکا کر بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ فدائیوں کے ذریعے ایسے افراد کے سرہانے جنھیں وہ اپنا نشانہ بناتا تھا سوتے میں تازہ روٹیاں رکھوا دیتا تھا۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ شیخ الجبل کو معتد بہ رقم ادا کریں۔ دوسرے دن ان کے دروازے پر ایک شخص فقیر کے بھیس میں مالک مکان کے ہاتھ سے خیرات لینے کے بہانے آتا تھا اور روٹی کے ٹکڑے کے بجائے اسے سونے کے سکوں کی تھیلی ملتی تھی۔ تب کہیں اس مکان کے سر سے بلا ٹلتی تھی۔

ہم یہ نہیں سمجھ پائے کہ آیا یہ حسن کا ذاتی طریقہ عمل ہے یا محض ان لوگوں کی چال ہے جو اس کے ملازم یا پیرو ہیں۔ ہم نے اسے گھیرنے اور پکڑنے کی بہت کوششیں کیں۔ مگر بے سود۔ اس کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ رے کے ایوان حکومت میں بے دھڑک داخل ہو۔ نظام الملک سے بالمشافہ گفتگو کی..... اس کی صورت بھی کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ ہم نے اس کے مستقر کا پتہ لگانا چاہا۔ لیکن وہ اس طرح غائب ہو گیا جیسے ریگستان کی سطح سے برف۔

اصفہان میں یہ ڈرانے، دھمکانے اور خوفزدہ کرنے کا سلسلہ کچھ ہی دن پہلے شروع ہوا تھا۔ باوجود انتہائی کوشش کے توتوش ان پانچ گم شدہ افراد کا پتا چلانے سے

قاصر رہا تھا جو خراج ادا نہ کرنے کی پاداش میں گم ہو گئے تھے۔ اگر جعفرک کی طرح قتل کر کے ان کی لاشیں کہیں پھینک دی جاتیں تو صبر آ جاتا۔ ظلم و تشدد کی حد یہ تھی کہ انھیں دن دہاڑے سر بازار اغوا کر لیا گیا تھا اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ تو توش کا خیال تھا کہ شہر میں کسی مقام پر حشیشین نے اپنا اڈا قائم کر رکھا تھا لیکن اس کے پاس ظاہری طور پر اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا۔

''تو نے ان کا کیا نام لیا؟'' عمر نے پوچھا۔

''حشیشین ..... حشیش (بھنگ) استعمال کرنے والے۔ یہی تو وہ جنس فاسد ہے جس کے زیر اثر وہ لوگ سنگین جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔''

عمر کو اس شراب کا خیال آیا جو اس نے الموت میں پی تھی۔ اسے وہ تین فدائی بھی یاد آ گئے جو قلعے سے چھلانگ لگا کر خلا میں گر پڑے تھے۔ بیشک الموت کے رہنے والے حشیشین ہی تھے..... حشیش کے غلام۔

''شاید آج'' تو توش نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا'' فقیر بھیک لینے آئے گا۔ بہتر ہے کہ خاموش رہا جائے اور اسے کچھ رقم ادا کر دی جائے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ وہ مجھے رقم ادا کرنے پر مجبور نہیں کریں گے۔''

''اوہو..... میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا۔ اقرونوس تاجر پہلے ہی سے حضور والا کے تجارتی قافلے کا مال و اسباب اور نقدی لے کر فرار ہو گیا ہے۔ وہ آپ کی دولت کا خراج پہلے ہی وصول کر چکا ہے۔ تاہم وہ کچھ اور طلب کرنا چاہیں گے''

''لیکن اس مرتبہ انہیں جعفرک کی موت کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔''

تو توش نے اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے تسبیح پھراتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔'' بہتر ہے کہ قہر کی آگ کو دور اندیشی کے پانی سے بجھا دیا جائے۔'' آپ ان کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟ بڑے بڑے مبلغ اور صاحب اقتدار رہنما عوام کے رو برو سبعیہ کے خلاف زہر اگل چکے ہیں لیکن بالآخر وہ چپ سادھنے پر مجبور کر دیے گئے۔ اگر اس سلسلے میں کبھی ان کی زبان کھلی بھی تو انہوں نے سبعیہ کی تعریف و توصیف ہی بیان کی۔ کون جانتا ہے کہ ایسا کیوں..... اور کیسے ہوا؟ گھنے جنگل میں سانپ کا بل کون

تلاش کر سکتا ہے؟ یہ حشیشین ساربانوں، تاجروں اور درویشوں کے بھیس میں ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں۔ جناب والا کے محل سرا میں بھی ان میں سے ایک شخص اس وقت خدمت گار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔''

عمر کو معاً اس خواجہ سرا کا خیال آیا جو قصر کو چک میں حرم کی نگرانی پر مامور تھا اور اسے یہ شبہ ہونے لگا کہ شاید اس کے خادموں ہی میں سے کسی نے گذشتہ رات روٹی اور خنجر مع پیغام کے اس کے سرہانے رکھ دیئے تھے۔

قزوین اور رے کے عقبی کوہستانی علاقے پر انہوں نے پہلے ہی سے خوف طاری کر رکھا ہے۔ ان کے مخبر نیشاپور پہنچ چکے ہیں اور یہاں اصفہان میں بھی ویزہ کوہ کی چوٹی پر قدیم آتشکدے کے کھنڈروں میں انہیں دیکھا گیا ہے۔ اور اصفہان کے یہ پانچ افراد کس طرح غائب ہوئے؟ کاش میں یہ معلوم کر سکتا! انہیں کھلم کھلا قتل نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ انہوں نے چیخ پکار بھی نہیں مچائی۔ ان کا کوئی پیغام بھی موصول نہیں ہوا۔ وہ اصفہان کی شہر پناہ سے باہر بھی نہیں گئے۔ کوئی نشانی ایسی نظر نہیں آتی جس کی مدد سے ان کا سراغ لگایا جا سکے۔ یہ بڑا سنگین واقعہ ہے۔ عالیجاہ دانشمندی سے کام لیجیے اور شیخ الجبل..... کے آدمیوں سے الجھنے کی کوشش نہ کیجیے۔''

''وہ جادو اور فریب سے کام لیتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یعنی انہی کی طرح راز داری کے ہتھیار سے ان پر حملہ کیا جائے۔''

''آپ..... آپ ان کا سراغ لگائیں گے؟''

''نہیں۔ وہ خود ہی سامنے آ جائیں گے۔''

تو توش جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ عمر خیام بھی ایک پوشیدہ قوت کا مالک ہے اور وہ جادو کا جواب جادو سے دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن تو توش اس آویزش سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ ''عالیجاہ!'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا'' یہ سب کچھ اس وقت آپ کے گوش گذار کر کے میں نے پہلے ہی اپنی زندگی خطرے میں ڈال لی ہے۔ اور مخفی قوتوں کے معاملے میں بھی میں ..... میں کورا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے!''

جمعہ کے شام کو عمر دبے پاؤں ایک چور دروازے سے نکل کر باہر آ گیا۔ صرف عائشہ کو اس بات کا علم تھا کہ اس نے اپنی ہیئت تبدیل کر لی تھی۔ ایک شخص بڑے چوک سے گزرا۔ وہ صحرا نژادوں کی طرح لہرا کر چل رہا تھا۔ قبیلۂ قریش کے عربوں کی طرح اس نے سیاہ جلا بیہ باندھ رکھا تھا۔ ڈھیلی ڈھالی اونی عبا میں اس کا جسم چھپا ہوا تھا اور ایک چھوٹا خمدار خنجر اس کی کمر سے لٹک رہا تھا۔ عقال چہرے کو چھپائے ہوئے تھا۔ حتیٰ کہ اس کی آواز میں بھی قبائلیوں کی سی کرختگی تھی۔

دو گھڑی رات گئے۔ عشا کی نماز کے وقت عمر سینکڑوں نمازیوں کے ساتھ جامع مسجد میں موجود تھا۔ نماز کے بعد وہ ہجوم کے ہمراہ مسجد سے باہر آیا اور گھوم کر مسجد کی پشت والی گلی میں داخل ہو گیا۔ کچھ لوگ اس کے آگے جا رہے تھے۔ گلی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے یہ دیکھنے کے لیے اپنی رفتار سست کر دی کہ کتنے لوگ گلی کی بائیں جانب مڑ کر ایک مخصوص دروازے میں داخل ہو رہے ہیں۔

ایک آدمی ہاتھ میں عصا لیے، اندھوں کی طرح اوپر کو منہ اٹھائے دہلیز پر بیٹھا تھا۔ عمر اس کے عین سامنے جا کر رکا اور اس سے مخاطب ہو کر کہا ''کیا ابن العطاش کا مکان یہی ہے؟''

''ہاں۔ اے رفیق صحرا! بن العطاش سے تجھے کیا کام ہے؟''

''میں نے سنا ہے کہ یہاں ایک شخص بہشت کے حالات بیان کرتا ہے۔''

اندھا ہنسی روکنے کے انداز میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پھدکا..... اوہو ہو..... جنت کا حال۔''

وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور عمر اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا اندر چلا گیا۔ قریب ہی کہیں کوئی شخص لپک لپک کر باتیں کر رہا تھا لیکن نظر نہ آتا تھا۔ عمر کے پھیلے ہوئے بازو ایک بھاری پردے سے مس ہوئے جسے کھینچ کر اس نے ایک طرف سرکا دیا۔ ایک دم کسی نے ایک روشن شمع اس کے چہرے کے سامنے کر دی۔ ایک دبلا پتلا درویش عمر کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ اس جائزے سے مطمئن ہو گیا تھا کیونکہ اس نے عمر کو ایک دوسرے پردے کی طرف جانے کا اشارہ کیا جو اس کی پشت کی

طرف لٹک رہا تھا۔ پردہ ہٹا کر ایک وسیع و عریض کمرے میں داخل ہو گیا جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ سب ایک قالین کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جو ان سے خاصے فاصلے پر لٹک رہا تھا۔

اس قالین کے سامنے ایک مجذوب آہستہ آہستہ ناچ رہا تھا اور بلند آواز سے رو رو کر اپنا سینہ پیٹتا جاتا تھا..... ایک نیم دیوانہ سا، آوارہ گرد، چیچک رو درویش، جس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں۔ رقص کی حالت میں شہادت حسینؓ پر نوحہ خوانی بھی کرتا جا رہا تھا۔

عمر کے لیے یہ نوحہ خوانی نئی نہ تھی۔ مجذوب کی سمت بڑھتے ہوئے اس نے مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی وہاں اسے کوئی ایسی بات نظر نہ آئی جس سے مقتولوں کا سراغ لگانے میں مدد مل سکے۔ حاضرین میں کچھ عام شہری تھے۔ چند سپاہی اور ملا بھی وہاں بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ لیکن ان میں سے ہر شخص ایک عجیب انتظار و اضطراب کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے ہاتھوں سے مجذوب کی آواز کی لے پر بھڑکے ہوئے جذبات کے زیر اثر تال بھی دیتے جا رہے تھے۔

جلتے ہوئے عود کا دھواں ایک انگیٹھی سے بلند ہو کر ساری فضا کو معطر کر رہا تھا۔

اے وائے حسینا،

اے وائے حسینا

مجمع نے ایک آواز ہو کر دہرایا۔ ساری فضا اس نوحے سے گونج اٹھی۔

آہستہ آہستہ کمرہ لوگوں سے بھر گیا۔ اور مجذوب نے اپنا رقص بند کر دیا۔

''لوگو ادھر دیکھو! مجذوب کی آواز گونجی۔'' مردہ گفتگو کرنے والا ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دبیز پردہ ایک طرف سرکا دیا۔ جو ایک طویل سلاخ کے سہارے لٹک رہا تھا۔ پردہ ہٹتے ہی ایک محرابی دروازے میں سے ایک دوسرا کمرہ نظر آنے لگا جہاں چراغ دان کے پیچھے ایک بہت بڑا کانسی کا طشت رکھا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ طشت خون سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ طشت کے بیچوں بیچ انسانی چہرہ رکھا تھا جس

کی آنکھیں بند تھیں۔ اور سر منڈا ہوا تھا۔

ایک دم مجمع سے حیرت و استعجاب کی آوازیں بلند ہوئیں۔ زرد رنگ چہرہ پر مشتمل ایک سر طشت میں بے حس و حرکت سیدھا ٹکا ہوا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک عام انسان کا سر نظر آتا تھا۔

''خاموش!'' درویش نے کرخت لہجے میں ہدایت کی اور..... پھر..... چہرے کی بند آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ اور دائیں بائیں گردش کرنے لگیں۔ اب مجمع کو خاموش رکھنے کے لئے کسی ہدایت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کمرے میں یکا یک سناٹا چھا گیا۔

طشت میں رکھے ہوئے سر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ''مسلمانو! اس کا قصہ سنو جو نظروں سے پوشیدہ ہے۔''

''یا اللہ'' عمر کے قریب بیٹھے ہوئے ایک ملا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

جب وہ سر آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور ایک ایک کر کے جنت کے راز بیان کر رہا تھا تو عمر دوسرے سامعین کے برعکس، سننے کے بجائے اسے غور سے دیکھنے میں منہمک تھا۔ عمر نے قطعی طور پر یہ محسوس کیا کہ آواز کسی اور شخص کی آ رہی ہے جو طشت کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اور بلاشبہ وہ ایک زندہ انسان تھا۔ جس کا جسم نگاہوں سے اوجھل تھا۔

اس طشت کے سوا شہ نشین میں اور کوئی چیز نہ تھی۔ دیواروں پر چاروں طرف پردے پڑے تھے..... آواز خاموش ہو گئی۔ کھلی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور چہرہ دفعتہً کرخت ہو گیا۔ درویش نے ایک جھٹکے کے ساتھ دبیز پردہ کھینچ کر شہ نشین کو ایک دفعہ پھر ناظرین کی نگاہوں سے چھپا دیا۔

''کرامت'' ایک حیرت زدہ ملا کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''اعجاز'' ''ایک لطیفہ غیبی!'' آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی طرف غیبی اشارہ'' بہت سے لوگوں نے بڑے مؤدبانہ لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ حاضرین میں پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی اور وہ آزادی سے سانس لینے لگے۔ مگر بیشتر لوگ خاموش تھے۔ عمر نے اس حیرت و استعجاب کو شدت سے محسوس کیا جو ہنوز لوگوں پر طاری تھا۔ پھر لوگوں نے اپنے

خیال کے مطابق بحث شروع کر دی۔ ضعیف الاعتقاد افراد کو یقین تھا کہ انہوں نے مردے کی آواز سنی تھی۔ مگر مذبذب لوگ اس بات کا ثبوت طلب کر رہے تھے کہ آیا وہ کسی زندہ انسان کا چہرہ تھا۔

درویش ایک استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سب کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''ثبوت! واللہ اگر یہ معجزہ ہے تو اس کا ثبوت ملنا چاہیے۔''

''خاموش'' درویش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''تمہیں ثبوت بھی مل جائے گا۔''

ایک لمحہ خاموش رہ کر اس نے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ ہر شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور دبیز پردے کو ایک بار پھر سرکا دیا۔ وہ جھکا اور کٹے ہوئے سر کے دونوں کان پکڑ کر اسے اوپر اٹھا لیا آہستہ آہستہ چاروں طرف گھمایا تا کہ ہر شخص اسے دیکھ سکے۔ اور پھر خون سے بھرے ہوئے طشت میں رکھ دیا۔

ایک ملا فوراً سجدے میں گر پڑا اور مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا..... یہی تو وہ سر تھا جو ابھی بول چکا تھا..... تن سے جدا سر.....

''ہم قائل ہو گئے! ہم نے اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''

عمر اٹھا اور بڑھ کر دبیز پردے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے دوستو''! اس کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی بلند ہوئی۔ ''یہ کوئی معجزہ یا کرامت نہیں ہے۔ یہ تو محض سڑکوں پر تماشا دکھانے والے مداری کی شعبدہ بازی ہے۔ یہ مردہ نہیں بول رہا تھا۔ بلکہ جو بول رہا تھا وہ اب مر چکا ہے..... اچھا لو دیکھو!''

بظاہر شعبدہ بازی کے آثار نظر نہ آتے تھے لیکن سوائے شعبدہ بازی کے یہ اور کوئی چیز ہو بھی نہ سکتی تھی۔

عمر نے دبیز پردہ ہٹایا۔ اور آگے بڑھ کر اس بے حس و حرکت سر کو مع طشت کے اوپر اٹھا لیا۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ طشت کے عین نیچے پتھر کے فرش میں ایک فٹ لمبا چوڑا سوراخ بنا ہوا تھا۔

مجذوب نما درویش مارے غصے کے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اصفہان کے باشندے جو اس وقت وہاں موجود تھے دوڑ کر عمر کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور بڑی حیرت سے اس گڑھے کو دیکھنے لگے۔ عمر نے ایک روشن قندیل اٹھائی اور شہ نشین پر لٹکے ہوئے سارے پردے ایک ایک کر کے ہٹا دیئے۔ سامنے دیوار میں اسے ایک دروازہ دکھائی دیا۔ ایک ہاتھ میں قندیل لیے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی لو کو ہوا کی زد سے بچاتا ہوا وہ دوڑ کر اس دروازے میں داخل ہو گیا۔ چند گز راستہ طے کرنے کے بعد اس کے پاؤں پھسلنے لگے۔ پتھر کا فرش خون بہنے سے سیاہ اور گیلا ہو رہا تھا۔

''جان عزیز کی قسم، اے عرب! تو نے حقیقت کو پا لیا ہے''۔ عمر کو پہلو میں کھڑے ہوئے سپاہی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہاں ضرور کسی کو قتل کیا گیا ہے۔ اور وہ چہرہ بھی تو ہنوز گرم ہے۔ لیکن اس کا جسم کدھر غائب ہو گیا۔''

سب لوگ عمر کے پیچھے آ گئے۔ جب وہ عقبی کمرے کی تلاش لے رہے تھے تو ہر شخص پر ایک نامعلوم سا خوف طاری تھا۔ آگے بڑھے تو چند رہائشی مکان نظر آنے لگے جن سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھلا ہوا دروازہ بھی دکھائی دیا۔ اس دروازے سے گذرنے پر ایک زینہ ملا۔ جب وہ زینہ طے کر کے نیچے پہنچے تو قندیل کی روشنی آخری سیڑھی کے بالکل نیچے ایک لاش پر پڑی، جس کا سر، تن سے جدا تھا اور جو فدائیوں کی سفید عبا میں ملبوس تھی۔

اوہو۔ اسے قتل کر کے یہاں پھینک دیا گیا ہے۔'' سپاہی نے جھلا کر کہا۔ ''بھائیو۔ ذرا دیکھ بھال کر آگے بڑھنا۔ کہیں تمہیں بھی آدم خور کتے نہ لپٹ جائیں۔''

سپاہی نے ایک اور بند دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہونا چاہا۔ تو اسے ایک شدید قسم کی بو آئی۔ جو عود کی خوشبو سے زیادہ تیز اور مختلف تھی۔ ''ارے! یہاں تو اور کئی لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ جن کے سر ندارد ہیں۔ اف! خبیث کتو خدا تمہیں غارت کرے۔''

سپاہی نے لاتیں مار مار کر دروازہ توڑ ڈالا اور روشن قندیل لے کر اندر داخل ہو گیا۔ ایک، دو ..... پانچ۔ لیکن ان کی ظاہری وضع قطع ایک دوسرے سے مختلف تھی۔

''نہیں نہیں۔ ذرا مجھے بھی دیکھنے دو۔'' ایک ملا کی آواز گونجی جو مجمع کو چیرتا پھاڑتا سب سے آگے پہنچ گیا تھا۔ ''خدا کی پناہ! یہ امین بیگ کی لاش ہے۔ اور وہ ..... شیر افگن ہے جو اکثر مسجد میں آتا جاتا تھا۔ بے شک۔ یہ ان پانچوں آدمیوں کی لاشیں ہیں جو کچھ دن پہلے اصفہان سے مفقود الخبر ہو گئے تھے۔ ان کتوں کا سراغ لگانا چاہئے جنہوں نے ان کی جانیں لی ہیں۔

لیکن اس افراتفری میں درویش کو چپکے سے کھسکنے کا موقع مل گیا۔ اور غیض و غضب میں بھرے مجمع کو وہاں سوائے ایک نابینا بوڑھے کے اور کوئی نہ ملا۔ جو اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا تھا اور اپنے مفرور ساتھیوں کو آواز دیتا جاتا تھا جو اسے اکیلا چھوڑ کر رفو چکر ہو گئے تھے۔

عمر کو اس رات بالکل نیند نہ آئی جعفرک کی مسخ شدہ لاش کا تصور اسے رات بھر پریشان کرتا رہا۔ اسے ان پانچ امیروں کے قتل کا اتنا افسوس نہ تھا جعفرک کی موت سے وہ بے حد متاثر تھا۔ وہ جعفرک درباری مسخرا جس کی یاد سے نہ معلوم زندگی کی کتنی تلخیاں اور مسرتیں وابستہ تھیں ..... اور جو ایک کتے کی موت مارا گیا تھا..... خیام اندر ہی اندر غصے سے کھولتا رہا۔

اگلی صبح کے وقت سڑکوں پر جب حشیشین کو مارو پکڑو کا شور بلند ہوا اور ..... تو توش اپنے گھوڑے کو بڑے جوش و خروش سے ادھر ادھر دوڑاتا پھر رہا تھا۔ نظام الملک اپنی خلوت سے نکل کر ملک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان المعظم فوراً حکم فرمایئے کہ تمام ملک میں حشیشین یعنی سبعیہ کو جہاں کہیں بھی وہ ملیں ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے۔'' اس نے بڑی منت و سماجت کے ساتھ سلطان سے درخواست کی۔ ''غور فرمایئے کہ دولت پناہ کی بنفس نفیس موجودگی کے باوجود ان کا سرغنہ کس طرح کھلے بندوں حضور کی رعایا سے تاوان وصول کر رہا ہے۔''

ملک شاہ کی نظروں میں سبعیہ کی حیثیت ایک اسلامی فرقے سے زیادہ نہ تھی اور وہ بھی ایک غیر معروف فرقہ۔ لیکن نظام الملک نے اس امر پر اصرار کیا کہ اس فرقے کا اصل مقصد تخت و تاج پر قبضہ اور حدود سلطنت میں خلفشار پیدا کرنا ہے۔

"نہیں" سلطان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ہر اس کتے کا پیچھا کروں جو میرے گھوڑے کے کھروں کو چاٹتا ہے۔ ان مذہبی دیوانوں کے پاس اتنا اسلحہ اور فوج کہاں ہے کہ وہ میرے لشکر کے ہزاروں تیغ آزماؤں کا بھی مقابلہ کر سکیں۔"

نظام الملک نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے قبضے میں ایک بہت مضبوط قلعہ ہے جو شمالی کوہستانی علاقے میں کسی جگہ واقع ہے اور وہاں انہوں نے اپنا خزانہ، اسلحہ اور دوسرا سامان جنگ محفوظ کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں پراسرار حسن بن صباح بہت پہلے نصیب دشمناں، سلطان کے زوال، اسلام کے ایک نئے دور اور روشن مستقبل کی پیشین گوئی بھی تو کر چکا ہے۔

"اگر میں ہر اس نام نہاد پیغمبر کو جو نئے دور کی پیشین گوئی کرتا ہے سولی دینا شروع کر دوں تو" سلطان نے ترش رو ہو کر کہا" مجھے شکار کے لیے بھی مشکل ہی سے وقت مل سکے گا۔ اگر یہ حسن ایسا ہی بہادر ہے تو پھر کھل کر میدان میں آ جائے۔ تلوار کے ایک ہی وار سے اس کے پانچ ٹکڑے نہ کر دوں تو بات ہے۔"

"لیکن اس کے قلعے کے متعلق کیا ارشاد ہے؟"

ملک شاہ نے چڑ کر تلخی سے جواب دیا۔" میری سمجھ میں نہیں آتا کس مخبر کی داستان کا یقین کروں۔ تو توش اپنے سر اور اپنی داڑھی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ حشیشین کا نہ کوئی سرغنہ ہے نہ کوئی مخصوص گڑھ۔ اگر حسن اقتدار چاہتا ہے تو میری قلمرو میں اس قسم کے لاتعداد اشخاص ملیں گے..... اچھا اب تم جا سکتے ہو۔"

بوڑھے نظام الملک نے رخصتی سلام کرتے ہوئے محسوس کیا کہ ملک شاہ چونکہ ایک دفعہ اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھ چکا ہے اور اس لیے اب وہ اس کی کسی بات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا۔" بہر حال اگر عالی جاہ مناسب خیال فرمائیں تو" اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"ان کھنڈروں کا ایک جائزہ لے لیجیے جو اصفہان کے شمال میں ویزکوہ پر واقع ہیں۔ کیونکہ حشیشین کا یہ طریقہ ہے کہ وہ آپ کے قلمرو میں تمام بڑے شہروں کے قریب

قلعہ بند مقامات پر اپنے اڈے بناتے ہیں اور انہیں ویزکوہ پر دیکھا بھی گیا ہے۔"

ملک شاہ نے بھی اثنائے شکار میں ان بنجر پہاڑیوں پر ایک سنگین عمارت کے کھنڈر دیکھے تھے۔ اس بوسیدہ عمارت کے متعلق بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس میں جنات رہتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے آتش پرستوں کا قدیم معبد سمجھتے تھے۔

"ٹھیک ہے" ملک شاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا" میں کسی وقت وہاں جا کر دیکھوں گا۔ میں پہلے ہی سے وہاں اپنی فوج کے لیے ایک چھاؤنی بنانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔"

کسی افسر یا توتوش کو وہاں بھیجنے کے بجائے ملک شاہ نے عمر کو حکم دیا کہ وہ اصفہان سے مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ ہمراہ لے کر جائے اور اس ویران کھنڈر کا معائنہ کرے۔ عمر جو کچھ کہتا تھا سلطان اس پر اعتبار کرتا تھا اور اسے اپنے حق میں نیک فال سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے یہ افواہ بھی سنی تھی کہ عمر ایک دفعہ پہلے بھی ان اجنبی بے دینوں کی کسی پوشیدہ پناہ گاہ کا پتا لگا چکا ہے اور اپنی عقل و دانش کے ذریعے ان کا سحر باطل کر چکا ہے۔ اس سلسلے میں عمر جو کچھ بیان کرے گا اس پر یقین کرنے میں اسے کوئی تامل نہ ہوگا۔

سلجوقی سپاہیوں نے اس ویرانے کا چپا چپا چھان مارا۔ تاریک گوشوں میں اپنے نیزے ڈال ڈال کر دیکھے لیکن انہیں حشیشین کا کوئی سراغ نہ ملا۔ چند گڈریے اور آوارہ گرد خاندانوں کے کچھ افراد انہیں وہاں ضرور نظر آئے جو ان کھنڈروں کو عارضی مسکن کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہاں کسی قسم کا چھپا ہوا اسلحہ بھی دستیاب نہ ہوا وہاں کے خوف زدہ باشندوں نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ انہوں نے اس سے پہلے نہ تو "الموت" کا نام سنا ہے اور نہ حسن بن صباح نام کے کسی جھوٹے نبی کا۔

ان سب باتوں کے باوجود عمر کو ایک عجیب قسم کا شبہ سا تھا۔ وہاں بالکل ایسی ہی ایک قربان گاہ تھی جیسی اس نے الموت میں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اصفہان میں ابن العطاش کی حویلی حشیشین کے اڈے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ پھر یہ کہ دو چٹانوں کے درمیان ایک گہرے شگاف سے وہاں ایک چشمہ بھی

ابل رہا تھا۔ یہ تمام آثار الموت کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ ان خانہ بدوش گلہ بانوں میں نوجوانوں کی خاصی تعداد ہے۔ عمر نے ایک ایک شخص کے چہرے کو غور سے دیکھا لیکن کسی کو پہچان نہ سکا۔

''اگر محترم خواجہ کی اجازت ہو تو کچھ عرض کروں'' ایک سپاہی نے بڑے ادب سے عرض کیا۔'' مینار کی دیواروں پر کچھ شکلیں کھدی نظر آتی ہیں۔ خدا جانے! وہ دیوتاؤں کی شبیہیں ہیں یا جادو کے اشکال۔''

جب عمر گھوڑے سے اتر کر مینار کی پہلی منزل میں داخل ہوا تو مذکورہ سپاہی نے ان نقش و نگار کی طرف اشارہ کیا جو قد آدم بلندی پر دیواروں میں کھدے ہوئے تھے۔ مینار کی گولائی میں دیواروں پر چاروں طرف نقش نظر آرہے تھے۔ بادی النظر میں ان کے اول و آخر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بیک نظر عمر کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ نقوش کس قسم کے ہیں۔

ایک بہت بڑا عقرب، قوس حوت، گوسفند (برج جدی) غرض کہ وہاں بارہ برجوں کی شکلیں موجود تھیں جنہیں کسی نامعلوم ہاتھ نے نہ جانے کب دیواروں پر کھودا تھا۔ ہر شکل کے نیچے ایک ایک برنجی نکلی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید کبھی ان پر کچھ چیزیں لٹکی ہوئی ہوں گی۔

عمر نے اپنے ہمراہیوں کو بتایا کہ وہ سب ستاروں (آسمانی برجوں) کی شکلیں ہیں جنہیں اسلام سے قبل کسی نے وہاں بنایا ہوگا۔

''تو پھر آقا'' اس سپاہی نے جس نے انہیں دریافت کیا تھا عمر سے کہا۔'' یہ سب اعمال شیطانی کا نتیجہ ہیں۔ اگر حکم ہو تو ہم انہیں موگریوں سے مسمار کر دیں۔''

''نہیں نہیں۔ ان سے کسی قسم کا برا اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔''

یہاں ان کی موجودگی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ عمر نے سوچا یقینی طور پر اس قدر احتیاط سے انہیں بیک وقت تو دیواروں کی سطح پر نگینوں کی طرح جڑا نہیں گیا۔ کسی وجہ سے تو انہیں بنایا گیا ہوگا۔ اس مینار کے بنانے والے آتش پرستوں ہی نے شاید انہیں دیواروں پر کھودا ہو۔ ممکن ہے ن کا تعلق کسی ایسی مذہبی تقریب سے ہو جسے اب

دنیا بھول چکی ہے۔

مینار کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اور ان بروجی اشکال پر نظر جمائے عمر نے آہستہ آہستہ اپنی جگہ گھومنا شروع کیا۔ اور اسے ان اشکال کا صحیح اندازہ ہو گیا جو برج حمل سے شروع ہو کر برج حوت پر ختم ہوتی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ غالبا مینار کے کسی روشندان سے کسی خاص انداز سے سورج کی روشنی ان پر پڑتی ہوگی جس کے مدد سے موسموں کا شمار کیا جاتا ہوگا..... اس نے اپنی گردش کی رفتار اور بھی کم کر دی۔ اس کے ہمراہی بڑے حیرت و استعجاب سے اس کی اس حرکت کو دیکھ رہے تھے اور ساتھ ہی سوچ رہے تھے کہ شاید علم نجوم کا ماہر کوئی فوق الفطرت عمل کرنے میں مصروف ہے۔ یکا یک عمر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''خواجہ! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' شکلیں دریافت کرنے والے سپاہی نے عمر سے پوچھا۔'' کیا ان میں کوئی پیغام پوشیدہ ہے؟ کیا ہمارے قدموں کے نیچے کوئی خزانہ دفن ہے؟''

''پیغام'' عمر نے جواب دیا'' خدا کی طرف سے ہے اور اسے اس وقت بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

بہت ادب سے ''امان'' ۔''امان'' کہتے ہوئے وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔ عمر مینار سے باہر نکل آیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کٹر سے کٹر ملا سے بھی یہ تسلیم کرا سکتا تھا کہ زمین گردش کرتی ہے۔

اس وقت اس نے جعفرک کی موت کا غم دل سے بھلا دیا۔ حشیشین کے خیال کو دماغ سے نکال دیا۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے اس امر کی کوشش کی کہ اسے کسی طرح ملک شاہ سے بیت النجوم واپس جانے کی اجازت مل جائے تا کہ وہاں پہنچ کر وہ اپنے اس نئے نظریئے کا علمی تجربہ کر سکے۔

تیئسواں باب:

دم دار ستارہ

تقدیر کا پہیہ آہستہ آہستہ گردش کرتا رہا۔ انسانی زندگیاں مقررہ وقت پر اس طرح ختم ہوتی رہیں جیسے تیز ہوا چراغوں کی روشنی اُڑا لے جاتی ہے۔ نئی نئی ننھی ننھی جانیں روتی چیختی دنیا میں آتی رہیں۔

سلطان نیشا پور کی جانب سفر کر رہا تھا۔ شاہی فراش ہر شام استراحت سلطانی کے لیے بلند خیمے نصب کرتے، ہر صبح انہیں اُکھاڑ کر لپیٹتے اور آگے بڑھ جاتے۔

نظام الملک اپنی کتاب کے نئے ابواب لکھنے میں مصروف تھا۔ وقت کا دھارا آہستہ آہستہ بہتا رہا۔ کچھ لوگ عزت وافتخار حاصل کرتے رہے۔ کچھ ذلت و رسوائی کا شکار ہوتے رہے۔ کچھ مسرت وشادمانی سے لطف اندوز ہوتے رہے کچھ رنج ومصائب کا..... سلطان کے پڑاؤ کے عین اوپر ایک دمدار ستارہ نمودار ہوا۔ ملک شاہ نے فوراً عمر کو طلب کیا تا کہ وہ اس کے اثرات کی تشریح کر کے فال نکالے۔

''یہ مصائب کی نشانی ہے'' منجم نے سلطان کو بتایا۔ آگ کی طرح یہ روشن ستارہ مغرب کی طرف سے برج عقرب میں داخل ہوا ہے۔ ملک شاہ نے بھی دیکھا کہ ایسا ہی تھا۔ اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے ایک امیر کو حکم دیا کہ وہ فوج کی ایک بھاری جمعیت لے کر قزوین کے عقب میں شمالی کوہستانی علاقے میں جا کر حشیشین کے صدر مقام یعنی قلعہ الموت کو تلاش کرے اور اسے بالکل مسمار کر دے۔

ملک شاہ کے خیال میں فی الوقت وہی سب سے بڑا خطرہ تھا۔ اور حقیقتاً حسن مصر سے آیا تھا جو سلجوقی مملکت کے مغرب میں واقع تھا۔ جنگ جو ترک، اس وقت ایک لمحے کے لیے خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے شکار کے بہانے نیشا پور جانا ملتوی کر دیا۔ اور کھلے میدان میں پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گیا۔ ایسی صورت میں بھلا وہ عمر کو وہاں سے کہیں جانے کی اجازت کیوں دیتا۔

پورا ایک مہینہ گزر گیا اور جب نیا چاند ایک روپہلی نیمچے کی طرح آسمان پر نمودار ہوا تو شاہی پڑاؤ میں حشیشین کی تلواریں میاں سے نکل چکی تھیں۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ ایک نوجوان دیلمیوں کا سا لباس پہنے فریادیوں کی طرح روتا پیٹتا امرا کی خیمہ گاہ میں وارد ہوا اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا اس نے نظام الملک کے خیمے میں داخل ہو کر تلوار کے ایک ہی وار میں بوڑھے سیاست دان کا کام تمام کر دیا۔ فوراً ہی اسے محافظوں نے آلیا اور اس کی تکا بوٹی کر کے رکھ دی۔ لوگوں نے سنا کہ وہ اس خون خرابے کے دوران میں جنت کے متعلق کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''بے شک'' ملک شاہ نے بہت ہی فکر مندانہ لہجے میں کہا''۔ ہم پر آفت نازل ہو کر رہی اور شگون پورا ہوا۔''

اس نے واقعی خلوص کے ساتھ نظام الملک کا سوگ منایا۔ اور اس فوج کو جو قلعہ الموت کی پہاڑیوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھی تیز رفتار قاصدوں کے ذریعے حکم بھیجا کہ قاتلوں کی جائے پناہ کو مسمار کرنے کی کسی کوشش میں کوتاہی نہ کی جائے۔

اس نے نظام الملک کی کتاب کا سر بمہر باب پڑھا اور اسے یقین ہو گیا کہ سبعیہ کا نیا مذہب واقعی اس کی حکومت کے لیے ایک شدید خطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ملک شاہ نے عمر کے رو برو اس بات کا اعتراف کیا کہ ''نظام الملک واقعی ایک وفادار خادم تھا۔ میں یہاں ایک ماہ قیام کر کے اس کا سوگ مناؤں گا۔''

عمر کی خواہش کے مطابق ملک شاہ نے اسے ایک ماہ کی رخصت مرحمت فرما کر، نیشا پور جانے کی اجازت دے دی۔

عائشہ کی معیت میں وطن واپس جاتے ہوئے عمر کو خیال آیا کہ دنیا میں کیسے

کیسے طاقتور سلاطین ہو گزرے ہیں۔ اور اس خیال کو اس نے ایک رباعی کے قالب ڈھال دیا۔

قلعہ الموت کے نیچے پہاڑ کے دامن میں منجنیقیں اپنے بھاری بھرکم بازوؤں کو جنبش دے رہی تھیں۔ بڑے بڑے پتھر قلعے پر پھینکے جا رہے تھے جو قلعے کی دیواروں سے ٹکراتے اور پاش پاش ہو کر گرد و غبار کے برقعے میں لڑھکتے ہوئے دریا میں جا گرتے تھے۔

آتش گیر روغن سے بھرے ہوئے آہنی برتن سنسناتے ہوئے ہوا میں اڑ کر قلعے کی چھتوں اور وسیع صحن میں پے در پے گر رہے تھے۔

الموت کی فصیلوں سے جواب میں نیزوں اور تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور اوپر سے بڑے بڑے پتھر نیچے منجنیقوں پر گر کر انہیں ناکارہ بنا رہے تھے۔ شاہی لشکر کو برابر کمک پہنچ رہی تھی لیکن محاصرین کی تمام کوششیں اس کوہستانی قلعے پر کوئی خاص اثر نہ کر سکی تھیں۔

کبھی کبھی حسن بن صباح قلعے میں چلتا پھرتا نظر آ جاتا تھا۔ کسی خفیہ راستے سے وہ بدستور باہر آتا جاتا رہتا تھا۔ قلعے سے باہر اس کی موجودگی کا اکثر علم بھی ہو جاتا تھا۔ راتوں کو اس کے نمائندے رے، نیشاپور اور بلخ جیسے دور دراز مقام تک سفر کرتے رہتے اور پریشاں حال عوام میں یہ کہہ کر اور زیادہ ابتری پھیلاتے کہ سرخ دم دار ستارے کے اثر سے بہت جلد آفات کا نزول ہونے والا ہے۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر پھسلاتے کہ جس ''مہدی'' کا مدتوں سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس کے ظہور کا وقت اب قریب آ گیا ہے۔

خراسان کی عظیم شاہراہ پر درویش سادہ لوح کسانوں کو چپکے چپکے بتاتے پھر رہے تھے کہ جس وقت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ اب دور نہیں۔

مسجدوں اور کارواں سراؤں میں ہر جگہ نظام الملک کے قتل کا چرچا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ نظام الملک کو ملک شاہ کے حکم سے قتل کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اس بات پر مصر تھے کہ نہیں اسے کسی فوق الفطرت ذریعے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ وہ بوڑھا وزیر جو دو بادشاہوں کے عہد حکومت میں کامیابی کے ساتھ ملک کا انتظام کرتا

رہا آج ایک قبر کے گوشے میں آسودہ تھا۔

بے اطمینانی اور خوف کا زہر بڑے شہروں کی حدود سے نکل کر سارے ملک میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اس پریشانی کی اصل وجہ کا کسی کو علم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود پریشانی و بے اطمینانی طاعون کی طرح تیزی سے پھیل رہی تھی۔ اگر ایسے وقت میں ملک شاہ رے یا اصفہان آ کر دربار منعقد کر لیتا تو عوام کی بے اطمینانی کی شدت میں بڑی حد تک کمی واقع ہونے کا امکان تھا۔

لیکن ملک شاہ کو اپنے سیر و شکار کے مشاغل ہی سے کب فرصت تھی۔ بسا اوقات وہ کئی کئی دن اپنے خیمے سے باہر نہ نکلتا۔ اس کے افسر یہ سمجھ رہے تھے کہ نظام الملک کی موت سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اس کے مزاج سے ناواقف تھے۔

بیت النجوم میں عمر خیام ایک نئے نظریئے پر غور کر رہا تھا۔ اس کے عملے کے ریاضی داں اور مہندس جو علم ہندسہ کے مخصوص مسائل پر کام کرنے میں مصروف تھے طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد اپنے آقا کی واپسی پر بے حد خوش تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ عمر اپنے جدید تجربے میں کھویا ہوا ہے جو بادی النظر میں انہیں بچوں کے کھیل کی طرح دل خوش کن نظر آ رہا تھا۔

وہ تجربہ بظاہر ایسا تھا جیسے اوپر سے ڈھکی ہوئی چینی قندیل سے روشنی اور سائے کا مطالعہ جس کا اندازہ قندیل کے اندر جھانکنے سے ہوتا ہے اوپر سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

عمر نے اپنی رصد گاہ کے مدور مینار کی پہلی منزل کو بالکل خالی کرا لیا تھا۔ قدم آدم بلندی پر اس نے دیوار پر چاروں طرف الماری کا سا ایک خانہ بنا کر اس میں ایک سو چراغ روشن کر کے رکھ دیئے تھے الماری کے اس خانے کو چراغوں سمیت اس نے جھلی سے منڈھ دیا تھا۔ اس جھلی پر ایک مصور سے بروج فلکی کی تصویریں بنوائی تھیں۔ اس طرح رات کے وقت جھلی کے اس مدور فیتے کے علاوہ کہیں اور سے روشنی آنے کی گنجائش نہ تھی۔

جب پہلی دفعہ چراغ روشن کیے گئے اور سب ہیئت دانوں اور مہندسوں نے وہاں آ کر دیکھا تو ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بجز اس کے کہ بروجی حلقے کے بارہ حصے جھلی کے پیچھے رکھے ہوئے چراغوں کی روشنی میں ضرور نظر آتے تھے جنہیں ایک بچہ بھی آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

عمر نے مسکراتے ہوئے کہا: ''بیشک ایک بچہ وہ چیز دیکھ سکتا ہے جو ہماری نظر سے پوشیدہ ہے۔''

رصد گاہ کے ہیئت دانوں نے ہر طرح سے اسے دیکھا لیکن کوئی ایسی نئی چیز نظر نہ آ سکی جو انہوں نے پہلی نظر میں نہ دیکھی تھی۔ آپس میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ سارا گورکھ دھندا اس کے علاوہ کوئی چیز نہ تھا کہ سلسلہ بروج فلکی کو بڑے سادہ انداز میں پیش کیا گیا تھا جس کے متعلق ہر شخص کو علم تھا کہ سورج، چاند اور دوسرے سیارے اس راستے سے آسمان کے بسیط گنبد سے گزرتے ہیں۔ اس طرح مصنوعی روشنی کا انتظام کرنے کی عمر نے بیکار تکلیف گوارا کی تھی۔ اسے رات کے وقت آسمان پر ویسے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔

معاونین کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا جب عمر نے بروج فلکی والے کمرے میں ..... جسے اب اس کے رفقا ''دیوان خانہ بروج'' کہنے لگے تھے ..... چند کاریگروں کو اپنی نگرانی میں جگہ جگہ سے فرش کے پتھر اکھاڑنے پر لگا دیا۔ سوائے کاریگروں کے وہاں کسی اور کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک لکڑی کا شہتیر اور بہت سے تختے اندر لائے گئے۔ بڑھیوں نے اس شہتیر میں ایک سرے پر چند سوراخ کیے، ان سوراخوں میں لگانے کے لیے ہتے بنائے گئے۔ اتنے لمبے لمبے ہتے جو ایک بہت بڑی چکی میں لگائے جاتے ہیں۔ آخر میں سوائے دو کے باقی سارے کاریگروں کو رخصت کر دیا گیا۔ یہ دونوں کاری گر ''دیوان خانہ بروج'' کی زیریں منزل میں کئی دن تک مسلسل نہ معلوم کیا کام کرتے رہے۔

اور پھر ایک دن جب عمر نے علامہ غزالی کو بیت النجوم آنے اور چینی قندیل کا تماشا دیکھنے کی دعوت دی تو عمر کے ساتھی ششدر رہ گئے۔ امام غزالی اس وقت جامعہ نیشا

پور کے مدرس اعلیٰ تھے۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

خاصی رات گئے مہمان آنے شروع ہوئے۔ ہر شخص ایک اشتیاق کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے جب کبھی عمر نے اپنے تجربات کا مظاہرہ کرنے کے لیے لوگوں کو بلایا تھا ہمیشہ خوش طبعی کا مظاہرہ کیا تھا۔

رصد گاہ کے ریاضی دانوں اور مہندسوں نے جامعہ سے آنے والے معزز مہمانوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ خصوصاً امام غزالی کا جو حسب معمول اپنی اونی عبا پہنے ہوئے تھے سب نے جھک کر سلام کیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس صوفی منش عالم کے عزو وقار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور اب وہ حجتہ الاسلام کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ بیت النجوم کے عملے کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ عمر امام غزالی جیسی شخصیت کو بروج فلکی کے اس روشن سلسلے کے دیکھنے کی دعوت دے گا۔

عمر نے اس عظیم صوفی کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا۔ اور اپنے ہاتھ سے پھل اور شربت اس کی خدمت میں پیش کیے۔ نوجوان اسلامی قائد نے بھی پر وقار انداز میں جواب دیا۔

''میں نے سنا ہے'' امام غزالی نے فرمایا کہ ''نظام الملک کی ..... خدا مرحوم کی جنت نصیب کرے ..... نگرانی اور سرپرستی سے روگرداں ہو کر آپ باہر تشریف لے گئے تھے تو اصفہان کے قیام میں آپ نے کفار کے طریق پر اعمال سحر کا مظاہرہ کیا تھا۔''

عمر نے سنجیدگی سے کہا ''میرے متعلق نہ معلوم کتنے قصے بیان کیے جاتے رہے ہیں۔ لیکن میری خواہش ہے کہ حجتہ الاسلام کو آج کی شب جو چیز میں دکھانی چاہتا ہوں اسے ملاحظہ فرما کر وہ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ براہ کرم میرے ہمراہ تشریف لائیے۔''

''بسم اللہ'' امام غزالی نے جواب دیا۔

جب وہ مینار کی پہلی منزل میں داخل ہوئے تو منجم کے رفقا اور بزرگ صوفی کے ہمراہی اور معتقدین خاموش کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔ دیوان خانے میں سوائے اس روشنی کے جو جھلی کے مدور غلاف سے چھن چھن کر آ رہی تھی کسی اور روشنی کا انتظام نہ

تھا۔ عمر کے اشارے پر باقی سب لوگ دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گئے۔ صرف دونوں قائد کمرے کے وسط میں کھڑے رہے۔

"کیا آپ بائیں طرف سے داہنی طرف گھوم کر یہ بتا سکیں گے کہ یہ کیا ہے؟ عمر نے امام غزالی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ یہ سلسلہ بروج فلکی ہے۔ وہ برج حمل ہے اور وہ برج ثور ہے اور وہ برج حوت کی شکل ہے۔ مجھے تو سوائے بارہ بروج فلکی کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی جنہیں سلسلے وار ترتیب دیا گیا ہے۔ اور بس۔ امام غزالی نے جواب دیا۔

عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب حجتہ الاسلام براہ کرم وسط میں۔ نہیں بلکہ لکڑی کے اس گول ٹکڑے پر کھڑے ہو جائیں..... ہاں۔ اس طرح پہلے برج کی طرف منہ کر کے۔"

سب لوگ بڑے اشتیاق کے ساتھ آگے جھک کر حیرت آمیز خاموشی سے اس عمل کے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ جھلی کے روشن سر پوش کے سائے میں وہ نصف کے قریب چھپے ہوئے تھے۔ خود امام غزالی سنجیدگی اور قدرے لاپروائی سے کھڑے تھے۔

"اب" عمر نے پست آواز میں کہا، آپ بغیر ہلے جلے۔ یہاں کھڑے رہیے۔ اور جو کچھ پیش آئے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی۔ البتہ یہ مدور کمرہ آپ کے گرد گھومنے لگے گا۔" اور یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔

امام غزالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی انہوں نے سوچا کہ بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اسے محض مذاق سمجھا اور ایک گہرا سانس لے کر انتظار کرنے لگے..... جھلی کا روشن فیتا سچ مچ گردش کر رہا تھا۔

امام غزالی نے اپنے قدموں کے نیچے کسی چیز کو چٹکتے اور دبتے ہوئے محسوس کیا۔ ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور بے ساختہ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ایک گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ سارا گول کمرہ گھومنے لگا۔ جھلی پر بنے ہوئے بروج کی شکلیں ایک ایک کر کے نظر کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ وہ گردش رک گئی اور امام غزالی گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑے۔

"واللہ"..... کیا تماشا تھا۔ واقعی کیا یہ ساری عمارت اپنی بنیادوں پر گردش کر رہی تھی بہر حال میں اسے گردش کرتے دیکھ رہا تھا۔"

عمر نے احترام کے ساتھ بزرگ صوفی کو اٹھنے میں مدد دی۔ ان کے تمام معتقدین بھی ساتھ ہی دوڑ پڑے۔

"پیر و مرشد" ایک شخص نے کہا "آپ یقین فرمائیے کہ یہ کمرہ اپنی جگہ قائم تھا۔ ہم نے آپ کو صرف آہستہ آہستہ گردش کرتے دیکھا اس کے بعد آپ زمین پر تھے۔

"نہیں نہیں۔ میں نے مطلق حرکت نہیں کی۔"

"بے شک، آپ اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلے۔" عمر نے بھی امام غزالی کو اس بات کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "بلکہ آپ اپنی جگہ کھڑے کھڑے ایک دائرے میں گھوم گئے تھے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اتنی بڑی عمارت ایک پہیے کی طرح گھوم بھی کیسے سکتی تھی۔"

"لیکن کس طرح....."

"شہتیر کے اس سرے کو چکی کے دستے کی طرح نیچے سے تو گھمایا جا سکتا ہے جب میں نے تالی بجائی تھی تو میرے ملازمین نے نیچے جا کر شہتیر میں لگے ہوئے دستوں کو حرکت دینی شروع کر دی تھی۔"

"تو پھر" امام غزالی نے اپنی عبا کا دامن سمیٹتے ہوئے ترش روئی سے کہا "میرے ساتھ یہ طفلانہ شعبدہ بازی کرنے کا کیا مقصد تھا؟"

"اس لیے کہ آپ ہم سب میں سے زیادہ عقلمند تسلیم کیے جاتے ہیں اور میں آپ کی زبان سے صرف وہ بات سننا چاہتا تھا جو آپ نے ابھی ملاحظہ فرمائی تھی۔ اچھا اب سنیے..... پہلی مرتبہ آپ ساکت اپنے قدموں پر کھڑے رہے تھے۔ دوسری مرتبہ آپ بغیر حرکت کیے ہوئے گھومنے لگے تھے۔ اور جیسے جیسے آپ گھومے آپ کی نگاہوں کے سامنے بالترتیب بروج کی شکلیں آتی رہیں۔ لیکن اس کے ساتھ دوسری مرتبہ آپ کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ تمام عمارت گردش کر رہی تھی۔ آخر ایسا کیوں محسوس ہوا؟"

"کیونکہ میں اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلا..... میرے ساتھ شعبدہ بازی کی گئی

تھی۔ یہی وہ بات تھی جو کفار نے تمہیں سکھائی تھی؟''

''ہر شب .....'' عمر نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا آپ کہکشاں اور برج فلکی کے قدرتی سلسلہ نجوم کو اپنے سر کے اوپر سے گذرتے دیکھتے ہیں۔ اور جیسا کہ آپ نے ابھی ارشاد فرمایا کہ آپ ساکت کھڑے رہے تھے۔ یہ تمام ستارے ہمارے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔'' امام غزالی بالکل خاموش کھڑے غصے سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اور ان کے معتقدین برہمی سے عمر کو بغور دیکھ رہے تھے۔

دراصل زمین گردش کرتی ہے..... بالکل ایسے ہی جیسے ابھی یہ شہتیر گھوم رہا تھا..... دن اور رات کے عرصے میں ایک طرف سے دوسری طرف گھوم جاتی ہے۔ امام صاحب! انسان صدیوں سے اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ آسمان زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ آنکھیں کھول کر حقیقت کا نظارہ کرتا۔ ممکن ہے نوزائیدہ بچوں کو اس کا علم ہو کہ وہ ساکت اور بے حرکت ستاروں کے نیچے حرکت کر رہے ہیں۔ تیزی سے خلا میں چکر لگا رہے ہیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے یہ سب کچھ ضرور دیکھتے ہوں گے لیکن ہم سے بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔''

''نہیں'' بلند پایہ صوفی نے بآواز بلند کہا۔'' اللہ تعالیٰ نے زمین کو ساکن بنایا ہے۔ جو فضائے بسیط کے وسط میں قائم ہے۔''

اُن کے تمام معتقدین نے ایک زبان ہو کر ان کی تائید کی۔ اور ان میں سے ایک شخص نے ہمت کر کے کہا'' یہ سب شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہ تھا..... بجز اس کے کہ اے ماہر نجوم! تو حجتہ الاسلام کو اپنے قدموں میں گرا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ شیطانی شکلیں جو تو نے سامنے بنا رکھی ہیں محض بیکار ہیں۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اجرام فلکی گردش نہیں کرتے؟''

''ہاں! کیا ثبوت ہے؟'' سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''یہ بات بالکل صاف ہے۔'' عمر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تو پھر اس کی وضاحت کر۔''

مختصراً مگر ذرا بے چینی سے عمر نے تفصیل بیان کرنی شروع کی۔ اس نے کہا کہ ساکت ستاروں کے مقابلے میں ''سیارے'' زمین سے زیادہ قریب ہیں..... مریخ،

عطارہ، زہرہ قریب تر، مہتاب اور بھی زیادہ نزدیک۔ اور سورج بھی۔ جب گرہن ہوتا ہے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ یعنی جب چاند زمین اور سورج کے درمیان سے گزرتا ہے یا زمین (کرۂ ارض) چاند اور سورج کے درمیان سے گزرتی ہے۔ لیکن جہاں تک باقی ستاروں کے تعلق ہے، جو بے حس و حرکت نظر آتے ہیں، وہ بہت دور آسمان کی بلندیوں پر واقع ہیں۔

''اس بات کا کیا ثبوت ہے؟'' کسی نے سوال کیا۔

''ایک شخص''..... عمر نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔'' رات کے وقت قاہرہ میں کھڑا ان ہزاروں ستاروں کو دیکھ سکتا ہے جو نیشا پور سے نظر آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زمین کے مختلف فاصلوں سے وسیع و عریض آسمان کے صرف ایک حصے پر چمکتے ہوئے ستاروں ہی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔''

عمر بڑے اعتماد سے گفتگو کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے اپنے بیان پر کامل یقین تھا۔ اور جب چند ریاضی دانوں کے چہروں پر بھی سنجیدگی کے آثار رونما ہونے لگے تو جامعہ کے طالب علم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر خاموش ہو گئے۔

''کچھ ستارے'' عمر نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا'' جو ہمیں نظر آتے ہیں جسامت میں اس سے ہزار گنا زیادہ ہیں اور کروڑوں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ وہ اس لئے چھوٹے نظر آتے ہیں کہ بہت دور ہیں۔ اور سورج چونکہ ان کے مقابلے میں زمین سے قریب ہے اس لیے وہ بڑا نظر آتا ہے۔ اور اس کی روشنی بھی خیرہ کن دکھائی دیتی ہے۔''

''اگر اسے سچ مان بھی لیا جائے'' سامعین میں سے ایک شخص نے کہا۔'' تو بھی اس کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں ہے۔ چھوٹے یا بڑے، جتنے ستارے ہیں۔ وہ سب گردش کرتے ہیں۔ یہی اللہ کی مشیت ہے۔''

''وہ گردش کر ہی نہیں سکتے'' عمر نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔'' کیونکہ اگر وہ زمین کے گرد چکر کاٹنے کے لیے حرکت کریں گے تو انہیں لامتناہی خلا میں اس تیزی سے گردش کرنی پڑے گی کہ وہ خود بخود جل کر نابود ہو جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ ہم آئے دن آسمان پر ستارے ٹوٹتے دیکھتے ہیں۔ جو اپنے مقام سے زمین کی سمت

آتے آتے شعلوں میں تبدیل ہو کر غائب ہو جاتے ہیں۔"

"یہ سب کفر ہے" ایک شخص نے چلا کر کہا "اے ایمان والو۔ کیا یہ بات اللہ کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ ایک پتھر کو آگ میں اور آگ کو ایک پتھر کی شکل میں تبدیل کر دے؟"

"بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے" عمر نے کہا "اسی کی قدرت سے زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔ اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے اس فضائے بسیط میں ایک دنیا سے دور دوسری دنیا قائم کر رکھی ہے۔ اسی کی قدرت سے ہم زندہ ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔" اور اس نے ایک اضطراری انداز میں امام غزالی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لیکن ہم اس کی قدرت کے بھید نہیں جان سکتے۔"

"تمام علم" امام غزالی نے جواب دیا "خدا ہی کی طرف سے ہے۔ خدا آفتاب کی مانند ہے اور ہمارے علم کی حیثیت دھوپ سے زیادہ نہیں۔"

"یک زرہ زحکم تو جہان خالی نیست" (جہان کا ایک زرہ بھی اس کے حکم سے باہر نہیں ہے)۔ آفتاب؟ بالکل اسی طرح اپنی جگہ ساکت اور قائم ہے جیسے میں اور آپ یہاں کھڑے ہیں۔ ہمیں بھی روز ازل ہی تخلیق کیا گیا تھا۔ ہمیں سورج سے کیا علم حاصل ہو سکتا ہے اگر ہم اسے اس طرح دیکھنے کی کوشش نہ کریں جیسا کہ وہ ہے؟" عمر نے جوش میں آ کر بازو پھیلائے ہوئے کہا۔

یکا یک محترم صوفی نے اپنے ہمراہیوں میں سے ایک شخص کو کنویں سے تازہ پانی لانے کا حکم دیا۔ جب پانی آ گیا تو انہوں نے وضو کیا اور اپنی عبا درست کر کے کمرے سے باہر آ گئے۔

"عمر خیام"! امام غزالی نے کہا۔ "تم نے جو کچھ کہا ہے اس پر پھر غور کرو۔ یہ کفر ہے۔ میں ستاروں کے فاصلے یا گرہن کے متعلق تمہارے بیانات پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ۔ اللہ نور السموات والارض (اللہ زمین اور آسمان کا نور ہے)..... اللہ ھیدی من یشاء (اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)۔ وقت کی پیمائش سے بھلا انسانی

روحوں کا کیا واسطہ۔ میری طرف سے تمہیں یہ تنبیہ ہے۔"

"مجھے تنبیہ کی جا چکی ہے" عمر کو ایک گذشتہ تنبیہ کا خیال آ گیا اور وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ کچھ عرصہ قبل مجھے ایک تحریری تنبیہ موصول ہو چکی ہے جس میں مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں اپنی زبان دانتوں مین بند کر کے رکھوں۔ بہر حال میرا ارادہ ہے کہ کل میں جامعہ کی مجلس گاہ میں آ کر اپنی تمام عمر کے مطالعہ و تحقیق کا نچوڑ وہاں کے اساتذہ کے روبرو پیش کروں گا۔"

امام غزالی نے عمر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیام! تم دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ لیکن انسان ہمیشہ تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ کون جانتا ہے کہ میرے نفس کا تار کب ٹوٹ جائے۔ اس لیے اب کہ یہ سانس آ رہا ہے میں چاہتا ہوں کہ جیتے جی اپنا علم دوسروں تک پہنچا دوں۔"

"یہ سب بے ہودگی ہے۔ خیام! واقعی تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ کیونکہ جو کچھ تم نے ابھی کہا ہے وہ کسی شاعر کو زیب دیتا ہے یا پھر کوئی مسخرا ہی اس قسم کی باتیں کر سکتا ہے۔ میں خدا سے دعا کروں گا کہ تمہیں بروقت عقل سلیم عطا کرے۔"

امام غزالی اور ان کے ہمراہی رخصت ہو گئے لیکن عمر بہت دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ وہ سب واقعی اس سے ناراض تھے جس کا اظہار بھی انہوں نے کر دیا تھا۔ لیکن انہوں نے میری تمام باتوں کو مذاق کیوں تصور کیا۔؟

"آقا" اس کے ایک مددگار نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کے روبرو حجۃ الاسلام کا گر پڑنا واقعی نامناسب تھا۔ یہ قصہ اب سارے نیشاپور میں مشہور ہو جائے گا۔ آپ جامعہ تشریف نہ لے جائیں۔ ممکن ہے وہاں کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔"

"اگر تقدیر میں یہی لکھا ہے تو میرے یا تیرے چاہنے سے وہ مٹ نہیں سکتا۔"

چوبیسواں باب:

گردش میں ستارے

نیشا پور میں طرح طرح کی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ کوچہ و بازار میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ سلطان کے منجم نے اپنی (شیطانی) قوتوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے دھوکے سے حجتہ الاسلام کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا۔ اور وہ اپنے عمل سحر سے عوام کے محبوب امام غزالی کو تقریباً بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن امام غزالی نے آیات قرآنی پڑھ کر اس کے سحر کا رد کر دیا اور خیام مارے شرم کے خاموش ہو گیا۔ بعض لوگ یہ مشہور کر رہے تھے کہ عمر خیام نے جسمانی طور پر امام غزالی سے کشتی لڑ کر انہیں زمین پر گرا دیا تھا۔ کچھ لوگ بڑے وثوق سے یہ بھی بیان کرتے تھے کہ امام غزالی نے بیت النجوم میں ایک ایسی پوشیدہ مشین کا سراغ لگایا تھا جو دھماکے کے ساتھ پھٹتی ہے اور تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

یہ افواہیں نیشا پور کی حدود سے باہر نکل گئیں حتیٰ کہ قصر کوچک کے دربان اسحٰق کے کانوں تک بھی اس کے آقا عمر خیام کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پہنچنے لگیں۔ ایک دن اون کے تاجروں کا ایک قافلہ جو بلخ جا رہا تھا اس کے سامنے سے گزرا۔ گزرتے ہوئے ایک شخص نے سواری پر بیٹھے بیٹھے جھک کر قصر کے دروازے پر تھوکا۔

"حرام خور!" اسحٰق نے بڑے تحکمانہ انداز میں چیخ کر کہا۔ "خدا کرے تیرے باپ کی قبر پر کتا بچے جنے۔

"یہ مکان جس کی تو دربانی کر رہا ہے ناپاک کتوں ہی سے بھرا ہوا ہے۔ ہاں! اے..... کافر ہے..... تیرا آقا..... خون آشام کافر..... حرام خور۔"

"کیا ہو گیا ہے تجھے"۔ اسحاق یہ سب باتیں سن کر بھونچکا اور لاجواب سا ہو گیا۔ اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"تجھے کچھ خبر بھی ہے" شتر بان نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے خچر کو روکا اور اچک کر اس کی پشت پر ایک طرف ہو بیٹھا تا کہ اسحٰق کا چہرہ اس کے عین مقابل ہو جائے۔ "پہلے تو میں نے سنا تھا کہ تیرے ملحد آقا نے اپنے منحوس مینار میں ایک گہری خندق کھود کر اسے گھاس پھونس سے ڈھک دیا تھا۔ تا کہ دھوکے سے انجان لوگوں کو اس میں گرا کر ہلاک کر دیا جائے۔ لیکن ایک پاک طینت بزرگ نے..... جن کا نام میں اس وقت بھول رہا ہوں۔ لیکن سنا ہے وہ بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔ قرآنی آیات پڑھ کر اس خندق پر دم کر دیا۔ جس سے آناً فاناً تمام شیطانی قوتوں کا استیصال ہو گیا۔ اس کے بعد سرائے کے مالک کی لڑکی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس منحوس شخص نے جسے تو اپنا آقا کہتا ہے۔ جامعۂ نیشا پور میں بڑے بڑے باریش علماء کے روبرو ایک دن اور ایک رات مسلسل تقریر کی۔ اور تقریر بھی کیسی۔ خدا کی پناہ۔ خدا کبھی آئندہ کسی کو ایسی تقریر نہ سنوائے۔"

شتر بان ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا، اپنی خورجی میں سے انار نکال کر اسے چھیلتے ہوئے کہنے لگا" وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ سیاروں نے اجرام فلک نے گردش کرنی چھوڑ دی ہے۔"

اسحٰق نے اسے اس طرح بے یقینی سے دیکھا جیسے وہ جھوٹ بول رہا تھا

"یہی نہیں"..... مزے لے لے کر انار کے سرخ دانوں کا رس چوستے ہوئے خبر رساں نے ایک ہنکارا بھرا..... "ہونھ۔ وہ کہتا ہے کہ سورج حرکت ہی نہیں کرتا۔ میں نے سمرقند میں چینی بزرگوں کی گفتگو بھی سنی ہے۔ جی ہاں۔ اور خانہ خدا کی زیارت کے لیے میں مکہ معظمہ بھی گیا ہوں، وہاں بھی اللہ کے نیک بندوں کو ہر قسم کی باتیں کرتے سن چکا ہوں۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے مگر آج تک کسی عالم یا درویش کو یہ کہتے

میں نے نہیں سنا کہ سورج طلوع وغروب نہیں ہوتا بلکہ آسمان میں ایک جگہ ٹکا ہوا ہے۔ خدا کرے تجھے کتے بھنبوڑیں اور تیرے اس گھر پر شہیدان کربلا کا صبر پڑے۔"

اسحٰق پریشان ہو کر وہاں سے اٹھ کر زلیخا کی طرف چل پڑا تا کہ یہ منحوس خبریں اسے بھی سنائے۔ "میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں" موٹی باورچن نے اپنا فیصلہ سنایا "کہ کائنات وائنات، کے متعلق بحث وحث سے کوئی فائدہ تھوڑا ہی پہنچے گا۔"

"واللہ! کیا نام لیا ہے۔"

"ارے تو پھر خائنات، ہوگا۔ ایک ہی بات ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہمارے آقا پر ایسی کیا افتاد آپڑی کہ لگا وقت کی پیمائش کرنے۔"

وہ باورچی خانے سے اٹھ کر حرم کی طرف چل پڑا جس کے دروازے پر دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ نیشاپور کی گرمی سے بچنے کے لیے اس وقت عائشہ قصر کو چک میں مقیم تھی۔ اس نے تفصیل کے ساتھ وہ تمام واقعات عائشہ سے بیان کیے جن کی وجہ سے سارا نیشاپور آقا عمر خیام کا مخالف ہو گیا تھا۔ عائشہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے برے برے خیالات آتے رہے۔

"اگر ہمارے سرتاج کی یہ رائے ہے کہ سورج غیر متحرک ہے تو بے شک ایسا ہی ہے۔" عائشہ نے وثوق کے ساتھ کہا۔ "اگر انہیں اس حقیقت کا علم نہ ہوگا تو پھر کسے ہوگا؟"

[illegible] نے اپنے دل میں سوچا کہ علماء سے بحث وتکرار کوئی مناسب فعل نہیں ہے لیکن جب تک عمر کو سلطان کو خوشنودی حاصل ہے کوئی بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اس کے دشمن زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ کتوں کی طرح اس کی سواری کے پیچھے پیچھے بھونکتے ہوئے دوڑتے رہیں اور بس۔

اسحاق حیران و پریشان واپس آکر قصر کے دروازے پر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اور دور میدان کے کنارے پر سورج کی سرخ گیند کو غروب ہوتے ہوئے غور سے تکنے لگا۔ اس حقیقت میں کسی شبے کی گنجائش نہ تھی کہ سورج بدستور ویسا ہی تھا، اس کی ہیئت میں

کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ سورج بالکل اسی طرح نظروں سے روپوش ہو رہا تھا جس طرح کئی سال پہلے وہ اس روز غروب ہوا تھا جب عمر خیام نے سلطان کے حکم سے نئی زیج کا آغاز کیا تھا..... اسحٰق نے اپنی خمیدہ انگلیوں پر گذشتہ سال شمار کیے۔ معلوم ہوا اس واقعے کو تیرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس وقت بھی جب کہ نئی زیج کو شروع ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا ملاؤں نے متفقہ طور پر اس سے بری فال نکالی تھی۔ بقول ان کے افق پر "موت کے سرخ پھریرے" اس وقت بھی اسی طرح لہرا رہے تھے جس طرح موجودہ شام کے وقت افق پر گہری سرخی چھائی ہوئی تھی۔ اسحٰق نے پھر اپنے یقین کا اعادہ کیا۔ نہیں! سورج میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اسحٰق بدستور الجھن میں مبتلا تھا۔ وہ دروازے سے اٹھ کر سڑک پر آ گیا تا کہ نیشاپور سے آنے والوں سے مزید خبریں معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ ایک بردہ فروش نے اسے بتایا کہ خواجہ عمر حسب دستور بیت النجوم میں اپنے ریاضی دان مددگاروں کے ساتھ مصروف عمل ہے جامعہ نیشاپور ہنوز اس کی بعید از قیاس تقریر سے گونج رہا ہے۔ بردہ فروش نیک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تقریر کرتے وقت غالباً عمر نشے کے عالم میں تھا۔ اگر وہ مشہد مقدس جا کر حضرت امام رضا علیہ السلام کے مزار مبارک پر حاضری دے تو اس کے گناہ کا کفارہ ادا ہو سکتا ہے۔

اتنے میں گرد وغبار کا ایک طوفان اٹھا اور ایک سلطانی قاصد ہٹو بچو کا شور مچاتا، کسانوں اور گڈریوں کو راستے سے ہٹنے کی ہدایت کرتا سامنے سے گزرا۔ وہ سمرقند جا رہا تھا۔

"کیا خبر لے کر جا رہے ہو؟" اسحٰق نے چیخ کر اس سے دریافت کیا۔

تیزی سے دوڑتے ہوئے قاصد نے گردن موڑ کر اسحٰق کو جواب دیا "بہت بری خبر ہے۔ سلطان کا انتقال ہو گیا۔"

ملک شاہ کی موت کی خبر بلخ سے بغداد تک اتنی تیزی سے پھیل گئی جتنی تیزی سے پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے گھوڑے وہ فاصلہ طے کر سکتے تھے۔ شکار کھیلتے ہوئے سلطان کی طبیعت ایک دم سے خراب ہو گئی تھی۔ معالجوں نے اپنی سی بہتری کوشش کی۔

فصد بھی کھولی۔ لیکن سلطان جان بر نہ ہو سکا تھا اور بغیر اپنا جانشین نامزد کیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

نیشا پور اور اصفہان کے سارے بازار بند ہو گئے۔ مختلف سمتوں میں سفر کرتے ہوئے تمام کاروان شاہراہوں سے پلٹ آئے۔ مسلح فوجیں طاقتور امراء کی قیادت میں جگہ جگہ جمع ہونے لگیں قلعہ الموت کا محاصرہ ختم کر دیا گیا۔ اس فوج کا کمان دار ملک شاہ کے ایک لڑکے برکیارق کی افواج میں شامل ہونے کے لیے عجلت سے پہنچنا چاہتا تھا جسے مقتول نظام الملک کے ایک فرزند کی حمایت حاصل تھی۔

خلیفہ بغداد نے ملک شاہ کے دوسرے بیٹے محمود کو وارث تخت و تاج تسلیم کر لیا۔ امراء تقسیم ہو گئے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جنگ جو سپاہی دو مخالف کیمپوں میں تقسیم ہوتے رہے اور آخر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

قلعہ الموت کا محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ حسن بن صباح چپکے سے قاہرہ روانہ ہو گیا تا کہ وہاں جا کر حشیشین کے مصری قائدین سے صلاح و مشورہ کرے۔ ایران میں خانہ جنگی سے اس کے عزائم کو تقویت ملی۔ کیونکہ اس افراتفری میں اس کے حواریوں کو بے روک ٹوک پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ تخت خواہ برکیارق کو ملے یا محمود کو حسن بن صباح کا دونوں صورتوں میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔ اسی دوران میں وہ شام میں بھی قلعہ بند مقامات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے متبعین نے اب کھلم کھلا اصفہان میں ویزکوہ پر قلعے کی مرمت شروع کر دی تھی۔ قاہرہ میں حشیشین کے قائدین کے اشتراک سے حسن نے ایک عالمگیر حکومت کا خاکہ بھی تیار کر لیا۔

اس نے ایران کے معاملات میں ٹانگ اڑانی شروع کر دی تھی۔ اور پھر اس کے نمائندوں نے برکیارق کو قتل کرنے کی بھی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ برکیارق اپنے مخالف پر روز بروز غالب آ رہا تھا۔

ملک شاہ کی موت کی خبر سنتے ہی عائشہ نے اسحق پر زور دیا کہ وہ اسے نیشا پور کے چھوٹے محل میں پہنچا دے جو کتاب فروشوں کے بازار اور باغ عام کے قریب واقع ہے۔ وہاں وہ عمر کے قریب رہ سکے گی۔ ان دنوں عمر بیت النجوم میں اپنا بیشتر وقت

اقلیدس کے علم ہندسہ پہ نظر ثانی کر کے اس کی شرح لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔

عائشہ نے مسلح محافظوں کی ایک جمعیت بھی ملازم رکھ لی تھی جن میں سے بیشتر عرب تھے۔ دبلے پتلے، مگر بلا کے بہادر۔ ایرانی کون ہیں۔ کیا ہیں۔ انہیں اس سے قطعاً کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ انہیں تو پیٹ بھر کھانے اور تنخواہ کی کثیر رقم سے سروکار تھا۔ عائشہ نے تیز رفتار گھوڑے اور بار بردار اونٹ بھی خرید لئے تھے۔ اسے قوی احساس تھا کہ عمر کا پشت پناہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہے اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ان کے پاس حفاظت کے لیے اپنے ذاتی محافظ اور اپنے گھوڑے بھی ہوں تا کہ ضرورت پڑنے پر بلا کسی تاخیر کے وہ حفاظت کے ساتھ نیشا پور سے فرار ہو سکیں۔ اسے ایرانیوں پر قطعی اعتماد نہ تھا جو بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح ہجوم کر کے کبھی ادھر بھاگتے تھے کبھی ادھر۔ عائشہ کو نیشا پور کے عوام میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہ ہوا بجز اس کے کہ اب عمر کے دروازے پر اس کی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کا ہجوم نظر نہ آتا تھا۔ خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ امراء نئے منصب داروں سے تعلقات پیدا کرنے اور نئے پیمان باندھنے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف نظر آتے تھے۔ مسجدوں میں بھی عوام کا موضوع گفتگو بغداد یا رے سے افواج کی آمد و روانگی تک محدود تھا۔ رات کے وقت شہر کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے اور گھڑ سوار پہرے دار سڑکوں پر مسلسل گشت کرتے رہتے تھے۔

کچھ عرصہ گزرنے پر شاہی خزانے سے عمر کو تنخواہ ملنا بند ہو گئی۔ لیکن جب کبھی اسے اپنے تحقیقی عملے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی وہ اپنے ناظر کے ذریعے بازار سے حسب ضرورت قرض لے لیتا۔ اور پھر عائشہ کے پاس تجوری میں زر و نقد خاصی مقدار میں موجود تھا جس کے حفاظت وہ بڑی سختی سے کرتی تھی۔

اس نے عمر کو بہت سمجھایا کہ وہ برکیارق کے دربار میں جا کر شاہی آداب بجا لائے۔ برکیارق بغداد کی فوجوں کو شکست فاش دے چکا تھا۔ عائشہ کے خیال میں پیشین گوئی کرنے کا یہ نہایت شان دار موقع تھا۔ آخر درباری شاعر معزی نے بھی تو اس فتح کی مبارک باد میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ شکست خوردہ فریق کو

بھی چپکے سے ایک تسلی آمیز اور ہمت افزا نظم لکھ کر روانہ کر دی تھی۔ اور خصوصاً ایسے موقع پر جیسا کہ عمر نے عائشہ کو بتایا تھا کہ عنقریب چاند گرہن ہونے والا ہے اور نیشا پور سے صاف دکھائی دے گا۔ دربار میں حاضری ضروری تھی۔

لیکن عمر ملک شاہ کا سوگ منا رہا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس۔ نوجوان سلطان۔ ملک شاہ اپنی موت کے وقت زیادہ سے زیادہ انتالیس سال کا تھا۔ بچپن سے دونوں ساتھ رہے تھے۔ اب وہ بھی رحیم، یاسمین اور جعفرک سے جا ملا تھا۔ اللہ! وہ سب کہاں چلے گئے؟

اس نے ایک رباعی لکھی۔ لیکن عائشہ کو اسے سن کر بالکل لطف نہ آیا

''لیکن اس سے برکیارق کی تعریف کا تو کوئی پہلو نہیں نکلتا۔'' اس نے اعتراض کیا۔ ''گذر جانے والوں کے متعلق اس قدر سوچنے سے فائدہ؟ وہ سب اپنی اپنی قبروں میں آسودہ ہیں اور ان سے اب کیا منفعت پہنچ سکتی ہے۔ آپ ابھی چالیس سے کچھ ہی اوپر ہوں گے اور میں اس نے شرماتے ہوئے کہا ''یہ بھی بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کے قویٰ کس قدر مضبوط ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ اس قدیم مینار میں بیٹھے کاغذ پر لکیریں کھینچتے رہنے کی بجائے دوسرے امیروں کی طرح سلطان کے ہم رکاب کیوں نہ ہو جائیں؟''

''میں ایک مرتبہ ملک شاہ کی ہم رکابی کی عزت حاصل کر چکا۔ بس یہی بہت ہے۔ نہیں نہیں۔ اب یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ عائشہ۔ چھوڑو اس قصے کو..... ہاں آج رات تم دیکھو گی کہ چاند گہنا کر پوری طرح غائب ہو جاتا ہے۔''

''کیا عقرب سارے کے سارے چاند کو نگل جائے گا۔'' چاند گرہن کا متوقع منظر دیکھنے کے اشتیاق سے اس کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔

''دیکھو گی تو پتا چل جائے گا۔''

عمر نے وہ رات اپنی رصد گاہ کی چوٹی پر گزاری۔ عائشہ بھی نیشا پور میں اپنے محل کی چھت پر لیٹی عوام کے خوف واضطراب کو غور سے دیکھتی رہی۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ اور جب اس کے روشن چہرے پر سیاہی بڑھنا شروع ہوئی تو تمام فضا شور وغوغا سے

گونج اٹھی۔

یکا یک قرنا پھونکے جانے لگے، نقارے پٹنے لگے، جھانجھ بجنے لگے اور مکانوں کی چھتوں سے عورتوں کی چیخوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ عائشہ کی طرح ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ اہرمن (شر کا دیوتا) بری نیت سے چاند کو ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سیاہی گہری ہو گئی۔ ملاؤں کا ایک گروہ ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے بلند آواز سے اسماء الٰہی کا ورد کرتا ہوا سڑکوں پر گشت کرنے لگا۔ تا کہ اسمائے پاک کی برکت سے چاند کی آسیب زدگی دور ہو جائے۔

سیاہی اور بڑھ گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ صحرا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ چیخوں کی آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ جوشیلے مسلمان بھاگم بھاگ پیتل کی تھالیاں لا کر انھیں پیٹنے اور نعرے لگانے لگے تا کہ خبیث طاغوتی طاقت کو خوفزدہ کر کے آسمان سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود چاند کے روشن چہرے پر ظلمت غالب آ گئی۔ سارا شہر تاریکی کے سمندر میں ڈوب گیا۔ البتہ تیزی سے ادھر ادھر رقص کرتی ہوئی مشعلیں کبھی کبھی اس بحر ظلمات میں ننھے ننھے چراغوں کی طرح تیرتی نظر آ جاتی تھیں۔

اور پھر..... عائشہ یکا یک خوشی کے جوش میں چیخ اٹھی..... روشنی کی ایک رمق آسمان پر نمودار ہوئی۔ ایک نازک نیچے کے مانند۔ ڈھول اور جھانجھ ایک نئے جوش کے ساتھ بجائے جانے لگے..... اور..... آہستہ..... آہستہ..... شر کے دیوتا نے چاند کو، جسے وہ پورا نگل چکا تھا..... اگلنا شروع کر دیا۔

چاند گرہن ختم ہونے تک شور وغوغا مسلسل بلند ہوتا رہا۔ عائشہ جو جذبات کی شدت سے تھک چکی تھی۔ اب ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ گئی اور جلد ہی نیند کے آغوش میں پہنچ گئی۔ اس تمام ہنگامے کے دوران اسے ایک دفعہ خیال آیا کہ شاید عمر نے بھی اپنے مینار پر ڈھول پیٹا ہو لیکن پھر خود ہی اس نے اپنے اس خیال کی تردید بھی کر دی کہ عمر ایسے کام نہیں کرتا۔

مذہبی جوش وخروش جو چاند گرہن کے موقع پر اُبھر آیا تھا کچھ دن قائم رہا۔
قضاۃ شہر کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور انہوں نے عمر کو پیغام بھجوایا کہ وہ اگلے دن ان کی مجلس کے روبرو پیش ہو۔ یہی نہیں بلکہ محافظوں کا وہ دستہ جو یہ پیغام عمر کے پاس لے کر آیا تھا اس وقت تک بیت النجوم کے سامنے پہرا دیتا رہا جب تک عمر مجلس قضاۃ کے روبرو حاضر ہونے کے لیے ان کی نگرانی میں وہاں پہنچ نہ گیا۔

عمر کو اس طلبی کی اطلاع قبل از وقت نہ مل سکی۔ اس کے تمام دوست اپنے اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے..... چلتے وقت اس کے معاونین نے اس سے یہ درخواست کی کہ وہ معزز قاضیوں کو نالاں ہونے کا کوئی موقع نہ دے۔ کیونکہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت تھی کہ قاضی ہونے کی بدولت اسلامی معاشرے میں انہیں ایک بالاتر حیثیت حاصل تھی۔ اور جب تک اسے نئے سلطان کا قرب یا بہت ممکن ہے خلیفہ کی خوشنودی حاصل نہ ہو جائے۔ مجلس قضاۃ کی جانب سے جو اعتراضات بھی اس پر کیے جائیں انہیں خاموشی سے تسلیم کر لے۔

عمر دیوان میں داخل ہوا تو بیک نظر اس نے اندازہ لگا لیا کہ جامعہ کا پورا عملہ فلسفہ اور دینیات کے سربراہوں سمیت ادھر سے ادھر تک دیوار سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔ آگے کی صف میں عمر کے روبرو سفید عمامے باندھے قاضیوں کے علاوہ حجۃ الاسلام غزالی اور مفتی شہر بھی تشریف فرما تھے۔ پورا کمرہ اس طرح کھچا کھچ بھرا تھا کہ قاضیوں کے سامنے دوزانو بیٹھنے کے لیے بھی اس کو بمشکل جگہ مل سکی۔

عمر اساتذہ کے مجمع میں تقریر کرنے یا مجلس جامعہ کو مشورہ دینے کے لیے وہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ تقریباً تمام چہرے جانے پہچانے تھے۔ عمر کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور اس نے سمجھ لیا کہ اس کے خلاف عدالتی تحقیقات کی جانے والی ہے۔ سب سے معمر قاضی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کہہ کر کارروائی کا آغاز کیا۔

جب اسے فرد جرم پڑھ کر سنائی جا رہی تھی تو وہ ذہنی طور پر چوکنا ہو گیا تھا۔ وہ الفاظ کے بجائے مجلس قضاۃ کے ان جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو الفاظ کے پردے میں پوشیدہ تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ملک شاہ زندہ ہوتا تو بھلا ان کی کیا مجال

تھی جو مجھے اس طرح طلب کرتے۔ ان تمام ملاؤں اور عالمانِ دین کی آنکھوں میں جو وہاں موجود تھے اسے اپنے خلاف وہ قدیم نفرت صاف جھلکتی نظر آ رہی تھی جسے وہ نہ جانے کب سے چھپائے ہوئے تھے۔

ایک ملا نے عمر خیام سابق منجم سلطان کے خلاف بآواز بلند فرد جرم پڑھ کر سنا نا شروع کی۔

ملا نے کہا کہ سب سے پہلے تو عمر کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے جو تمام دنیائے اسلام کے مدارس میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہیں۔

اس کی تصانیف پر یہ اعتراض ہے کہ..... وہ ساری کتابیں کافر یونانیوں کی تعلیمات کے مطابق تصنیف کی گئی ہیں..... اور یہ کہ ان کا مصنف ملحد ہے۔

اس نے دوسرے مختلف طریقوں سے بھی اسلام کے مسلمہ عقائد سے روگردانی کی ہے۔ اس نے سلطان مرحوم و مغفور کو اس بات پر راضی کیا کہ مروجہ اسلامی زیچ ترک کر دی جائے اور کفار کے طرز پر از سر نو جدید زیچ تیار کر کے رائج کی جائے۔

پھر اس نے قبرستان کے قریب اپنی رصد گاہ قائم کی تا کہ وہاں قبروں میں آزادی سے چل پھر کر مردوں سے ناپاک اور خلاف شرع (روحانی) رابطہ قائم کر سکے۔

اس کے علاوہ وہ یہ کہہ کر بھی خدائے پاک کی بے حرمتی اور نافرمانی کا مرتکب ہوا ہے کہ کرۂ ارض فضائے بسیط کا مرکز نہیں ہے اور وہ سیارے جن کے متعلق از روئے حدیث بھی ثابت ہے کہ طلوع و غروب ہوتے ہیں۔ گردش نہیں کرتے۔ وہ تمام لوگ..... اللہ کے راستے پر چلنے والے..... جو یہاں موجود ہیں ان سب نے اس ملحد کو یہ کلمات کفر ادا کرتے ہوئے سنا ہے۔ صرف یہی ایک بات اس کے خلاف عدالتی تحقیقات کے لیے کافی ہے۔

ملا نے اپنا بیان ختم کرتے ہوئے کہا کہ حقیقتاً یہ تمام الزامات بحث و شہادت کے محتاج نہیں۔ اور مسلمہ حقائق پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر الزام کے ثبوت میں سینکڑوں گواہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مجلس کے روبرو صرف یہ مسئلہ ہے کہ عمر خیام کی تصانیف کے

خلاف کیا طرز عمل اختیار کیا جائے اور خود ان کتابوں کے مصنف کو کیا سزا دی جائے۔

اس کے بعد جامعہ کے ایک اور عالم نے بولنا شروع کیا۔ میری رائے میں جو حقائق پیش کیے جا چکے ہیں ان کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ لیکن عمر خیام سے ایک اور گناہ بھی سرزد ہوا ہے۔ جس کا عام طور سے لوگوں کو علم نہیں۔

وقتاً فوقتاً عمر خیام رباعیاں لکھتا رہا ہے۔ جن کو کتابی شکل میں ایک جگہ جمع تو نہیں کیا گیا لیکن ہر طبقے کے لوگ انہیں پڑھتے ہوئے سنے گئے ہیں۔ خصوصاً صوفیاء کے حلقے میں وہ بے حد مقبول ہیں اور اوباش قسم کے لوگ قرآن و احادیث کی تردید میں انہیں سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مقرر نے جو اپنے آپ کو خاکپائے علماء خیال کرتا تھا۔ عمر خیام کی تصنیف کردہ کچھ رباعیاں مختلف لوگوں سے نقل کرا کے جمع کی تھیں۔

اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر علماء کرام اور قضاۃ عظام اسے اجازت مرحمت فرمائیں تو وہ ان ناپاک اشعار کو بآواز بلند پڑھ کر سنا سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی ان خباثت آمیز الفاظ و معانی کے اعادہ کی اس نے معافی بھی چاہی۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔

سارے مجمع میں اشتیاق کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگ قدرے آگے جھک کر گوش برآواز ہو گئے۔ عام طور سے لوگوں کو رباعیوں کا علم نہ تھا۔ ان رباعیوں کا خالق بھی سامنے ہی موجود تھا اور خود اپنے الفاظ و خیالات کی ستم ظریفی کا شکار ہونے والا تھا۔

بزرگ ترین قاضی نے ارشاد فرمایا ''بے کھٹکے پڑھ کر سناؤ۔''

معترض نے آہستہ آہستہ اشعار سنانے شروع کیے عمر کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا..... اسے یاسمین کا خیال آیا۔ بھلا یاسمین کے پہلو میں اسے جنت کا خیال کس طرح آ سکتا تھا..... اور شراب..... اس کے لیے شدت غم سے تحفظ کا واحد ذریعہ ہی تو تھی.....

''یہ مذہب کے ساتھ استہزا ہے'' رباعیاں سنانے والے عالم نے کہا۔ لیکن میں آپ کو ایک اور شعر سناتا ہوں جو کھلا ہوا الحاد ہے

(اے وہ کہ جس سے ہم اور وہ کر بخشش طلب کرتے ہیں۔ بتا اگر تو نہ بخشے گا

تو پھر وہ بخشش کہاں سے حاصل ہوگی۔)

عمر نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا ''یہ شعر میں نے نہیں لکھا۔''

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سفید عماموں سے آراستہ سر مزید بلند ہو گئے۔ باریش چہروں پر خشونت کے آثار کچھ اور واضح ہو گئے۔ امام غزالی اٹھے اور عمر کی نظروں سے کتراتے ہوئے قریبی دروازے سے باہر چلے گئے۔ عمر کو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے حق میں کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ یقیناً اسے لائق تعزیر اور مجرم قرار دیا جانے والا تھا۔

وہ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ جیسے ایک بڑا بار اس کے دماغ پر سے اتر گیا ہے۔ ان ضدی عالموں اور قاضیوں سے وہ بحث مباحثے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی۔

''کیا تو اپنی بریت میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟'' مفتی نے عمر سے سوال کیا۔

''ہاں! یہ آخری شعر میرا نہیں ہے لیکن میں اپنی ایک اور رباعی آپ کو سنانی چاہتا ہوں۔

''یہ رباعی بالکل تازہ ہے'' عمر نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میں نے ابھی ابھی فی البدیہہ کہی ہے اور اس موقع کے لیے مناسب بھی ہے۔''

عمر کی رباعی سن کر ناپسندیدگی کے الفاظ سے سارا دیوان گونج اٹھا۔ اور مفتی نے اپنا ہاتھ بلند کر کے کہا۔

''اب تو یہاں سے جا سکتا ہے۔ قاضیوں کے فیصلے کا انتظار کر۔''

جب وہ اس دروازے سے گزر رہا تھا جس سے امام غزالی تھوڑی دیر پہلے باہر تشریف لے گئے تھے۔ ایک درویش نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔

''الموت میں اب بھی پناہ مل سکتی ہے۔''

عمر نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی تو درویش وہاں سے کھسک گیا۔ محافظ دستہ اسے ہمراہ لے کر ایک بغلی دالان میں پہنچا جس کے فرش پر مسجد کے بلند مینار کا سایہ پڑ رہا تھا۔ عمر نے وہاں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور آرام سے بیٹھ گیا۔

اب وہ پہلا سا عمر ابن ابراہیم الخیام نہ تھا۔ مشہور و معروف خواجہ امام عمر، سلطان کا منظورِ نظر، اس سلطان کا جو ہر وقت اس پر انعام و اکرام کی بارش کرتا رہتا تھا۔ اس نے ساری زندگی علمی مباحثوں میں گزاری تھی۔ اور اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر بڑے بڑے علما سے کسبِ علم کیا تھا۔ اور اب..... خواجہ عمر وہاں ایک مجرم کی حیثیت سے بیٹھا تھا۔ ایک قیدی جس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔

فیصلہ سنانے کے لیے خود مفتی اس کے پاس آیا۔

''تیری تمام تصانیف کو خلافِ قانون قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کا مصنف ایک ملحد ہے۔ ان کی تعلیم مدرسوں میں ممنوع قرار دے دی گئی ہے جو کتابیں اس وقت یہاں موجود ہیں۔ انہیں نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔''

''بیت الخوم کو ضبط کر کے نیشاپور کی مجلسِ نظما کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ اب تو اس کے احاطے میں بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔ علاوہ ازیں تجھے حدودِ نیشاپور میں عوام کے کسی جلسے اور درس گاہوں میں طالب علموں سے خطاب کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔''

''آپ کا فیصلہ میں نے سن لیا'' عمر نے جواب دیا ''لیکن میری ذات کے متعلق کیا حکم ہے؟''

مفتی نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے ایک لمحہ سوچا۔ ''کچھ قاضیوں کی رائے ہے کہ تو دیوانہ ہے۔ مردودِ خداوندی..... تیری ذات کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ بہر حال تو آزاد ہے۔ لیکن تجھے نیشاپور فوراً چھوڑ دینا ہوگا۔ مدرسۃ العلوم اور دیگر درس گاہوں سے بھی تیرا کوئی تعلق نہ ہوگا۔''

''کتنے عرصے کے لیے؟''

''ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

جب محافظ رخصت ہو گئے تو عمر صدر دروازے سے ہوتا ہوا باہر نکل آیا۔ اسے دیکھنے کے لیے باہر ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے قدم بے ارادہ اس مانوس سڑک کی طرف اٹھ گئے جو کتب فروشوں کے بازار کی طرف

جاتی تھی۔

''اے ملحد'' کسی نے آوازہ کسا۔ طالب علموں کی ایک ٹولی جو شور مچاتی ہوئی باغ کی طرف جا رہی تھی اسے غریب آتا دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ کتابوں کی دکانوں سے لوگوں نے اسے جھانک جھانک کر دیکھا۔ سڑک کے موڑ پر چشمے کے کنارے پہنچ کر وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اس وقت بھی پانی اسی طرح چمک رہا تھا جیسے بیس برس پہلے چمکتا تھا۔ پتھروں پر بیٹھی ہوئی عورتیں بھی بالکل اسی طرح غپ شپ کر رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے جو کنارے پر بیٹھی اپنی صراحی بھر رہی تھی عمر کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھا تو گھبرا کر کھڑی ہو گئی اس غیر متوقع گھبراہٹ میں صراحی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پتھر پر گری اور پاش پاش ہو گئی۔

''میں معافی چاہتا ہوں'' عمر نے ایک دم چونک کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

پچیس سال پہلے جب وہ اس چشمے کے کنارے بیٹھ کر یاسمین کا انتظار کرتا تھا تو صحیح معنی میں زندہ تھا اور سامنے گزرنے والے انسانوں کی حیثیت اس کے خیال میں کاغذی فانوس پر گردش کرتے ہوئے سایوں سے زیادہ نہ تھی۔ اب وہ سب لوگ اسے زندہ نظر آ رہے اور خود وہ ایک سائے میں تبدیل ہو چکا تھا جو بے مقصد ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ بیت الخوم کے چھن جانے کے بعد اسے دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ خود اپنا وجود بھی بے حقیقت نظر آ رہا تھا۔

پچیسواں باب:

شہر بدر

عائشہ برابر روئے جا رہی تھی۔ وہ اسے طرح طرح سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ابھی وقت ہے کہ ہم اپنے بچے کھچے آدمیوں کے ساتھ روپیہ پیسا اور ضروری سامان لے کر جس قدر جلد ہو سکے قصر کوچک سے چلے جائیں۔ نیشا پور میں مزید قیام کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس نے عمر کو وہ سب افواہیں بتائیں جو کوچہ و بازار میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مسجدوں میں نماز کے وقت جمع ہونے والے لوگ اس کے متعلق کسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے بار بار اصرار کیا کہ گھوڑے تیار ہیں اور بار بردار اونٹ بھی موجود ہیں۔ اس سے پہلے کہ نئی مصیبتیں نازل ہوں بہتر یہی ہے ہم یہاں سے نکل جائیں۔

لیکن عمر نیشا پور چھوڑنے کو کسی قیمت پر راضی نہ تھا۔ اس نے اقلیدس پر اپنی شرح مکمل نہ کی تھی..... اس کی تصانیف کے سارے نامکمل مسودے بیت النجوم میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

عائشہ کی تمام گفتگو کے جواب میں عمر نے صرف ایک ''نہیں'' کہا اور اٹھ کر قصر کی چھت پر چلا گیا۔ وہ وہاں لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اور دھوپ کی تیزی کو غروب آفتاب کے خونی منظر میں تبدیل ہوتے دیکھنے میں محو ہو گیا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر اندھیرا چھانے لگا تھا کہ اسحٰق دوڑتا ہوا اوپر آیا اور خوف زدہ انداز میں عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آقا۔ بُری خبر ہے! ایک جم غفیر بیت النجوم کی طرف جا رہا ہے۔ ان میں کچھ ملا ہیں۔ کچھ سپاہی اور بہت سے واہی تباہی لوگ شامل ہیں۔ وہ آپ کے خلاف نعرے بھی لگاتے جا رہے ہیں۔ ان کا ارادہ مینار کو لوٹنے کا معلوم ہوتا ہے۔ اٹھیے! جلدی چلیے تاکہ جو کچھ ہاتھ لگے وہاں سے بچا لائیے اور شہر پناہ کے دروازے بند ہونے سے پہلے یہاں سے نکل کر قصر کوچک چلے جائیں۔ واللہ! اب یہاں امان ملنی مشکل ہے۔

''گھوڑا تیار کرو!'' عمر نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے حکم دیا۔

گھوڑے پر سوار ہو کر جب وہ روانہ ہونے لگا تو اس نے اسحٰق کو ہدایت کی کہ گھر کا کوئی شخص باہر نہ نکلنے پائے اور صدر دروازہ بند کر دیا جائے۔

باغ عام کو عبور کر کے دریا کی طرف والے دروازے سے گزرتا ہوا وہ شہر پناہ سے باہر آ گیا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ جب وہ سڑک پر چھائے ہوئے درختوں کے گھنے سائے سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے پہنچا تو اس نے اپنی نظریں تیزی سے مینار کی طرف دوڑائیں۔ ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کے پس نظر میں اس نے مینار سے آگ کی لپٹیں بلند ہوتی دیکھیں۔

جب ذرا اور قریب آیا تو پورا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ دھوئیں کے سیاہ بادلوں کے نیچے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے گھوڑے کو شدت سے مہمیز کیا۔ گھوڑا مجمع کر چیرتا ہوا قلانچیں بھرتا، چڑھائی پر تیزی سے دوڑنے لگا۔ پائیں باغ کے دروازے پر پہنچ کر وہ گھوڑے سے کود پڑا اور دوڑتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ اور جلتے ہوئے مینار کے مختلف پہلوؤں سے شعلوں کی سرخ زبانیں تیزی سے باہر نکلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ تیز گرم ہوا کے ایک جھونکے نے جیسے اس کا منہ جھلسا دیا۔ کچھ لوگوں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

''واللہ! اے شخص! کیا تجھے نظر نہیں آتا! کیسی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔''

''شاید ابھی لگی ہے!''

''اسے لگے ہوئے تو عرصہ ہو گیا۔ اب تو پورے شباب پر ہے۔ دیکھتا نہیں آگ مینار کو کس طرح کھا رہی ہے۔''

جن لوگوں نے عمر کو رصد گاہ کے دروازے سے باہر کھینچا تھا۔ بہت خوش ہو ہو کر اس آتشیں منظر پر رائے زنی کر رہے تھے۔ کچھ لوگ دروازوں کے پردے بغل میں دبائے کھڑے تھے۔ دو آدمی اس پردے کے لیے جھگڑ رہے تھے جس پر سنہرے سلمہ ستارے سے اژدہے کی شکل بنائی گئی تھی..... وہ یہ طے نہیں کر پائے تھے کہ اگر وہ لے جائیں تو بازار میں اس کے کچھ دام بھی اٹھ سکیں گے یا نہیں؟

عمر نیم بے ہوشی کے عالم میں لوگوں کو ادھر ادھر دوڑتے اور لوٹ مار کرتے دیکھ رہا تھا۔ رصد گاہ کی پہلی منزل چنگھاڑتے ہوئے شعلوں کی بھٹی بنی ہوئی تھی۔ آگ تیزی سے اوپر کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس کی تمام کتابیں اور کاغذات وہیں تھے۔ تیسری منزل پر..... سیاروں کی جدولیں۔ جو سالہا سال کے مشاہدہ محنت کے بعد ترتیب دی گئی تھیں۔ اور نامکمل شرح اقلیدس بھی.....!

اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخ کر دریافت کیا۔ ''کتابوں کا کیا حشر ہوا؟''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''کیا؟ کتابیں..... کتابیں تو آگ کے شعلوں کی مرغوب ترین غذا ہیں۔ ہم نے انہیں جمع کر کے پہلے ہی نیچے کی منزل میں ڈھیر لگا دیا تھا۔''

ایک لڑکا اپنی قمیض کے نیچے کوئی چیز چھپائے بھاگتا ہوا قریب سے گزر گیا۔ ایک طرف چند سپاہی سنہری اژدہے کو اپنے چاقوؤں سے کھرچ کھرچ کے کپڑے سے الگ کرنے میں مشغول تھے۔ لمبے چوڑے کپڑے سے الگ کر کے اس کا لے جانا آسان تھا۔ جب پہلی منزل کی چھت ایک دھماکے کے ساتھ نیچے گری تو انہوں نے نگاہیں اٹھا کر دلچسپی سے اس طرف دیکھا۔ دور، دور تک چنگاریاں اڑ کر آئیں اور آگ کی لپٹیں بل کھاتی ہوئی بلند ہو گئیں۔

بالآخر جب مینار کی بالائی چھت بھی جل کر زمین پر آ رہی تو مینار کی شکل بالکل ایک ایسی چمنی کی سی ہو گئی جسے دہکتے ہوئے انگاروں پر کھڑا کر دیا گیا ہو۔

آگ کی چمک اور تپش آہستہ آہستہ دھیمی پڑنے لگی اور ہوا بھی رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ آوازوں کا شور مدھم پڑنے لگا۔ لوگ شہر پناہ کے دروازے بند ہونے سے پہلے گھر پہنچنے کے لئے تیزی سے واپس ہو گئے۔

سواروں کا ایک دستہ باغ میں داخل ہوا اور آگ سے تباہی کا منظر دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ وہ لوگ ٹہلتے ہوئے ابن سینا کے مسی کرۂ ارض (تانبے کے بنے ہوئے گلوب) کے قریب پہنچ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔ اس گلوب کو کسی نے مینار سے باہر نکال کر حفاظت کے ساتھ ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس کا اسطرلاب بھی اس کے پاس ہی احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔

''عالی جاہ! آگ لگنے کے اس واقعہ کے متعلق ضرور ایک نظم تصنیف فرمائیے گا۔''

عمر نے نظریں اٹھا کر تعجب سے آواز کی طرف رخ کیا۔ بولنے والا کوئی نو وارد معلوم ہوتا تھا۔ اور جس شخص کو اس نے مخاطب کیا تھا وہ درباری لباس پہنے ایک عمدہ گھوڑے پر سوار تھا۔ عمر کو اس سوار کی صورت جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ ایک لمحہ توقف کے بعد اس نے پہچان لیا۔ وہ معزی تھا۔ درباری شاعر۔

معزی نے جان بوجھ کر عمر کو نظر انداز کر دیا۔ بلکہ آتشزدگی پہ مذاق کے طور پر چند جملے بھی کہے گھوڑا موڑتے ہوئے اس نے اپنے ہمراہیوں کو یاد دلایا کہ واپسی میں انہوں نے خاصی دیر لگا دی تھی۔ جب ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینی بند ہو گئیں تو عمر کو اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔

اس کا ذہن ہنوز ماؤف تھا۔ وہاں سے واپس جانے کا خیال بھی اسے نہ آیا۔ اس کا سب کچھ وہیں تھا۔ زندگی بھر کی دماغی کاوشوں کا نچوڑ۔ وہ سب کچھ جھلسے ہوئے

پتھروں کے نیچے اس کے سامنے راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یکا یک اسے اپنے ساتھیوں کا خیال آیا جو برسوں سے اس کے ساتھ یہاں مصروف تحقیق تھے۔ آخر ان سب کا کیا حشر ہوا۔ پھر اس نے خود ہی سوچا کہ یقیناً وہ مجمع کی زد سے بچ کر فرار ہو گئے ہوں گے۔

انگاروں کا ڈھیر اسے ایسا نظر آیا جیسے گلاب کے پھولوں کو انبار کر کے انہیں نیچے سے روشن کر دیا گیا ہو اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی ان کی سرخی گہری ہو جاتی ہو، کبھی مدھم۔ اس کے دماغ میں ابھی تک شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے اپنے تمام بدن میں آگ سی جلتی ہوئی محسوس کی بالکل ایسی ہی اندرونی تپش اس نے ایک مرتبہ پہلے بھی محسوس کی تھی جبکہ دریائے فرات کے کنارے خیموں کو آگ لگائی تھی۔ وہ آگ اس کے جسم میں آج تک ٹھنڈی نہ ہوئی تھی۔ اس نے اسی تپش کو ایک مرتبہ پھر شدت سے محسوس کیا اور سوختہ مینار سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو آسمان پر بادل کی شکل اختیار کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

یکا یک اس کی نظر چاند کے روشن چہرے پر پڑی جو صاف و شفاف آسمان کی بلندیوں سے ٹکٹکی باندھے سکون سے اسے دیکھ رہا تھا۔

عمر خالی الذہن ہو کر اجڑے ہوئے باغ کی روشوں پر ٹہلنے لگا۔ گلاب کی نازک نازک پتیاں جھاڑیوں سے ٹوٹ کر روشوں پر بکھری پڑی تھیں۔ ایک تاریک گوشے میں بنفشہ کا ایک خوبصورت پھول سر شاخ لہلہا رہا تھا۔ عمر احتیاط سے چلنے لگا تا کہ اس کا پیر اندھیرے میں کسی پھول پر نہ پڑ جائے۔

پھر اس نے سوچا کہ اس اجاڑ میں ٹھہرنے سے کیا حاصل اور گھوڑے پر سوار ہو کر واپسی کے ارادے سے باہر نکل آیا۔

اس کے گھوڑے کو یا تو کوئی چرا کر لے گیا تھا یا پھر وہ خود ہی بھٹک کر کہیں ادھر ادھر چلا گیا تھا..... وہ پیدل ہی چل پڑا۔ سر پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس کا اپنا سایہ اس کی تنہائی کا ساتھی۔ قدم بہ قدم اس کے ساتھ چلنے لگا۔ چلتا رہا.....

شہر کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ محافظوں نے اسے ترش روئی کے ساتھ وہاں سے

چلے جانے کو کہہ دیا۔ رات کے سناٹے میں کچھ دیر وہ ادھر ادھر گھومتا، آوارہ گردی کرتا مضافات شہر کے ایک گاؤں کی طرف نکل آیا۔ وہاں صرف ایک ہی دروازے سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر کان لگائے۔ اندر سے کسی کے ہنسنے اور ستار بجانے کی آواز آ رہی تھی۔

اس نے کھلے ہوئے دروازے میں جھانک کر دیکھا۔ اسے کمہار کا چاک نظر آیا جس پر سوکھی ہوئی مٹی کا ایک تودہ رکھا تھا۔ پاس ہی ایک کمبل اور کچھ صراحیاں پڑی تھی۔ لیکن فضا شراب کی بو سے معمور تھی۔ عمر ذرا اور آگے بڑھا سامنے ایک اور دروازہ دکھائی دیا جس پر پردہ پڑا تھا۔ اس نے پردہ سرکایا اور اندر داخل ہو گیا۔

دیوار کے ساتھ ان گنت صراحیاں ایک دوسرے پر چنی ہوئی تھیں۔ ایک شخص لرزتی ہوئی انگلیوں سے ستار بجا رہا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر ایک دیہاتی دوشیزہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایک بوڑھا آدمی شراب کی صراحی اپنے دونوں بازوؤں میں، ہم آغوشی کے انداز میں، لیے بیٹھا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس میں سے ایک پیالے میں شراب انڈیلتا جاتا تھا۔

''ذرا احتیاط سے'' عمر نے بآواز بلند کہا۔ ''شراب گرا کر ضائع نہ کرو۔''

جب عمر نے شراب سے بھرا ہوا پیالہ ہاتھ میں لیا تو ٹھنڈی سرخ شراب اس میں سے چھلک پڑی اور وہ آہستہ آہستہ پینے لگا۔ باقی تینوں اسے غور سے دیکھتے رہے۔

''ماشاء اللہ'' سفید ریش بوڑھے نے کہا ''غالباً عالیجاہ راستہ بھول کر ادھر نکل آئے؟''

عمر نے اپنے لباس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ پھر اس نے ایک آہ بھر کر پیالہ خالی کر دیا۔ شراب خانے کے اندر نسبتاً خنکی تھی۔ بوڑھا کوزہ گر جس کے ہاتھ کوزے بناتے بناتے ٹیڑھے ہو گئے تھے عمر کو اس وقت ایک فرشتہ نظر آ رہا تھا جو چاندنی رات میں آسمان سے اتر آیا ہو۔ عمر صراحی کے قریب آرام سے بیٹھ گیا اور نہ معلوم کس خیال میں محو ہو گیا۔

''آج'' اس نے محویت سے چونکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے عقل و دانش کی

دیویوں کی طلاق دے دی ہے اور دخت رز کو اپنا شریک حیات بنا لیا ہے۔"

"کیسے عجیب نام ہیں" دیہاتی دوشیزہ نے ہنس کر کہا۔

"گا! اے دوشیزہ شب" عمر نے فرمائش کی۔" اور اے کشادہ دہن شخص تو ستار بجا۔ ایسی طلاقیں اور نکاح روز روز واقع نہیں ہوتے۔

وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ شراب ایک نغمگی کے ساتھ قلقل کرتی ہوئی صراحی سے پیالوں میں انڈیلی جاتی رہی۔ عمر کا دل چاہا کہ اس کیفیت کا دوسروں کو بھی احساس دلائے۔ اس نے اپنا ہاتھ صراحی پر رکھا جو اسے ٹھنڈی محسوس ہوئی اور کوزہ گر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا" کیا عجب یہ مٹی ایک ایسے عاشق زار کی ہو جس کے ہونٹ اس کے محبوب کے ہونٹوں سے پیوست رہے ہوں اور بازو اس کی گردن میں حمائل؟"

حجرے کی ساری فضا تاریک پردے میں لپٹ گئی۔ اور وہ بھی بے خبر سو گیا ایک دفعہ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اُٹھ کر صراحی کو ہلایا لیکن وہ پہلے ہی خالی ہو چکی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور اندھیرے کی چادر اوڑھ کر پھر سو گیا۔

کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سارے حجرے میں صبح کاذب کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ بوڑھا آدمی پریشان اور خوف زدہ سا کھڑا اس سے کہہ رہا تھا۔" میرے آقا اُٹھیے۔ صبح کی اذان ہو رہی ہے بلند مینار پر کھڑا ہوا موذن پکار پکار کر نماز کے لیے بلا رہا ہے۔"

"اس کی آواز پر کان نہ دھرو۔" عمر نے جواب دیا۔" دراصل وہ اپنی کمین گاہ سے جو مینار میں واقع ہے تمہیں دھوکے سے بلا رہا ہے۔ اس سے خبردار رہو۔"

اور پھر وہ خالی صراحی کی طرف کروٹ لے کر یہ سوچتا ہوا سونے کی کوشش کرنے لگا کہ جب نیشاپور کے دروازے ہی اس پر بند ہو چکے ہیں۔ تو وہ اب اٹھ کر کرے گا بھی کیا۔

بوڑھے کوزہ گر نے ایک دفعہ پھر لجاجت سے کہا۔" سنو! آقا!"" ... حی علی الصلاۃ۔ حی علی الصلاۃ..... حی علی الفلاح....."

دور سے آتی ہوئی آواز کوزہ گر کے حجرے میں گونج رہی تھی۔ عمر ذرا لڑکھڑاتا

ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں رک کر اس نے کچھ سوچا..... صبح ہو رہی تھی۔ اور وہ شراب خانے کے دروازے میں کھڑا تھا.....

تمام دن کوزہ گر کا چاک گھومتا رہتا۔ پانی کے ٹھنڈے قطرے اس سے ٹپک ٹپک کر زمین پر گرتے رہتے۔ کوزہ گر کے مڑے ہوئے ہاتھ گیلی مٹی سے طرح طرح کی شکلیں تخلیق کرتے رہتے۔ ایک رات کے بعد دوسری رات آتی رہی۔ عمر اپنے سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو شراب کے چھینٹے دے دے کر ٹھنڈا کرتا رہا۔ حتیٰ کہ دیوار کے سہارے چنی ہوئی لاتعداد صراحیوں نے ایسی انسانی شکلیں اختیار کر لیں جو اس سے گفتگو کر سکتی تھیں۔ جب عمر نے ان سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تو نیند اس پر غالب آ گئی اور اس نے روز و شب کا شمار کرنے کی کوشش بھی ترک کر دی۔

"مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں" اس نے طنزیہ لہجے میں کوزہ گر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔" اس زمانے سے جو گزر گیا اور اس زمانے سے بھی جو آئے گا۔"

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ ایک روز اس کے سکون میں تھوڑا سا انتشار پیدا ہوا جب عائشہ اور اسحٰق یکا یک اس کے سر پر آ دھمکے۔ عائشہ کی آواز مارے غصے کے کپکپا رہی تھی۔

"یہ کیا نئی دیوانگی ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ ہم ہفتوں سے تمہاری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ واللہ!" عائشہ نے اپنے ہاتھ نچا کر کہا۔" یہ کچھ کم مصیبت ہے کہ انہوں نے بیت النجوم کو جلا کر خاک کر دیا اور قرض خواہوں نے تمہارے شہری مسکن پر اپنے قرضے کے بدلے قبضہ کر لیا۔

یہ سب تو گذرے کل کی بات ہے۔ اب تک تو بھڑکتے ہوئے شعلے ٹھنڈے ہو کر راکھ میں تبدیل ہو چکے ہوں گے۔

"ہاں انہوں نے قصر کو چک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اب نئے سلطان کے دربار میں تمہارے نام کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس نے تمہاری ترتیب دی ہوئی تقویم کو ناکارہ قرار دے کر پرانے طریقے پر چاند کے حساب سے ماہ و سال کا شمار پھر رائج کر دیا ہے....."

"میری تقویم؟"

"ہاں! ہاں! تمہاری مرتب کی ہوئی تقویم!! بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ ہے ہے !! کیا غضب ہے جب میں حمام جاتی ہوں تو عورتیں میری طرف انگلیاں اٹھاتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ وہ دیکھو وہ عمر خیام کی لونڈی ہے؟ کیا یہ ستم نہیں ہے کہ معزی کی داشتائیں۔ اور طوائفیں تو پالکیوں میں سوار ہو کر نکلیں جن کے آگے حبشی غلام ہٹو بچو کرتے ہوئے چلیں اور میں خود گھوڑے پر چڑھی اسحٰق کو ساتھ لیے اس طرح سڑکوں پر ماری ماری پھروں..... اور تم یہاں بیٹھے ایک کوزہ گر کی لونڈیا کو بغل میں دبائے شراب پی رہے ہو، رنگ رلیاں منا رہے ہو....."

"اچھا اب بہت ہو چکی" عمر نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "عائشہ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے عورتیں عمر خیام کا نام لے کر مذاق نہ اڑا سکیں گی۔ اور تیرے مقابلے میں معزی کے مور اپنی چمکیلی دمیں پھیلا کر نہ ناچ سکیں گے۔ اسحاق تیرے پاس جس قدر زر و نقد ہے وہ سب ادھر لے کر آ!"

"اللہ ہی جانتا ہے اس کے پاس کس قدر رقم ہے" عائشہ نے چپکے سے کہا۔

"اور عائشہ، تیرے پاس بھی تو سنہرے سکوں کے توڑے موجود ہیں۔ علاوہ دوسرے قیمتی سامان کے؟"

جوان کنیز اور اسحٰق نے ایک دوسرے کو حیرت آمیز نظروں سے دیکھا انہیں بہت پہلے سے اس امر کا یقین تھا کہ عمر سے ان کے خیالات پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن پھر بھی عمر کی باتیں سن کر تعجب ہو رہا تھا۔

"عائشہ کے پاس جواہرات ہیں" اسحٰق نے گھبرا کر جواب دیا۔ "اور آپ کا نقدی کا صندوقچہ بھی۔"

"تو پھر اے کوزہ گر! میں تجھے گواہ کر کے اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنا سارا مال و زر اپنی اس کنیز اور اس ملازم کو جو اس وقت یہاں موجود ہیں بخشتا ہوں جاؤ اور نیشاپور کے مفتی کے روبرو جا کر اس کی تصدیق کرا لو کہ میں نے ایسا کیا ہے۔"

چند لمحے کے لیے تلخ سناٹا چھایا رہا..... اسحٰق نے جستجو آمیز لہجے میں عمر سے

پوچھا "لیکن آقا! آپ کے پاس کیا باقی رہے گا؟"

اب باقی ہی کیا رہا۔ عمر حیرت سے سوچنے لگا۔ جو کچھ اس کا تھا وہ سب ختم ہو چکا۔ اس کی تصانیف مدرسوں میں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ اس کے مسودے جلا دیئے گئے۔ اس کی تقویم طاق نسیاں کی زینت ہو گئی۔ اسے شہر بدر کر دیا گیا؟

"افق کے اس پار" اس نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "ایک جام پوشیدہ ہے جسے ہر شخص کو پینا ہی پڑے گا۔ جب تیری باری آئے تو بلا تکلف اسے ہاتھ میں لے کر غٹ غٹ چڑھا جانا۔ ایک قطرہ بھی اس میں نہ رہنے پائے..... میں صرف اس قدر جانتا ہوں۔"

اسحٰق نے اپنی کہنی سے کوزہ گر کو ٹھوکا دیا اور اپنا سر کھجانے لگا۔ "اور اس مفتی سے یہ بھی کہہ دینا" عمر نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کہ میں حلب جانے والے کارواں کے ہمراہ جلد ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا..... اچھا اب نیشاپور چلے جاؤ..... تم دونوں۔"

جب وہ دونوں کانا پھوسی کرتے ہوئے گھوڑوں کے قریب پہنچے تو عائشہ نقاب ڈالے رو رہی تھی۔ اسحٰق نے سہارا دے کر اسے گھوڑے پر سوار کر دیا۔ "اے عورت! اب تجھ پر کون سی مصیبت نازل ہو گئی؟" اسحٰق نے عائشہ نے طنز کیا۔

"نہ جانے کیوں میرے دل میں اک ہوک سی اٹھ رہی ہے۔ لیکن کیا..... کیا یہ سارا زر و مال اب میرا ہے۔"

"بے شک! آقا نے یہی ارشاد فرمایا ہے۔"

عائشہ نے آہستہ سے اپنے آنسو پونچھے۔ مفتی کی عدالت کو جاتے ہوئے عائشہ ان دکانوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنے سے باز نہ رہ سکی جن پر عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ریشمی پارچے خریدنے میں مصروف تھے۔

ایک کارواں سرائے کے دروازے میں جو خراساں سے دو روز کی مسافت پر سڑک کے کنارے واقع تھی عمر آلتی پالتی مارے بیٹھا اس الاؤ کو کرید رہا تھا جس نے رات بھر اس کے جسم کو حرارت پہنچائی تھی۔ اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی ایک بوسیدہ عبا اس کے شانوں پر پڑی تھی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنے پیر انگاروں کی طرف پھیلا دیئے۔

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ آسمان پر عقرب مغربی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ صرف دو گھنٹے اور..... وہ نگہبانی کے فریضے سے سبکدوش ہو جائے گا۔ اس لیے کہ صبح ہو جائے گی۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے پتے..... خشک، بے جان پتے کھڑ کھڑا کر اوپر کی طرف اڑے۔ بگولے کی شکل میں..... جیسے روئیں کرب کی شدت سے پھڑ پھڑا رہی ہوں۔ عمر نے دونوں ہاتھوں میں کچھ پتیاں لے کر آگ میں جھونک دیں ایک لمحے کے لیے شعلے بھڑکے اور تحلیل ہو گئے۔ اس کو سینے میں کھجلی محسوس ہوئی وہ آرام سے بیٹھا کھجاتا رہا..... بس صبح ہونے والی تھی۔

اس کے سکون میں کوئی چیز خلل انداز ہو رہی تھی۔ سڑک کی سخت زمین پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بند ہو گئی۔ ایک تنہا سوار الاؤ کے قریب آ کر رکا..... ''اے نگہبان شب!'' اجنبی نے عمر سے سوال کیا۔ ''کیا یہ کارواں حلب کی طرف جا رہا ہے؟''

''ہاں'' عمر نے کہا۔

سوار گھوڑے سے اتر پڑا۔ کھڑے ہو کر اپنی ٹانگیں سیدھی کیں جو دیر تک زین پر بیٹھے رہنے کی وجہ سے اکڑ گئی تھیں۔ اور پھر اس نے جماہی لی۔ ''یا اللہ نیشاپور سے یہاں تک کا سفر خاصا طویل ہے۔ کیا کوئی شخص خواجہ عمر خیام اس کارواں کے ہمراہ سفر کر رہا ہے؟''

چند خاردار شاخیں آگ پر ڈال کر عمر سوچنے لگا کہ سوار کو بتا دوں کہ میں ہی عمر

خیام ہوں۔ باتوں کی آواز سن کر سرائے کا مالک بھی اپنے حجرے سے باہر نکل آیا جو دروازے کے پہلو میں واقع تھا۔ اور سوار کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ''نہیں!'' سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ یہاں صرف ایک ہی تاجر ہے جو نہ خواجہ ہے اور نہ خیام ہے۔''

''یا خدا!'' سوار نے کہا۔ ''کیا میں خلیفہ کا خط ایک دربان کو دیدوں جس کی ڈاڑھی بھی ترشی ہوئی نہیں ہے؟ خلیفہ مصر نے قاہرہ سے عمر خیام کے نام خط بھیجا ہے اور درخواست کی ہے کہ وہ قاہرہ آ کر اس کا زائچہ بنائے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اسے عزت و احترام کے ساتھ قاہرہ لے جا کر دربار میں حاضر کروں۔

سرائے کے مالک نے کہا ''کیا یہ حقیقت ہے؟''

قاصد نے اپنی پیٹی سے ایک لپٹا ہوا خط نکالا۔ جو سر بند تھا اور اس پر دھاگا لپیٹ کر اوپر سے ایک بڑی مہر لگا دی گئی تھی۔ ''دیکھو! یہ ہے۔'' سوار نے خط دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے۔'' عمر نے پوچھا ''کہ الموت کا حکمراں حسن اس وقت دربار قاہرہ میں موجود ہے۔ جسے تمہارے ولیٔ نعمت خلیفہ کا پورا اعتماد حاصل ہے۔''

''تو کون ہوتا ہے جاننے والا؟ ہاں وہ بھی وہاں موجود ہے۔ جیسا کہ تو بیان کر رہا ہے۔ لیکن تجھے کیا.....؟''

''قلم دوات لاؤ'' عمر نے سرائے کے مالک کو حکم دیا۔

عمر نے خط لے لیا اور اسے اپنی انگلیوں میں پکڑ کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصا وزنی ہے اور یقیناً طویل بھی ہو گا۔ یہ بہت آسان بات تھی کہ دھاگا کاٹ کر اسے کھول لیا جائے تا کہ اس کے مضمون سے آگاہی ہو جائے۔ عمر آنکھیں بند کر کے اسے پھر اپنی انگلیوں پر تولنے لگا۔

یہ دونوں شخص آخر اسے پریشان کرنے کے لیے اس وقت کہاں سے آن مرے۔ وہ آرام سے بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ اس کی تصور کی آنکھوں نے نظام الملک کو ایک بار پھر اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جو اس سے از سر نو وقت کی پیمائش کی فرمائش کر رہا تھا۔ اس نے ملک شاہ کو پیشین گوئیاں طلب کرتے ہوئے دیکھا۔ اقرونوس اس کی آڑ لے کر دولت جمع کرتا نظر آیا۔ اب اس کے سامنے ہر چیز آئینے کی طرح روشن تھی۔

حسن اس کی دماغی صلاحیتوں سے کام لینا چاہتا تھا۔ دارالعلوم کے قاضیوں نے اسے شہر بدر کر دیا تھا۔ سلطان کے درباری اس کا مذاق اڑاتے تھے..... اس وقت سے وہ مسلسل ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ بے مقصد۔ ایک پتے کی طرح جو ہواؤں کے رحم و کرم پر ہو۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ اسے اپنی ذات پر کامل اعتماد تھا۔ کتنا اعلیٰ اقتدار اسے حاصل تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کہ غیر مرئی شے کے چہرے سے پردہ ہٹانا چاہا۔ لیکن وہ غیر مرئی شے آج بھی اتنی ہی غیر مرئی ہے جتنی پہلے تھی۔

"قلم حاضر ہے" سرائے کے مالک کی آواز آئی۔ عمر نے قلم ہاتھ میں لے لیا۔ "اگر یہ شخص لکھ سکتا ہے" سرائے کے مالک نے کہا تو پھر یہ دربان نہیں ہو سکتا۔"

اسے ان دونوں سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ کوچ کا نقارہ بجنے سے پہلے۔ بیشک اسے اس خط کا جواب لکھنا چاہیے۔ بنام خلیفہ مصر منجانب عمر الخیام جو علم و حکمت کے بے شمار خیمے سی چکا تھا۔ آگ کے قریب جھک کر عمر نے بند خط کی پشت پر حسب ذیل چار مصرعے تحریر کر دیئے۔

خیام کہ خیمہائے حکمت می دوخت
در کوزۂ غم فتاد وناگاہ بسوخت
مقراض اجل طناب عمرش ببرید
دلال امل برایگانش بفروخت

جب عمر نے قاصد کو خط واپس دیا تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا "لیکن تو نے خط کھول کر تو پڑھا ہی نہیں!"

"مجھے معلوم ہے اس میں کیا لکھا ہے۔"

حیرت سے عمر کو دیکھتا ہوا وہ شخص آگ کے پاس سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ عمر ایک بڑا ساحر ہے۔ انسانی تقدیروں کو پڑھنے والا۔ اپنے گھوڑے کی لگام گھسیٹتا وہ سرائے کے مالک کے ہمراہ دروازے میں داخل ہو گیا۔

عمر نے تجسس آمیز نظروں سے اپنے شانے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ عقرب پہاڑی کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ صبح کے جسم میں تیر جانے والی خنکی ہوا میں پیدا ہو چلی

تھی۔ بالآخر اس وقت وہ وہاں تنہا تھا۔ بغیر کسی دوست، ساتھی یا رفیق کے۔

اسے یاد آیا کہ یاسمین نے ایک دفعہ کہا تھا کہ محبت میں وہ وقت بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے جب ستارے ڈوب رہے ہوں اور انسان اکیلا ہو۔ کیا یاسمین اس نقاب کا سایہ تھی جو غیر مرئی شے کے چہرے پر پڑا ہوا ہے؟ اور رحیم ..... رحیم کا وہ جوان خون جو ایک مرتبہ زمین میں جذب ہو گیا پھر کبھی گردش میں نہ آئے گا۔ اسے اب یہ سب باتیں یاد نہیں کرنی چاہئیں۔ اب وہ کبھی واپس نہ آئیں گے۔ وہ اس قاصد کی طرح گھوڑوں پر سوار خراسان کی عظیم شاہراہ کو عبور کر کے اب کبھی نہ آسکیں گے۔

اس نے اپنا سر ہاتھوں میں دبا لیا۔ اور گھٹنوں کے بل سڑک کی طرف چلنے لگا۔ "اے ارحم الراحمین بس" اس نے چلا کر کہا۔

ان کی آمد کا وقت قریب آ گیا تھا۔ اندھیرے میں سائے جمع ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کے کنارے کنارے ناچتے ہوئے..... لو! اب وہ اس کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ ان کے رونے کی خفیف آوازیں اس طرح آ رہی تھیں جیسے برفانی ہواؤں کی سائیں سائیں۔

اس نے اپنے ہاتھ پھیلا کر انہیں چھونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ نہ انہیں سرعت کے ساتھ آگے بڑھنے ہی سے روک سکا۔ وہ انہیں صاف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ اندھیرے کے پیچھے پیچھے تیزی سے دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ مڑ مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے۔ ان کی نحیف آوازیں عمر کو ان کا پیچھا کرنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ ایک ایسے خلا کی سمت جو نا پیدا کنار ہے.....

اسے بھی جلدی کرنی چاہیئے۔ اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ستارے ماند پڑ چکے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ دوڑتا ہوا نقارے کے پاس پہنچا جو سونے والوں کے قریب رکھا تھا۔ جب اس نے اس نقارے پر اپنی مٹھی سے بھرپور ضرب لگائی تو نقارے کی آواز سرائے کی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹی اور ساری فضا گونج اٹھی۔

فرداً فرداً ہر شخص کے پاس پہنچ کر اس نے انہیں بیدار کیا سب اپنا اپنا بستر چھوڑ

کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب بیٹھے ہوئے اونٹ کھڑے ہونے لگے تو چاروں طرف گھنٹیاں بجنے لگیں۔ایک آدمی نے کھانس کر تھوکا۔ایک ڈول کے دیوار سے ٹکرانے کی آواز آئی.....

''لیکن'' سرائے کے مالک نے سکے شمار کرتے ہوئے کہا۔'' میں نے اپنی آنکھوں سے اسے خلیفہ کے خط پر اشعار لکھتے دیکھا تھا۔''

امیر کارواں نے اپنا نقدی کا بٹوا بند کر کے پیٹی میں اڑس لیا۔

''ارے وہ تو ایک مجذوب ہے۔لیکن ایک بات ہے کہ وہ کبھی طلوع آفتاب تک نہیں سوتا۔لو اب سنو۔'' اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے اس نے باآواز بلند کہا'' اے نگہبان شب، یہ کارواں کدھر جاتا ہے؟''

عمر نے کارواں کے سب سے آگے والے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔دن اچھی طرح نکل آیا تھا۔سرائے سے اٹھتی ہوئی گرد کے دھند میں سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔

''جدھر رات چلی گئی'' اس نے پرجوش آواز سے جواب دیا۔''

''اور وہ کہاں ہے؟'' امیر کارواں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔تھکے ہوئے انداز میں عمر نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔''کسی جگہ نہیں'' اور پھر.....اپنی بوسیدہ عبا سر پر کھینچ کر جریب ہاتھ میں لیئے سب سے آگے والے اونٹ کی نکیل پکڑے وہ سرائے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔